نواز شریف

ٹیڑھی راہوں کا سیدھا مسافر

سردار محمد چودھری

سابق انسپکٹر جنرل پولیس

visit http://urdulibrary.paigham.net/

for all type of books

and visit http://quraniscience.com/

to read scientific Facts in Quran

پیش لفظ

حامی ہوں یا مخالف، دونوں کے لئے

نواز شریف اس وقت جیل میں ہیں۔ اب ان کا نام لینا، ان سے اپنا تعلق جوڑنا یا ان کی تعریف میں زبان کھولنا بجائے خود ایک آزمائش اور ایک امتحان ہے۔ کئی ایسے لوگ جو نواز شریف کے حضور کورنش بجالاتے تھے، ان کو "ظل سبحانی" بتاتے تھے، ان کو اپنی وفاؤں کا یقین دلاتے تھے، اور اپنی زندگی ان کی ایک نگاہ کرم سے عبارت بتاتے تھے، اب ان سے دور ہیں۔ ان سے اپنے تعلق کو چھپانے میں لگے ہیں۔ ان میں قلم کار بھی ہیں اور سفارتکار بھی، افسران کرام بھی ہیں اور علمائے عظام بھی۔ سیاسی کارکن البتہ کم کم ہیں کہ اس مخلوق میں سود و زیاں کا حساب کرنے کی صلاحیت "بدرجہ اتم" موجود ہوتی تو پاکستان میں جمہوریت نام کی شے کبھی بحال ہی نہ ہوتی۔

چودھری سردار محمد پنجاب پولیس کے ایک منفرد اور ممتاز افسر رہے، اس کی سربراہی بھی ان کے حصے میں آئی، اور انہوں نے بڑی شان سے نبھائی۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ نواز شریف کو وزیر اعظم بنتے دیکھا، اور ان کی قربتوں بلکہ "خلوتوں" میں رہے۔ ان کی وجہ سے محترمہ بے نظیر کے عتاب کا نشانہ بنے، لیکن پھر یہ بھی ہوا کہ نواز شریف اور ان کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا۔ اعتماد کو بدگمانیوں نے ڈس لیا۔ نواز شریف دوسری بار وزیر اعظم بنے تو چودھری سردار محمد سے ان کا فاصلہ برقرار رہا۔ چودھری صاحب ریٹائرمنٹ سے دل بہلاتے رہے اور ظلم سے رشتہ

جوڑ لیا، کئی معرکے کی کتابیں لکھ ڈالیں۔

نواز شریف کا اقتدار ختم ہوا، وہ عتاب کا نشانہ بنے تو چودھری سردار محمد سے رہا نہ گیا۔ ان کی شخصیت پر کئی سو صفحے لکھ ڈالے۔ نواز شریف کیا ہیں، کیا چاہتے تھے، کیا کر سکے، اور کیا نہ کر سکے؟..... ان سوالوں کے جواب انہوں نے اس خوبصورتی اور چابکدستی سے دیئے ہیں کہ ان سے اختلاف کرنے والے بھی ان کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

نواز شریف کے بارے میں اور جو بھی کہا جائے اور جو بھی لکھا جائے، یہ ہر شخص مانتا ہے کہ وہ بہادر آدمی ہیں۔ ان میں اپنی بات کہنے اور اس پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ہے۔ وہ سر جھکانے کے فوائد سے آگاہ ہونے کے باوجود سر اٹھا کر چلتے اور سر اٹھا کر رہتے ہیں..... ان کے کئی حریف ایک زمانے میں انہیں روئی کا گالا اور برف کا گولہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک پھونک سے اڑایا اور ایک آنچ سے پانی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ وہ لوہے کا ایک ایسا چنا ہیں، جسے نہ نگلا جا سکتا ہے، نہ چبایا جا سکتا ہے۔

12 اکتوبر کے بعد جو کچھ نواز شریف کے ساتھ ہوا، وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے کسی فوجی یا غیر فوجی حکومت کے دوران کسی (سابق) حکمران یا سیاستدان کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں ہوا..... نواز شریف جس طرح اپنے نقطہ نظر پر قائم رہے، یہ بھی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔

چودھری سردار محمد نے ایک بہادر آدمی کی طرح ایک بہادر آدمی پر قلم اٹھایا ہے..... مردانہ وار اٹھایا ہے اور دیوانہ وار اٹھایا ہے۔ ان کا مشاہدہ بھی اپنا ہے، اور تجزیہ بھی اپنا۔ ان سے اتفاق کرنے والے بھی بہت ہیں اور اختلاف، بلکہ شدید اختلاف کرنے والے بھی کم نہیں ہوں گے۔

نواز شریف کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے پاکستانی سیاست میں کئی سال تک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اس پر اثرات مرتب کئے ہیں، اور اس کا رخ بدلا ہے۔ ان کے اسلوب اور ان کے مزاج پر بحث جاری ہے اور جاری رہے گی۔ چودھری سردار محمد نے اپنے دل کو زبان

دیکر اس بحث کو آگے بڑھایا ہے۔ نواز شریف کے عہد اور ان کی شخصیت پر یہ آخری کتاب نہیں ہے، لیکن اس کی اہمیت برقرار رہے گی۔ سیاسی رہنما محبتوں اور نفرتوں کے درمیان زندہ رہتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ ایوان اقتدار سے رخصت ہونے کے بعد نواز شریف کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس طرح کی محبت آمیز تحریر چودھری سردار محمد ہی کا حصہ ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔ اگر آپ نواز شریف کے مخالف ہیں تو پھر کڑھیے اور ابلئے..... مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ نواز شریف کے حامی ہوں یا مخالف، دونوں کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی

دیباچہ

میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم پاکستان (اب معزول) کو میں گزشتہ پندرہ سالوں سے جانتا ہوں، 1986ء تا 1993ء پورے سات سال میں نے مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے میاں صاحب کو نہ صرف بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے بلکہ انہیں بہت سے نازک اور مشکل ملکی فیصلے کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور بہت سے اہم معاملات میں خود بھی حصہ لیا ہے..... میاں محمد نواز شریف دو مرتبہ وزیر اعظم پاکستان رہے ہیں اور اب جیل میں ہیں۔

آج صبح اخباری مطالعہ کے بعد میں حالیہ سیاسی موسم کے تغیر و تبدل کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے میاں نواز شریف یاد آئے۔ میں نے ان کے ساتھ بیتے دنوں پر نظر دوڑائی اور ذرا سا حافظہ پر زور دیا تو پھر کیا تھا، یادوں کی ایک جھڑی سی لگ گئی اور ماضی کے نگار خانہ میں گویا ایک رتجگے کا سماں ہو گیا۔ میاں صاحب کے ساتھ گزارے لمحات پوری صداقت کے ساتھ میرے حافظے کی لوح پر ابھر آئے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ یادیں اور باتیں آپ کے سامنے لے آؤں، لہٰذا میں نے 16 نومبر 1999ء کو قلم اٹھایا اور 9 دسمبر 1999ء کی صبح تک ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہا۔ اس طرح میاں نواز شریف کے بارے میں یہ یادیں اور باتیں اس کتاب کی صورت میں ڈھل گئیں، جو اب آپ کے سامنے ہے۔

میاں محمد نواز شریف کو جیسا میں نے دیکھا ویسا میں نے لکھ دیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے وہ

مصدقہ ہے۔ کیونکہ میاں صاحب کے بہت سے قریبی ساتھی میرے بھی رفقائے کار یا دوست تھے۔ میاں نواز شریف ایک دلکش شخصیت کے مالک لیکن مجموعہ اضداد ہیں۔ بہت زیادہ مخلص، محب وطن اور محنتی ہیں۔ ان کی سنجیدگی میں بھی ایک وضع داری اور متانت جھلکتی ہے، ایک دلربا مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر سجی رہتی ہے۔ وہ دشمنی میں بھی حد کراس نہیں کرتے اور سیاست کو بھی شائستگی کا لبادہ پہناتے رہے ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح خوش ہوتے ہیں تو بچوں کی طرح ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ میاں محمد نواز شریف کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے، البتہ کچھ چھپانا مقصود ہو تو چپ سادھ لیتے ہیں۔ بقول شاعر

اس دور نا سزا کے تقاضوں کے برخلاف
دانش یہ جرم کم ہے کہ سچ بولتے ہیں ہم

نتیجتاً وہ بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے لیتے ہیں۔ سیاست ہو یا سفارت سچ کا دامن نہیں چھوڑتے۔ بلاوجہ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بہت ذہین ہیں مگر ذہانت کا اظہار کرنا تکبر سمجھتے ہیں۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے اور قرآن مجید کے بہترین قاری ہیں مگر مجال ہے کسی پر اپنی زبان دانی کا رعب جھاڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ گونگے بھی کہلوائے اور انگریزی سے نابلد بھی مگر پرواہ نہ کی۔ اصل میں وہ الفاظ سے زیادہ عمل کے انسان ہیں اور اپنے عمل سے انہوں نے پاکستان کو نہایت قلیل عرصہ میں جدیدیت کی راہ پر ڈال کر اس کا نقشہ بدل دیا مگر اس کا شور نہیں مچایا۔ فیکس، کمپیوٹر، موبائل فون، موٹر ویز، ای میل اور پتہ نہیں کیا کیا نئی چیزیں انہوں نے پاکستان میں متعارف کروائیں جواب ہمیں یاد تک نہیں۔ اس طرح نواز شریف کے نیو آرڈر اور ہمارے اولڈ گارڈ میں بہت سی چپقلش بھی ہوئیں کیونکہ تبدیلی بعض لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے اس کے نتیجے میں بہت زیادہ ہنگامے اور جھگڑے بھی ہوئے۔ ہم آگے بھی گئے اور پیچھے بھی ہٹے، میں نے ان واقعات کا بھی اجمالاً ذکر کیا ہے کہ شاید اس سے ہمیں اپنے اس دور کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

بہر صورت مجموعی طور پر میں نے نواز شریف کو ایک اچھا انسان پایا۔ ہر بشر کی طرح ان میں خامیاں بھی ضرور تھیں

اور ہیں۔ انہوں نے بہت سے اچھے فیصلے کئے اور کچھ خراب بھی، مگر ان کی نیت ہمیشہ نیک رہی۔ وہ سیاست کی ٹیڑھی دنیا میں ذرا سیدھا چلنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی لئے بار بار ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ان کا المیہ ان ٹیڑھی سیاسی پگڈنڈیوں پر سیدھا چلنے کی کوشش ہی تھی۔ وہ ان راہوں کو سیدھا کر پائے یا ان راہوں نے انہیں ٹیڑھا کر کے رکھ دیا، اس کا فیصلہ آپ کریں یا پھر تاریخ کرے گی مگر میں نے اپنی حد تک جو سچ تھا لکھ دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس موجودہ صورتحال کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔

اس تحریر سے اگر بعض دوستوں کی دل شکنی ہوئی ہو تو میں پیشگی معذرت خواہ ہوں کیونکہ لکھتے وقت تاریخ کا ایک بوجھ میرے کاندھوں پر تھا۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو میں اسے درست کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں مگر ثبوت کے ساتھ..... تلخ گوئی میری عادت نہیں لیکن سچائی میں کچھ نہ کچھ تلخی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

میں اپنے پیارے ننھے پوتے اسفندیار اور پوتی علیزہ کا بہت ممنون ہوں جو ہر روز مجھ سے آ کر حساب لیتے کہ دادا آپ نے کتنا لکھ لیا ہے اور پھر چند کورے کاغذ بھی کھسکا لیتے مگر لکھا ہوا کاغذ کبھی نہ چھیڑتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دادا کی کتاب بن رہی ہے۔ وہ جنہیں ہزاروں سال کہ ان کی معصومیت اور سوال و جواب مجھے لکھنے کا حوصلہ دیتے رہے۔

میں جناب افضال ریحان اور جناب انوار قمر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری تحریر پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس کی نوک پلک درست کی۔ مجھے جناب زاہد لطیف کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے نہایت محنت سے کمپوز کر کے اشاعت کے قابل بنایا۔ جناب امجد مختار کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کا سرورق تخلیق کیا اور سب سے بڑھ کر قومی پبلشرز کا شکریہ واجب ہے کہ اس نے اسے بہترین انداز سے چھاپ کر خوبصورت کتاب بنا دیا۔ میں سب سے زیادہ ممنون ہوں قاری کا، جو اسے پڑھنے کی زحمت اٹھا رہا ہے۔

9۔ دسمبر 1999ء لاہور

سردار محمد چودھری

سابق انسپکٹر جنرل پولیس

عجیب وغریب دن

12 اکتوبر 1999ء میرے لئے اسی طرح کا ایک دن تھا جس طرح کے دوسرے ایام زندگی گزر رہے تھے۔ ایسے ہی جیسے ایک مصروف ہنگامہ حیات کے بعد ایک ریٹائرڈ آدمی کے شب وروز گزرتے ہیں۔ مزید یہ کہ بلقیس (میری اہلیہ) کی موت کے بعد کی خوفناک تنہائی، عارضہ دل، اس کے علاوہ تساہل جسم وجاں، جواب عادت سی بن گئی ہے کیونکہ بیٹے بیٹیوں کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں ویسے بھی جواں لوگوں کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ زندگی میں بس ایک ہی راحت باقی تھی کہ اپنے پوتے اسفند یار اور پوتی علیزہ سے دل بہلاتا رہتا تھا اور ان کی پیاری پیاری باتیں سن کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ مگر اب تو وہ دونوں بھی سکول جانے لگے ہیں۔ کبھی کبھار لکھ لیتا تھا مگر بازو کے درد نے اس سے بھی روک رکھا تھا۔ یوں سمجھئے کہ 12 اکتوبر میرے لئے ویسا ہی بور دن تھا جیسے کہ گزشتہ کئی سالوں کے گزرے ہوئے دن جو میری زندگی میں آئے اور گزر گئے، اخبار بینی، ناشتہ، ٹیلی ویژن، جمائیاں، دوپہر کا کھانا اور قیلولہ۔

آج بعد دوپہر سو کر اٹھا اور اپنے ٹیلی ویژن کمرہ میں بیٹھا ہی تھا کہ جناب اشفاق احمد خان کا فون آیا

یہ کیا ہو گیا؟ کیا ہو رہا ہے؟ چودھری صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟

جناب خان صاحب مجھے تو کچھ معلوم نہیں، آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں، میں تو ابھی ابھی سو کر اٹھا ہوں۔

بھئی سنا ہے چیف آف آرمی سٹاف کو ریٹائر کر دیا گیا ہے۔

شاید کر دیا گیا ہو، مجھے تو معلوم نہیں لیکن ایسا ہوتا رہتا ہے۔ آپ کیوں پریشان ہیں۔

نہیں! نہیں! یہ معمول کی بات نہیں ہے۔ سنا ہے ٹیلی ویژن پر خاص بلیٹن آیا ہے۔ ذرا معلوم تو کریں۔

میں نے ٹیلی ویژن آن کیا تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ خاص بلیٹن کی سختی سکرین پر نمودار ہوئی اور جنرل پرویز مشرف کی ریٹائرمنٹ کا اعلان ہوا۔ ذرا حیرانی سی ہوئی کہ ابھی چند روز پہلے ہی تو ان کی چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کی پکی تعیناتی کی تصدیق ہوئی تھی اور آج یکا یک دونوں عہدوں سے رخصتی کا حکم بھی صادر ہو گیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی بات ہوئی ہے وگرنہ یکدم ایسے احکام کی کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ مزید تصدیق کے لئے میں نے جناب مجیب الرحمٰن شامی کو فون کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے۔ لو چھنے لگے ''جنرل پرویز مشرف کہاں ہیں''؟ ''وہ تو سری لنکا گئے ہوئے تھے''

''آ گئے ہوں گے'' میں نے کہا

''ہاں! ضرور آ گئے ہوں گے'' شامی صاحب نے کہا ''وگرنہ یہ احکامات جاری نہ ہوتے''

میں نے کہا، کیوں؟

''ذرا اچھا نہیں لگتا کہ ہمارا فوجی سربراہ ملک سے باہر ہو تو اسے ریٹائر کر دیا جائے''

ہاں! یہ بات تو درست ہے مگر ضروری نہیں۔ جنرل میکارتھر کو بھی امریکہ کے صدر نے جاپان اور کوریا کے محاذ پر ہی سے فارغ کر دیا تھا اور حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ کی عین میدان جنگ میں برخواستگی کر دی تھی۔

''مگر یہاں کچھ اور بات ہے ہم نہ تو امریکہ میں ہیں اور حضرت عمرؓ کے دور میں پاکستان کے معاملات مختلف ہیں'' شامی صاحب نے کہا۔

''ہاں! یہ بھی درست ہے، چلئے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے''

اس وقت تک میرا تسلسل ختم ہو چکا تھا اور میں نہایت چوکس ہو کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگا تھا۔ شام چھ بجے کی انگریزی خبریں آئیں تو ان میں اس اہم خبر کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی اور پھر تھوڑے

ہی وقفہ کے بعد نیوز ریڈر شائستہ زید سکرین پر آئیں اور فوجی سربراہ کی ریٹائرمنٹ کا اعلان سنایا۔

میں نے سمجھا کہ نیوز بلیٹن شاید پہلے سے ریکارڈ (RECORDED) تھا لہٰذا اس خبر کو بعد میں پڑھا گیا ہے۔ اتنی دیر میں جناب الطاف حسین قریشی کا ٹیلی فون آیا، اسی موضوع پر بات ہوئی اور انہوں نے بھی اس بے ترتیبی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی نیوز ریڈر کو یہ خبر پڑھنے سے روک رہا ہو۔

میں نے کہا نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن قریشی صاحب نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا چونکہ میڈیا سے تعلق ہے اس لئے وہ ان باریک بینیوں کو مجھ سے بہتر سمجھ رہے تھے لہٰذا ان کی بات سے میرے تجسس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور غیب سے کیا خبر آنے والی ہے کہ ٹیلی ویژن کی نشریات (ترسیل) یکدم بند ہو گئیں۔ اس سال سال کے بعد میں نے بی بی سی ورلڈ کا چینل لگا لیا۔ وہاں بھی پاکستان کے چیف آف آرمی سٹاف کی برخواستگی کی خبر کے ساتھ ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات کے غائب ہو جانے کا ذکر تھا اور طرح طرح کے شکوک کا اظہار بھی۔

اب مجھے گمان گزرا کہ معاملہ کچھ گھمبیر ہی نہیں، خطرناک بھی ہے سو دل میں طرح طرح کے وسوسے ابھرنے لگے۔

''کیا فوج وزیر اعظم کے ایک دستوری اور قانونی حکم کو ماننے سے انکار کر دی گی؟'' ''اگر انکار کر دے گی تو پھر دستور پاکستان کا کیا بنے گا؟'' دستوری راہ عمل اور جمہوریت پر کیا گزرے گی؟'' ''اگر ایسا ہوا تو بین الاقوامی ردعمل کیا ہو گا؟'' ''اندرون ملک کیسا ری ایکشن ہو گا؟''

''اگر وزیر اعظم کا حکم مان لیا گیا تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟'' افواج کے مورال پر کیا گزرے گی؟''

یہ کیوں ہوا؟

ایسا کیوں ہوا؟

اتنے میں بی بی سی نے خبر دی کہ افواج پاکستان نے اسلام آباد ٹیلی ویژن پر قبضہ کر لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خبر آئی کہ "وزیر اعظم ہاؤس کو بھی فوج نے گھیرے میں لے لیا ہے"

یوں 12 اکتوبر کی شام نے میری ہی نہیں پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام کی زندگی میں تہلکہ مچا دیا اور تاریخ کے پہیے کو ایک مرتبہ پھر 1985ء پر واپس لا کھڑا کیا یا شاید اس سے بھی پیچھے کیونکہ پاکستان ان تجربات سے بہت پہلے ہی گزر چکا ہے اور ہر تجربے نے پاکستان کو کمزور سے کمزور تر کیا ہے۔

اللہ خیر کرے، یہ فقرہ میرے منہ سے نکلا ہی تھا کہ بی بی سی کی سکرین پر سابق وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو کا چہرہ نمودار ہوا جو پوچھنے پر کہتی ہیں "انہیں پاکستان سے خبر ملی ہے کہ وہاں سول وار شروع ہو گئی ہے"

اس وقت میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی میں بالکل اکیلا بیٹھا تھا میری چیخ نکل گئی اور میں زار و قطار رونے لگا اور دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگا کہ اللہ خیر کرے۔ اللہ پاکستان کو بچا لے۔ میں نے 1947ء میں تقسیم ہند کا منظر دیکھ رکھا ہے۔ ہجرت کے وقت مہاجر کیمپوں کی صعوبتیں بھی جھیلی ہیں اور پھر 1971ء کی ذلت بھی دیکھی ہے۔ اس کے بعد اب یہ صورتحال؟

میرے دل و دماغ وسوسوں کے نرغے میں تھے اور بینظیر بھٹو کے الفاظ مجھے نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ میں نے انہیں کوسنا شروع کر دیا حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہوں نے جو سنا کہہ ڈالا۔ پھر میں نے جنرل پرویز مشرف کو سنانی شروع کر دیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ ریٹائر ہو کر گھر چلے جاتے تو کون سا پہاڑ گر پڑتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے اور پھر میں نے نواز شریف کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس قسم کا حکم صادر کرتے۔ اچھا بھلا کام چل رہا تھا میاں نواز شریف نے عجلت کی اور عجلت ابلیس کا کام ہے۔ خواہ مخواہ ملک کے لئے مصیبت مول لے لی۔

میں اس کیفیت سے گزر رہا تھا کہ میرے کزن غلام سرور آ گئے۔ مجھے دیکھ کر بہت پریشان ہوئے مجھے پانی

پلایا۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید میں نواز شریف کی فراغت پر پریشان ہوں۔ میں نے کہا یہ بات نہیں، سنا ہے ملک میں سول وار شروع ہو گئے ہے؟ ابھی ابھی بینظیر نے یہ بات بی بی سی سے کہی ہے۔

نہیں! ایسی کوئی بات نہیں میں شہر کا چکر لگا کر آیا ہوں۔ گورنر ہاؤس پر فوج آ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملک میں مارشل لاء لگ گیا ہے لیکن ایسی کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ بینظیر کو لندن بیٹھے کیا پتہ، یہاں سب خیریت ہے۔

اللہ کرے ایسے ہی ہو، مارشل لاء بھی بری چیز ہے مگر ہر صورت سول وار سے بدرجہا بہتر ہے۔

اتنے میں بی بی سی پر راجہ ظفر الحق جو اس وقت لندن میں تھے نمودار ہوئے وہ کہہ رہے تھے "جنرل پرویز مشرف کو چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کے عہدے سے ہٹا کر بہتر عہدہ پر لگا دیا گیا ہے اور چیف آف آرمی سٹاف کسی اور جنرل کو لگا دیا گیا ہے۔ پاکستان میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے، وہاں پر ایک دستوری اور جمہوری حکومت موجود ہے باقی سب افواہیں ہیں"

مجھے ان کے الفاظ سے ایک وقتی سکون ملا اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، مگر ان کی اطلاعات بھی اتنی ہی ناقص تھیں جتنی کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی۔ 12 اکتوبر کی شام ان چند ساعتوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ دستوری حکومت کی جگہ فوجی حکومت نے لے لی تھی۔ میاں نواز شریف کی حکومت برخاست کر دی گئی تھی اور ان کی جگہ فوجی انتظامیہ نے لے لی تھی۔ ملک کے اندر کسی قسم کی گڑبڑ نہیں تھی لیکن ہم ایک دفعہ پھر 1985ء کے آغاز پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا ہوگا؟

بہت رات بیتے بلکہ یوں سمجھئے کہ اگلی صبح جنرل پرویز مشرف نے قوم سے مختصر خطاب کیا اور بتایا کہ انہوں نے خود زمام حکومت سنبھال لیا ہے کیونکہ میاں نواز شریف کی حکومت نے ملک کے اندر عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اداروں کو تباہ کر دیا تھا۔ فوج کو تقسیم کر رہے تھے۔ معیشت کو برباد کر دیا تھا اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف جس جہاز میں کولمبو سے واپس پاکستان آ رہے تھے اس جہاز کو کراچی ایئرپورٹ پر اترنے نہیں دیا جا رہا تھا آخر کار فوج کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑی تاکہ وہ ملک اور اپنے سربراہ کو بچا سکے۔

بعد میں انہوں نے سینٹ، قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور ان کے ذریعے متشکل مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بھی معطل کر دیا۔ وزیر اعظم، وفاقی وزراء، صوبائی وزرائے اعلیٰ و وزراء اور گورنروں کو بھی چلتا کیا بلکہ بہت سوں کو حراست میں لے لیا اور ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی حالانکہ پاکستان میں 28 مئی 1998ء سے جس دن ایٹمی دھماکہ ہوا تھا ایمرجنسی لاگو تھی اور عوام کے بہت سے بنیادی حقوق معطل تھے۔ دستوری کے عارضی حکم نامے کے ذریعہ یہ سب کچھ ہوا اور دستور کے کچھ "غیر ضروری" حصے سلا دیئے گئے تھے۔

پاکستان میں پہلے بھی مارشل لاء لگتے رہے ہیں مگر حالیہ فوجی راج قدرے مختلف ہے۔ اس دفعہ فوجی سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی بجائے چیف ایگزیکٹو یعنی ناظم اعلیٰ کہلوائے اور فوجی حکمرانی کو تمام کور کمانڈروں اور پرنسپل سٹاف افسروں کی سوچ بچار کا نتیجہ کہا گیا یعنی اسے ملک پر فوج کی طرف سے ایک اجتماعی قبضہ گردانا گیا۔ یوں ملک میں پہلی دفعہ فوج نے اجتماعی طور پر حق حکمرانی کا دعویٰ کیا ورنہ پہلے صرف اس کا کمانڈر اکیلا ہی یہ کام کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اندرون ملک اور بیرون ملک شور اٹھنے پر جنرل پرویز مشرف نے کہا کہ وردی والے وہ اکیلے ہی ہوں گے باقی سب سویلین ہوں گے اس کے باوجود جو مانیٹرنگ سسٹم متعارف کروایا گیا اس میں ہر جگہ اور ہر محکمہ میں فوجی افسران کو داخل کیا گیا، شاید زیادہ سے زیادہ فوجی افسران کی شمولیت تالیف قلوب کے لئے ضروری سمجھی گئی ہو۔

صدر مملکت اور اعلیٰ عدالتوں کو پہلے کی طرح کام کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ اس طرح کچھ ریاستی اداروں کو رہنے دیا اور کچھ اداروں کو گہری نیند سلا دیا گیا۔ سابق حکومت پر الزام تھا کہ اس نے اداروں کو کمزور کر دیا تھا۔ اب بہتر سمجھا گیا کہ انہیں ویسے ہی رخصت پر بھیج دیا جائے۔ کہا گیا کہ جمہوریت جعلی تھی، کچھ کام نہیں کر رہی تھی، جو کر رہی تھی خراب کر رہی تھی، اب اصلی جمہوریت کا اہتمام ہوگا، مگر کچھ عرصہ بعد پہلے ذرا صفائی ہو لے۔

اگلی صبح کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ جنرل پرویز مشرف جس جہاز کے ذریعہ کولمبو سے کراچی آ رہے تھے اسے کراچی اترنے سے روکا گیا، اسے کہا گیا کہ وہ کسیا ور ہوائی اڈے پر اتر جائے۔ نوابشاہ، سکھر اور مسقط کا ذکر آیا

مگر ساتھ بھارت میں اتارنے کا بھی عندیہ دیا گیا۔ اس طرح جنرل پرویز مشرف اور دو سو کے قریب عام مسافروں کی جانوں کو خطرہ میں ڈال دیا گیا۔ وزیر اعظم کے اس "اقدام" کی تفصیلات نے سامنے آ کر جلتی پر تیل کا کیام کیا اور عوام نے اس کا بہت برا منایا۔ یوں نواز شریف ایک ظالم شخص نظر آیا۔ مجھے تو خیر اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا، مگر عامتہ الناس نے اس پر مکمل یقین کیا اس طرح نواز شریف کے امیج کو ایک زبردست دھچکا لگا اور لوگوں نے کہیں بھی ان کے حق میں کلمہ خیر نہ کہا۔ ان کی حکومت ویسے بھی کچھ عرصہ سے مخاصمانہ عوامی رائے کے دباؤ میں تھی۔ اگر پاپولر بھی ہوتی تو اس طرح کی فوجی کارروائی پر لوگ مشکل سے ہی اپنا سخت ردعمل ظاہر کرتے۔ اس کی بنیادی وجہ لوگوں کے دل میں بھارت سے نفرت اور اس کی فوج کا خوف ہے۔ پاکستانی عوام کسی بھی صورت اپنی افواج کو کمزور نہیں دیکھنا چاہتے اور نہ ہی وہ اسے کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے حسب توقع نواز شریف کے حق میں اور فوجی کارروائی کے خلاف کوئی ردعمل نہ ہوا جس پر دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف نتائج نکالے گئے اور پوری دنیا کنفیوژن کا شکار رہی۔

نواز شریف اور مسلم لیگ کے مخالفوں نے خوشیاں منائیں اور بعض مقامات پر تو مٹھائیاں بھی تقسیم کی گئیں لیکن یہ رویہ عام نہیں تھا، صرف نواز شریف کے مخالفوں کا تھا مگر بہت سے مقتدر لوگوں بالخصوص جرنیلوں کو یوں محسوس ہوا کہ شاید انہوں نے ایک مقبول انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ نواز شریف کی اپنی جماعت پاکستان مسلم لیگ ششدر رہ گئی، سب کچھ ایسی سرعت کے ساتھ ہوا کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ مسلم لیگ کی خاموشی نے مزید چہ مگوئیوں کو جنم دیا اور یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید یہ جماعت اب بکھر جائے گی۔ مخالف سیاسی جماعتوں نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اور بینظیر بھٹو کے علاوہ کسی بھی سیاسی شخصیت کی طرف سے کوئی پختہ ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ بینظیر بھٹو نے کہا وہ کبھی بھی فوجی راج کے حق میں نہیں رہی ہیں بلکہ انہوں نے تو اس کے خلاف طویل جدوجہد کی تھی۔ اس لئے وہ فوج کو ویلکم کیسے کہہ سکتی ہیں۔ ویسے نواز شریف کی ناپختگی کو اس تمام صورتحال کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں اور جنرل پرویز مشرف سے توقع رکھتی

ہیں کہ وہ جلد سے جلد پاکستان میں جمہوریت بحال کرتے ہوئے نئے انتخابات کروا دیں گے۔ دیگر سیاسی جماعتوں نے جانے والی حکومت کے کڑے احتساب کا مطالبہ کیا۔ کسی نے انتخابات سے پہلے احتساب کا نعرہ لگایا، اور کسی نے کہا کہ عدالتی و دستوری نظام ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ جنرل حمید گل نے تو انقلاب انقلاب کی رٹ شروع کر دی۔ اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں شروع ہو گئیں۔

بیرون ملک سے البتہ سخت ردعمل سامنے آیا۔ سب سے پہلے امریکہ نے فوجی راج کی مذمت کی اور فوری بحالی جمہوریت کا مطالبہ کیا۔ اپنے سفیر کو فوراً واپس اسلام آباد روانہ کیا کہ وہ ذاتی طور پر مل کر صورتحال کا جائزہ لے اور جمہوریت کے حق میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے۔ امریکہ کے لئے پاکستان اور اس کے اردگرد ابھرتی ہوئی اسلامی شدت پسندی، افغانستان اور طالبان و اسامہ بن لادن کا مسئلہ، دہشت گردی اور منشیات کے مسائل خاص طور پر باعث تشویش ہیں۔ پاکستان ایک جوہری قوت بھی ہے اور کشمیر پر اس کا بھارت سے جھگڑا بھی ہے، چین کا پڑوس اور دوستی بھی ایک زاویہ ہے لہٰذا اس کے لئے پاکستان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس لئے نئی صورتحال کافی دشواری کا باعث بن گئی۔ امریکہ نے اپنے قوانین اور کانگریس کی وجہ سے کسی فوجی حکومت کی سرپرستی نہیں کر سکتا اور پھر کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے پاکستان کیاندر کسی غیر دستوری تبدیلی کے خلاف انتباہ بھی کر رکھا تھا لہٰذا امریکہ کا یہ ردعمل فطری تھا اور اس نے ایسے ہی کیا۔

اسی طرح برطانیہ کی طرف سے بھی فوجی حکومت کے خلاف ردعمل سامنے آیا اور انہوں نے کھل کر فوجی کارروائی کی مذمت کی۔ اس طرح دولت مشترکہ کی طرف سے بھی سخت ردعمل ظاہر کیا گیا اور دولت مشترکہ سے پاکستان کی رکنیت معطل کر دی گئی۔

یورپی یونین نے بھی یہی روش اختیار کی اور پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لئے دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کے لئے بین الاقوامی رائے عامہ کی بے انتہا اہمیت ہے کیونکہ بوجوہ ہماری معیشت بہت عرصہ سے دوسروں کی محتاج چلی آ رہی ہے۔ جنرل ایوب خان نے معمولی قرضوں سے جس روش کا آغاز کیا تھا وہ اب ایک

بہت بڑی مصیبت بن چکی ہے۔ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف ہمارے حلق کا کانٹا بن چکے ہیں اور ان کی مرضی کے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے اور ان سب کی کلید امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ بالفاظ دیگر ہم امریکہ کے یرغمالی ہیں۔

امریکہ اب جمہوریت کا چمپئن ہے، وہاں کے قوانین بھی یہی ہیں مگر جب سرد جنگ تھی تو وہ دنیا بھر میں ہر آمر کا سرپرست بن جاتا تھا۔ خود پاکستان میں امریکہ ہر فوجی ڈکٹیٹر کا مددومعاون رہا۔ جنرل ضیاء الحق کی جتنی دیر افغانستان میں روس کے خلاف ضرورت تھی انہیں سر پر اٹھائے رکھا اور جب ضرورت نہ رہی تو بلا تکلف پٹخ دیا۔ اب دیکھئے کیا صورت بنتی ہے۔ صدر کلنٹن نواز شریف کو اپنا ذاتی دوست قرار دیتے رہے ہیں جس سے نواز شریف کو اندرون ملک امریکی پٹھو بھی کہا گیا۔ اب دیکھئے امریکہ اور کلنٹن کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ امریکہ جو بھی کرے گا احتیاط سے کرے گا۔ جرنیلوں کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیگا اور سیاست کی نبض پر بھی ہاتھ رکھے گا۔

اس سارے معاملہ میں بھارت اور افغانستان بھی بہت اہم ہیں اور ان دونوں ممالک میں امریکہ کی دلچسپیاں گوناگوں ہیں۔ بھارت اور افغانستان سے متعلق معاملات کے اثرات ہمارے اندرونی معاملات میں بے انتہا ہیں۔ جنرل پرویز مشرف ظاہراً نواز شریف ہی کی خارجہ پالیسی کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ بعض دوست تو کہتے ہیں کہ وہ دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ سیکولرازم کا پیغام دینے کے لئے انہوں نے اتاترک کو اپنا ہیرو گردانا اور افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت یعنی طالبان سے کافی حد تک دست کشی کا اشارہ دیا۔ بھارت سے دوستی کی بات بھی کی اور فوجیں سرحدوں سے بہت دور لے گئے۔ معاشی جنگ کے لئے جنرل صاحب نے بھی وہی فنکار (مشیر وغیرہ) قائم و دائم رکھے ہیں جنہیں نواز شریف لائے تھے بلکہ چند ایک کا اضافہ کر لیا ہے جو امریکی و مغربی ''سوچ'' کے پیروکار ہیں۔

اس طرح حقیقی معنوں میں بات وہیں کی وہیں ہے جہاں 12 اکتوبر کو تھی۔ کوئی بنیادی بات جو لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی لا سکے وقوع پذیر ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ چند دنوں کے اندر لوگوں میں مایوسی واپس آ رہی ہے۔

فوجی کارروائی سے کوئی زیادہ امید تو نہیں تھی مگر جو کچھ تھی وہ بھی ہرن ہوتی نظر آ رہی ہے۔

ہاں! چہرے مہرے کی تبدیلی کافی نظر آ رہی ہے، نیشنل سکیورٹی کونسل تشکیل پا چکی ہے جسے وفاقی کابینہ پر فوقیت ہے۔ اس میں فوج کے تینوں بازوؤں کے سربراہوں کے علاوہ چار سویلین بھی شامل کئے جا چکے ہیں جن کی عوام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں اور تمام کے تمام چیف ایگزیکٹو کے رحم و کرم پر ہیں۔ اس شکل میں تمام تر اختیارات چیف ایگزیکٹو کی ذات میں مرتکز ہو کر آمریت کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے۔ نئے دستور کی تشکیل اور ترامیم کی باتیں ہو رہی ہیں جو ایک نہایت ہی خطرناک بات ہے اگر پاکستان کے متفقہ دستور کو چھیڑا گیا تو پھر ناممکن ہے کہ کبھی بھی قابل قبول آئین بن سکے۔ دستور سازی نے پہلے ہی ہماری بہت درگت بنا رکھی ہے بلکہ پاکستان کو یہ مشق دولخت کر چکی ہے۔ اب ریفرنڈم کی باتیں ہو رہی ہیں تاکہ وہ دستور جو اس طرح کے قبضے کو بغاوت گردانتا ہے اسے غیر موثر کیا جا سکے۔ ملک کے لئے یہ بہت ہی زیادہ خطرناک راستے ہیں آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

احتساب پر بہت زیادہ زور ہے کیونکہ یہ عوامی مطالبہ ماننے سے غیر دستوری حکمران کو حکمرانی کا جواز مل سکتا ہے۔ احتساب ہوتا ہے یا نہیں؟ مگر تسلیم احتساب کا سیدھا مطلب ہے تسلیم حکومت۔ رہی بات احتساب کی تو وہ کسی وقتی غم و غصہ کے اظہار کا نام نہیں، وہ تو ایک نظم اور نظام کا نام ہے جس کے لئے ایک ماحول درکار ہوتا ہے جس میں آزادی اور جرات اظہار کے مواقع دیئے جاتے ہیں کہ مملکت کا ہر شہری بلا خوف و خطر حاکم وقت کو روک ٹوک سکے جدید دور میں آزادی اظہار اور آزاد عدلیہ کے اداروں سے ہی اسے ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام

احتساب کا نعرہ صرف ایک فریب رہا، یہ اپنے اصل مقاصد حاصل نہیں کر سکا کیونکہ اس کی بنیاد ہی بدنیتی پر رکھی گئی۔

ناظم اعلیٰ کے سات دلفریب نکات بقول مشہور دانشور اشفاق احمد خان وہی ہیں جو مختلف سیاسی جماعتیں وقتاً فوقتاً اپنے اپنے منشور میں لکھتی اور کہتی رہی ہیں۔ الفاظ کی اہمیت ضرور ہے مگر اصل بات عمل کی ہے۔ دستوری خلاء میں قومی یکجہتی کیسے بہتر ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک تضاد ہے کہ سب لوگ حق حکمرانی میں شراکت سے محروم ہوں اور عندیہ وہدف قومی اتحاد و یگانگت کا دیا جائے ایک آمر جو تمام عوامی اداروں کے بغیر چل رہا ہو بلکہ وزیر بھی ایسے چنے کہ جن کا عوام میں کوئی وجود نہ ہو وہ عوامی رائے کو اپنے ساتھ کیسے لے کر چل سکتا ہے۔ اس لئے بہت سے اہداف صرف لفظی ہیر پھیر نظر آتے ہیں، اس کے نتائج کبھی اچھے برآمد نہیں ہو سکتے۔ تاریخی کا فیصلہ بھی ہے کیونکہ اس سے قبل اس طرح کے تجربات نے ملک کو کچھ نہیں دیا البتہ نقصان ضرور کیا ہے۔

رہا معاملہ معیشت کا تو وہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے جس کی بہت سے جہتیں ہیں۔ ہمارا معاشی مسئلہ محض معاشی نہیں ہے، یہ ایک سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسئلہ ہے جس کی بنیاد ہمارے ہاں کی آمرانہ حکومتوں نے ہی رکھی۔ ہمارے آمروں نے وقتی مفادات کی خاطر ملک کو یرغمال بنائے رکھا اور غیر ملکی قرضے لیتے رہے۔ اپنی ناجائز حکومتوں کو وقتی طور پر پرکشش بنانے کے لئے پورے ملک ہی کو داؤ پر لگاتے رہے اور اب حالت یہ ہے کہ اپنے قرضوں کا سود واپس کرنے کے لئے ہمیں مزید قرضوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چودھری محمد علی مرحوم جو ہمارے بہت ہی دیانتدار اور فاضل وزیر اعظم رہے ہیں انہوں نے یہ بات ساٹھ کے عشرے میں ہی کہہ دی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمیں یہ دن دیکھنا پڑے گا اور وہ دن آج ہمارے سر پر ہے۔ چودھری صاحب یہ ساری باتیں جنرل ایوب خان کو کہہ رہے تھے جنہوں نے یہ بدعت ڈالی تھی۔

بویا جو ہے وہی تو اٹھاؤ گے کھیت سے
سرمہ طلب کرو نہ بگولوں کی ریت سے

اب جنرل مشرف اس کا پھل (کڑوا پھل) کاٹنے آ گئے ہیں۔ ان کے پاس وہ کون سی گیدڑ سنگھی ہے

جس سے یہ اس کا حل نکالی سکیں گے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ "اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں جس کے سبب بیمار ہوئے ہم" یہ تو عطار کے لونڈے سے دوا لینے والی بات ٹھہری۔ معیشت اب ایک قومی مسئلہ ہے جو قومی غیرت، محنت شاقہ اور بلند ہمتی ہی سے حل ہو سکتا ہے۔ اسے کوئی ماہر معیشت حل نہیں کر سکتا اس کے لئے ایک ولولہ انگیز قومی قیادت کی ضرورت ہے جس پر قوم کو پورا بھروسہ ہو اور قوم اس قیادت کے پیچھے جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ ہمارا معاشی مسئلہ اب سیاسی مسئلہ بلکہ قومی مسئلہ بن چکا ہے جو کھوکھلے نعروں اور شعبدے بازیوں سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ آمدہ صورتحال میں تو یہ بالکل حل نہیں ہو سکتا کیونکہ سیاسی پاکستان ایک طرف نظر آ رہا ہے اور بیورو کریٹک پاکستان (بشمول جرنیلوں کے) دوسری طرف نظر آ رہا ہے۔ سب کی شمولیت اور عزم کے بغیر قومی مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔

ٹیڑھی کھیر

کھیر ٹیڑھی نہیں ہوتی، کھیر تو ایک نرم چیز ہے، جدھر مروڑ دو مڑ جاتی ہے اصل میں برتن ٹیڑھا ہوتا ہے اور پھر ٹیڑھے برتن میں پڑی کھیر یا گھی کو نکالنے کے لئے انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں۔ بعض دفعہ تو انگلیاں ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو برتن اور انگلیاں دونوں ٹوٹ جاتے ہیں، ہمارے ساتھ تو پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔

جنرل یحییٰ خان کی مارشل لائی حکومت نے کھیر کے ساتھ ساتھ برتن بھی توڑ لیا تھا پھر کھیر بچی نہ برتن اور ان کی وہ حکومت ایک غاصب اور ناجائز حکومت کہلوائی، حالانکہ فوجی حکومت ایوب خان کے خلاف سخت ہنگاموں اور خونریزی کے نتیجہ میں آئی تھی کہ اس وقت مقصد فتنہ وفساد کو فرو کرنا تھا۔ یہی صورتحال 1977ء میں وقوع پذیر ہوئی کہ پاکستان کے گلی گلی اور کوچے کوچے میں فساد پھیل چکا تھا۔ ملک انارکی (ANARCY) سے دوچار تھا اور افواج پاکستان کو دخل دینا ہی پڑا مگر اس دفعہ تو کوئی ایسی صورتحال درپیش نہیں تھی۔ ظاہراً سب امن تھا، ریاست کے تمام ادارے اپنی اپنی جگہ کام کر رہے تھے کسی جگہ کوئی ایجی ٹیشن نہیں تھا، معمول کی سیاسی زندگی تھی جس میں حزب اختلاف ضرور شاکی تھی مگر کوئی غیر معمولی بات نہیں ہو رہی تھی۔ حکومت وقت جگہ جگہ سڑکیں اور پل بنا رہی تھی، امن عامہ بہتر ہو رہا تھا، تھانہ کلچر کے بدلنے کی باتیں ہو رہی تھیں، فیکٹریاں اور تعلیمی ادارے نہایت پرامن انداز میں کام

کر رہے تھے۔ بہت عرصہ سے زیر التواء کام کر دکھائے گئے ملک میں مضبوطی کے ساتھ مردم شماری کروا کر ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا گیا تھا۔ شہباز شریف نے ایک مدت سے جاری بوٹی مافیا کی لعنت کو عملاً ختم کروا دیا تھا۔ میاں نواز شریف نے ایٹمی دھماکہ کر کے پاکستان کو ایک بہت ہی اعلیٰ بین الاقوامی مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ بھارت کے ساتھ کشیدگی کم ہو رہی تھی اور کشمیر کا مشکل ترین مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

نواز حکومت اگرچہ خود جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی گود سے اٹھ کر آئی تھی لیکن اس زمانے کی بہت سی خرابیوں کو آہستہ آہستہ دور کر رہی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی بدنام زمانہ آٹھویں دستوری ترمیم کو نواز شریف ہی نے ختم کیا اور اس انداز سے کیا کہ تمام سیاسی جماعتوں کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اس طرح مارشل لائی تحفہ ہارس ٹریڈنگ جو غیر جماعتی انتخابات کی وجہ سے ہماری سیاسی زندگی میں داخل ہو چکی تھی، اس کو میاں نواز شریف نے مناسب دستوری طریقہ سے ختم کیا، بلکہ اس کے بعد تو بعض دوستوں کے مطابق ایم این اے اور ایم پی اے صاحبان یتیم دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ ترمیم بھی مکمل اتفاق رائے سے کی گئی اور یوں ایک بہت بڑی سیاسی لعنت ختم ہو گئی۔

نواز حکومت نے اپنے دونوں ادوار میں سماجی بھلائی اور مساوات کے کام شروع کئے۔ بے زمین مزارعین میں لاکھوں ایکڑ زمین تقسیم کی اور انہیں مالکانہ حقوق دیئے۔ غریب مزدوروں کے لئے اعلیٰ قسم کے ہسپتال بنائے۔ خاص طور پر گردے کے علاج کے لئے جو بہت زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ مزدوروں اور غرباء کے لئے شفا خانے بنوائے۔ غریب طلبہ کے لئے اعلیٰ ٹیکنالوجی میں مفت تعلیم کا انتظام کیا۔ کمپیوٹر کی تعلیم کے لئے انسٹی ٹیوٹ بنوائے اور ساری دنیا کے ماہرین کو نظم و نسق بہتر بنانے کے لئے پاکستان لے کر آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوابیدہ بیورو کریسی کو ایسا جھنجھوڑا کہ افسران کرام ہر طرف مستعد نظر آنے لگے۔ میاں نواز شریف اور خاص طور پر میاں شہباز شریف ہر جگہ برق رفتاری سے پہنچ جاتے تھے اور یوں حرام خور افسروں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ کام ہوتا نظر آ رہا تھا۔ تجاوزات ختم ہو رہی تھیں تو سڑکیں بن رہی تھیں۔ کہیں بھل صفائی ہو رہی تھی تو کہیں نئے نئے منصوبے عمل پذیر تھے۔ چشم فلک نے مملکت پاکستان میں یہ نظارہ بہت مدت بعد دیکھا تھا۔

سندھ کی حد تک میاں نواز شریف نے اپنی جماعت ہی کی حکومت برخواست کر دی کیونکہ وہ وہاں ٹھیک کام نہیں کر رہی تھی۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال خراب تھی۔ پھر گورنر معین الدین حیدر اور رانا مقبول احمد نے میاں صاحب کی ہدایات پر ایسا کام کیا کہ ساری دنیا تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔ مخالفوں نے ضرور کچھ نہ کچھ کہنا تھا کہ یہ جمہوری عمل کا ایک خاصہ ہے مگر کوئی شخص یا جماعت یہ نہ کہہ سکی کہ وہاں پر اس طرح کا ظلم ہوا جو جنرل نصیر اللہ بابر نے بپا کر رکھا تھا۔ قانون کی حرمت بھی رکھی اور امن عامہ بھی درست کر کے دکھا دیا۔

اس طرح اور بھی بہت سے اقدامات تھے جو نواز شریف حکومت نہایت خضوع و خشوع سے کر رہی تھی اور ملیک حالات سنور رہے تھے۔ ایٹمی دھماکہ کی سختیاں جھیلنے کے باوجود ملک ترقی کی راہ پر گامزن تھا جتنا کہ کوئی تیسری دنیا کا ملک ہو سکتا ہے۔ تیسری دنیا کے اپنے مسائل ہیں۔ وہ راتوں رات یورپ اور امریکہ نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہوتا ہے مگر جو بھی موجودہ صورت تھی اس میں معزول کی جانے والی حکومت بہت ہی عمدہ کارکردگی دکھا رہی تھی۔

اور پھر 12 اکتوبر کا دن آ گیا اور یک لخت یہ سلسلہ منقطع ہو گیا جس طرح کہ میں نے پہلے باب میں بیان کیا ہے۔ اس اقدام کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک الزام ابھرا ہے کہ میاں نواز شریف افواج پاکستان میں پھوٹ ڈال رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے مگر بادی النظر میں یہ بات قرین قیاس نہیں۔ انہوں نے تو چیف آف آرمی سٹاف کی سفارش پر اپنے ایک وزیر کے بھائی جرنیل کو بھی ریٹائر کر دیا، اسی طرح سے ایک دو اور بھی ایسے اقدامات کئے جنہیں فوجی کمان نے چاہا۔

کافی حد تک مصدقہ بات یہ ہے کہ کارگل ایشو پر اختلاف رائے موجود تھا۔ کچھ لوگ کارگل کے معاملہ میں جنرل پرویز مشرف کے ہمنوا تھے اور کئی سینئر افسر اس نقطہ نگاہ کے خلاف بھی تھے۔ وہ اس کے دیگر پہلوؤں کا قومی نقطہ نگاہ سے تجزیہ کرتے تھے۔ اس ایشو پر اختلاف رائے تھا، مگر یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا رہا ہے۔ ایک جرنیل اور سپاہی میں یہی تو فرق ہے۔ اگر جرنیل بھی سپاہی کی طرح ہاں میں ہاں ملاتا نظر آئے تو پھر جرنیلی فکر و نگاہ

وہاں کہاں سے آئے گی۔ ایک جرنیل صاحب فکر ونظر ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے اپنے ادارے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی تقدیر پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے دنیا میں ہر جگہ اس طرح کی بحث وتمحیص کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ حالات وواقعات سے شناسا دوستوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے اختلاف رائے کا باعث نواز شریف نہیں تھے بلکہ کارگل کا نازک ایشو تھا۔ اسے میاں نواز شریف کے گلے مڑھ دینا ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوسرا معاملہ جنرل پرویز مشرف کے کولمبو سے آمدہ ہوائی جہاز کا ہے۔ اب تو اس معاملہ میں باقاعدہ ایکمقدمہ بھی زیر سماعت ہے جو واقعات اس کی ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئے ہیں وہ عجیب وغریب ہیں۔ ان سے تو کسی فوجداری مقدمہ کا بننا نظر ہی نہیں آرہا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس جہاز کو کراچی ہوائی اڈے کی بجائے نواب شاہ، سکھر اتارنے کے لئے کہا گیا تھا۔ کس نے کہا؟ سول ایوی ایشن کی مجاز اتھارٹیز نے جنہیں قاعدہ قانون اس طرح کے احکامات کا اختیار دیتا ہے اگر ان کا اختیار موجود ہے تو پھر جرم کہاں سے آگیا۔ اس میں غیر قانونی قوت اور جبر کے استعمال کا مفروضہ کہاں سے آگیا۔ مجاز حکام کے جہاز کی فلائٹ کو Diver کرنے سے اس کے اغواء کا نتیجہ کیسے نکل آیا۔ چیف آف آرمی سٹاف کی حراست کا پہلو کہاں سے نکلا اگر نکلتا بھی ہے تو وہ کون سا جرم ہے کہ جس کی بنا پر باقاعدہ فوجداری مقدمہ درج ہو سکے۔ ہوسکتا ہے کہ فوجی سربراہ کو ہٹانے کا ایک دستوری منتخب وزیر اعظم کے پاس جواز ہو اور ممکنہ نتائج سے بچنے کے لئے اسے حراست میں لینا بھی مناسب سمجھا گیا ہو مگر ان سب باتوں سے کس جرم کی سرزدگی کیسے ہوتی ہے؟ ان سب سوالوں پر بحث جاری ہے، اور یہ عدالت میں بھی اٹھائے جارہے ہیں۔ اس لئے حالیہ فوجی کارروائی کے حالات پہلی تمام کارروائیوں سے بالکل مختلف نظر آرہے ہیں۔ واقعات کی بناء پر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو نظریہ ضرورت کے تحت چھ ماہ کے لئے جواز ملا تھا مگر اس دفعہ تو نظریہ ضرورت کی تطبیق بھی دشوار ہے، اس مرتبہ تو معاملہ بالکل دوسرا نظر آرہا ہے کہ آپ نے مجھے برخاست کر دیا ہے تو میں بزور بازو آپ کو برخاست کرتا ہوں۔ بات اس سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ اس لئے یہ کھیر بھی ٹیڑھی ہے

اور اس کا برتن بھی دیکھئے یہ کھیر کن انگلیوں سے نکالی جاتی ہے نکلتی بھی ہے یا نہیں۔ احتساب، معاشی حالات اور عدم استحکام کی باتیں نہ صرف غیر متعلقہ ہیں بلکہ نہایت ہوائی بھی کہ دل بہلانے کا اک بہانہ درکار ہے۔

اس وقت تک کے زمینی حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ نواز شریف کی جماعت پاکستان مسلم لیگ عام تاثر کے خلاف اپنے مقام پر متحد کھڑی ہے۔ عام خیال (خاص طور پر ہیئت مقتدرہ کے ہاں) یہی تھا کہ مسلم لیگ ایک مفاداتی ٹولی ہے جو ہمیشہ سے مارشل لاؤں کی "بی" ٹیم رہی ہے اس لئے اس طرح کی تبدیلی آتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ شروع شروع میں کچھ آوازیں خاص طور پر اعجاز الحق اور عابدہ حسین کی سربراہ میں اٹھیں کہ نواز شریف کو مسلم لیگ کی سربراہی سے ہٹا کر اسمبلیوں کی بحالی کی صورت نکالنی چاہئے، مگر یہ بات چل نہ سکی۔ میاں محمد اظہر (جو نواز شریف کے دور اقتدار ہی میں ان کے خلاف بول رہے تھے) بھی ناکام ہو گئے تھے۔ اس مشکل وقت میں سینیٹر راجہ ظفر الحق نے زیادہ بالغ نظری اور سیاسی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے ایک رابطہ کمیٹی بنا کر مسلم لیگ کو متحد رکھا اور وہاں سے یہ فیصلہ بھی کروالیا کہ ملک وملت کے بہترین مفاد میں وہ افواج پاکستان سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہیں کریں گے۔ جنرل پرویز مشرف کی "ایک فرد" کے طور پر دوسری صورت ہے۔ اس نازک وقت میں پارٹی نے میاں نواز شریف ہی کو اپنا صدر قائم رکھنا مناسب سمجھا ہے۔ سیاسی جماعتیں قوموں کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ سیاسی جماعتیں ہی ریاست کے سب اداروں کو جنم دیتی ہیں۔ یہیں سے سینٹ، نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں جنم لیتی ہیں جو حکومتی اداروں کو تخلیق کرتی ہیں۔ اس لئے کسی بھی منظم ومہذب معاشرہ میں سیاسی جماعتوں کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے۔ جہاں سیاسی جماعتیں اچھی اور بالغ نظر ہوں گی، وہاں ہر حکومت وحکمرانی بھی اچھی ہوگی اور پھر پاکستان مسلم لیگ کو تو پاکستان کی اساسی جماعت ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کا ایسے وقت میں متحد اور ہوش مند رہنا ایک بہت ہی اچھا شگون ہے۔

باقی رہی بات اصولی جمہوری موقف کی تو مسلم لیگ نے بحالی جمہوریت کی جدوجہد کو اپنا اولین مطمح نظر ٹھہرایا ہے اور اس کے لئے تمام تر پرامن وقانونی اقدامات اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کاوش میں دیگر سیاسی

جماعتیں بھی مسلم لیگ کی ہم رکاب نظر آرہی ہیں۔ بعض جماعتوں نے تو اس سلسلہ میں باہمی تعاون کا ہاتھ بھی بڑھا دیا ہے، حالانکہ کچھ عرصہ پہلے آپس میں ان کے درمیان سخت چپقلش نظر آرہی تھیں، مگر جیسے ہی سیاسی کھیل خطرے میں دیکھا، سب اکٹھے ہوتے جارہے ہیں، یہ بات بھی قومی سیاسی بلوغت کا عندیہ دے رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دس سال کا سیاسی سفر بالکل بانجھ نہیں رہا، بلکہ بارآور رہا ہے۔ اگر بلا رکاوٹ چلتا رہتا تو بہت خوبصورت شکل اختیار کرلیتا۔ آخر افراد اور جماعتوں کو بھی تو ایسا ہی ماحول چاہئے جہاں ان کی سیاسی تربیت ہوسکے اور جمہوریت کی بہترین تربیت گاہ سیاسی عمل، سیاسی میدان اور سیاسی جماعتیں ہی تو ہیں۔ سیاسی سوچ اور جماعتوں کو مجتمع کرنے میں موجودہ انتظامیہ کے رویئے کا بھی بہت زیادہ کردار ہے کہ انہوں نے سیاسی عناصر کو بالکل ہی ایک گندہ پلندہ سمجھ کر الگ کردیا ہے اور اپنے ساتھ بالکل غیر سیاسی ماہرین قسم کے لوگوں کو رکھا ہے۔ ظاہر ہے ان طور طریقوں نے سیاسی لوگوں کو پھر دوسری طرف ہی اکٹھا کرنا تھا۔ مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی ہے اور اسے صرف اور صرف سیاسی طور پر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام دنیا کی تاریخ کا سبق ہے۔ ایسے مسائل ماہرین نہیں قائدین ہی حل کرسکتے ہیں۔ اس لئے جنرل پرویز مشرف اپنے تمام تر پیشروؤں کی طرح ایک ٹیڑھے راستے پر چلتے نظر آرہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ٹیڑھے راستوں پر آپ کبھی سیدھا نہیں چل سکتے۔

پاکستان مسلم لیگ اور میاں نواز شریف کے خاندان نے پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹا دیا ہے اور جنرل پرویز مشرف کے 12 اکتوبر کے عمل کو دستور اور قانون کی کسوٹی پر پرکھنے کو کہا ہے۔ اب عدلیہ پر بھی بہت کڑا وقت آگیا ہے۔ ہماری عدلیہ کا ٹریک ریکارڈ ملا جلا سا ہے۔ جنرل ایوب خان کے فوجی شب خون کو جسٹس منیر نے ایک کامیاب انقلاب کا درجہ عطا کیا تو جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کو اس کے جانے کے بعد ناجائز قرار دیدیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو نظریہ ضرورت کا سہارا دیا گیا اور بعد کی بہت سی رولنگز اور فیصلوں کے ذریعے اس طرح کی مہم جوئیوں کو غلط ٹھہرایا گیا۔ اب موجودہ 12 اکتوبر کے عمل نے تمام قومی اداروں کو ایک امتحان میں ڈال دیا ہے، "پائے رفتن نہ جائے ماندن" جائز قرار دیتے ہیں تو سب کچھ زمین بوس ہوجاتا ہے، ناجائز قرار دیتے

ہیں تو بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔

12 اکتوبر نے پوری قوم کو ایک خطرناک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ملک کا سب سے اہم ادارہ پارلیمنٹ اور اس سے پیدا ہونے والی حکومت معطل ہے۔ عدلیہ دوراہے پر ہے اور افواج پاکستان دباؤ میں ہیں۔ سول سروسز دگرگوں ہیں اور تمام قوم بے سمت نظر آ رہی ہے۔ یہ تمام ادارے اپنی اپنی جگہ پر محترم اور مقدم ہیں اور کسی ایک کے بغیر قومی کشتی پار نہیں لگ سکتی۔ محض فوج کو مقدم سمجھ لینا کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔ سب کام فوج نہیں کر سکتی۔ ملک وملت کے لئے سے اہم اور مقدس ادارے سیاسی ادارے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں بار بار ٹھوکریں مارنے سے بربادی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہی ہماری تاریخی بدقسمتی رہی ہے۔ سیاسی اداروں کے بعد عدلیہ کا مقام ہے۔ عدل وعدالت کے بغیر کوئی معاشرہ نہ تو مہذب کہلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ جانبر ہو سکتا ہے۔ چرچل نے تو جنگ عظیم دوم کے دوران یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر انگلینڈ کی عدالتیں صحیح کام کر رہی ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ہرا نہیں سکتی۔ چرچل نے فوج کا نہیں عدلیہ کا ذکر کیا تھا۔ ہاں! فوج کی اپنی اہمیت ہے، مگر بہت بعد میں۔ اس لئے معاملات کو اس کے صحیح سیاق وسباق ہی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے ہم اس امتحان سے بخیریت گزر کر کھیر اور برتن دونوں کو بچا لیں۔

ان سب امور پر ہم نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں اپنے قومی افق پر دو شخصیتیں بہت اہم نظر آتی ہیں۔ ہمارا مقدر فی الحال ان ہی کے اردگرد گھومتا نظر آ رہا ہے۔ ان کی کوتاہ نظری یا بالغ نظری ہماری قسمتوں کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ ان میں سے ایک شخصیت جنرل پرویز مشرف کی ہے اور دوسری میاں نواز شریف کی۔ جنرل پرویز مشرف کے متعلق مجھے بہت کم علم ہے، میں ان سے کبھی ملا نہیں ہوں، مگر میاں نواز شریف کے متعلق میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور بعض مشکل اور نازک لمحات میں ان کے عمل اور ردعمل کو بھی دیکھا ہے۔ میں اپنے تجربات کی روشنی میں ان کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہوں گا بلکہ تجربات کو من وعن لکھنا پسند کروں گا، نتائج اخذ کرنا قاری کا کام ہے۔

معصوم چہرہ

میاں نواز شریف سے میری پہلی ملاقات 1984ء میں ہوئی، جب وہ صوبہ پنجاب کے وزیر مالیات تھے۔ میرے ایک عزیز میاں ریاض الحق محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں انسپکٹر تھے۔ ان کے بیوی بچے لاہور میں تھے اور وہ خود سرگودھا میں تعینات تھے۔ گھریلو دشواریوں کی وجہ سے وہ لاہور پوسٹنگ کے خواہاں تھے اور ان کا تبادلہ میاں نواز شریف کے دائرہ اختیار میں تھا۔ بریگیڈیئر (ر) عبدالقیوم میاں صاحب کے بہت قریبی دوست تھے۔ اس لئے میں نے انہیں یہ مسئلہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ ابھی آجائیں۔ میاں صاحب آدھ گھنٹے میں مجھے ملنے آرہے ہیں، پھر یہیں بات کرلیں گے۔ میں سیدھا بریگیڈیئر قیوم کے پاس پہنچا۔ دیکھا تو ایک نہایت ہی حسین وجمیل معصوم چہرہ والا نوجوان ان کے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے میری بالمشافہ ملاقات میاں نواز شریف سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب نے کہا ملئے میاں نواز شریف سے۔ میاں صاحب مجھ سے اٹھ کر نہایت تپاک سے ملے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھے زمانے سے جانتے ہوں۔ چہرے پر ایک عجیب بشاشت اور مسکراہٹ تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ من موہ لینے کی تمام کرامات یک دم آشکار ہوگئیں۔ مجھے بھی مل کر بہت راحت محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا تھوڑی دیر میں میاں صاحب جاپان جارہے ہیں۔ وقت کم تھا۔ مدعا بیان کیا گیا۔ میاں

صاحب نے ایک منٹ بلکہ آدھے منٹ میں بات سمجھ لی اور فوراً اپنے ہاتھوں سے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو فون ملا کر حکم دیا کہ میاں ریاض الحق کا تبادلہ لاہور کر کے آرڈر کی کاپی مجھے پہنچا دی جائے اور پھر میاں صاحب جاپان جانے کیلئے ایئرپورٹ چلے گئے۔

میاں نواز شریف سے یہ پہلی ملاقات میرے لئے بہت ہی خوشگوار یادیں چھوڑ گئی۔ اس لئے نہیں کہ انہوں نے میرا کام کر دیا، بلکہ اس لئے کہ انہوں نے وہ کام نہایت ہی سرعت اور خوبصورتی سے کیا۔ ان کا انداز اتنا بھولا بھالا اور برجستہ تھا کہ جس نے مجھے یہ تاثر دیا کہ شاید میں نے انہیں کام کہہ کر ان پر کوئی احسان کیا ہو۔ سرکاری معاملات میں میں نے ایسی صورت کم ہی دیکھی تھی۔ جن بڑے لوگوں سے مجھے وقتاً فوقتاً واسطہ پڑا..... (جو تعداد میں بہت زیادہ ہیں)..... ان میں میں نے یہ فیاضی کم ہی دیکھی تھی۔ اس لئے میں میاں صاحب کا پہلی ہی ملاقات میں گرویدہ ہو گیا۔ بعد میں میں نے بریگیڈیئر قیوم سے اپنے ان جذبات کا بھرپور اظہار کیا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ بریگیڈیئر صاحب سے میرے پرانے تعلقات تھے، جنرل یحییٰ کے زمانہ میں، میں نے ان کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ بہت ہی ذہین وفطین انسان تھے اور عام فوجیوں سے بہت ہی مختلف بھی۔ وہ ہر بات اور ہر انسان کو نہایت گہری نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ فرمانے لگے "سردار اس نوجوان کا مستقبل بہت روشن ہے۔ یہ 35 سالہ نوجوان بہت ہی نیک اور سمجھدار ہے۔ بس ذرا ضدی سا ہے لیکن اس کی ضد بھی اس کے کام آتی رہے گی۔ شاید میاں شریف نے اسے زیادہ ہی لاڈ پیار سے پالا ہے۔ میاں شریف لاہور کے بہت بڑے صنعتکار ہیں، بہت نیک اور محنتی ہیں۔ بھٹو نے ان کا سب کچھ چھین لیا تھا لیکن اپنی محنت سے دوبارہ انہوں نے بہت کچھ بنا لیا ہے۔ بھٹو دور ہی میں انہوں نے دوبارہ پانچ ملیں لگا لیں اور اپنا لوہا منوا لیا۔ ویسے بھی وہ لوہے کا کاروبار کرتے ہیں اور لوہے کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ میاں شریف نے ہندوؤں کو مات دیدی تھی مزدوری کرتے کرتے اپنے دوسرے 6 بھائیوں سے مل کر ان ہندوؤں سے جن کے پاس مزدوری کرتے تھے، ان کی بھٹی خرید لی۔ یہ 1937ء کی بات ہے جب کوئی مسلمان خال خال ہی تجارت میں تھا اور 1947ء تک اچھی خاصی تجارت بڑھا لی تھی۔ پاکستان بننے پر اور مواقع ملے،

قائداعظم کے کہنے پر تجارت اور صنعت کو عبادت سمجھ کر بڑھایا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ 1947ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں کوئی بنیادی صنعت یا تجارت موجود نہیں تھی۔ میاں شریف نے محنت مزدوری سے بھارت کے ٹاٹا کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور پھر ان کی کمپنی اتفاق برادرز واقعی ٹاٹا کے مقابلہ کی فرم بن گئی اور پاکستان کے امیر ترین 22 خاندانوں میں شمار ہوئی، جنہیں بھٹو نے نیشنلائز کیا۔ لیکن اس شخص نے پھر اپنے ہنر اور محنت کے بل بوتے پر خود بھٹو کے زمانہ میں دوبارہ پاؤں جمالئے۔ جنرل ضیاء الحق نے ان کی اتفاق فونڈری انہیں 1978ء میں واپس کر دی۔ اس وقت فونڈری گھاٹے میں چل رہی تھی جیسا کہ تمام سرکاری اداروں کا چلن ہے۔ میاں شریف نے وہ تمام نقصان بھی اپنے ذمہ لے لیا اور دوبارہ ایسے کام شروع کیا کہ وہی ٹوٹی ہوئی انڈسٹری اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی، بلکہ مزید ترقی کر گئی۔ یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس کا عزم فولادی ہے۔ یہ زندگی میں بہت ترقی کرنے والا شخص ہے۔ اب یہ سیاست میں آگیا ہے، یہ اچھی سیاست کرے گا، مگر اس کا ایک نقص ہے کہ یہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے۔ ان کا کاروبار وسیع ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ دولت اور کاروبار سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہیں لیکن سیاست بہت ظالم چیز ہے۔ لوگ اسے کبھی نہیں بخشیں گے۔ ان کے مخالف ان سے حسد کریں گے اور طرح طرح کے الزامات لگائیں گے اور لوگ ان الزامات کو سچ سمجھیں گے، کیونکہ ایک غربت زدہ ومحروم معاشرہ میں امیر ہونا ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ سردار غریب ہونا بھی ایک مصیبت ہے مگر ہمارے ایسے محروم معاشرے میں امیر ہونا اس سے بھی بڑھ کر مصیبت ہے۔ آپ میری بات پر حیران نہ ہوں، میری باتیں یاد رکھنا"۔

اسی نہج پر بریگیڈیئر صاحب نے اور بھی بہت سی باتیں کیں اور میں نہایت خاموشی سے سنتا رہا کہ تقاضائے ادب یہی تھا۔ نواز شریف نے تو میرا کام فوراً کر دیا تھا، مگر قیوم صاحب کا لیکچر دو گھنٹے چلتا رہا۔ میں نے مشکل سے جان چھڑائی اور واپس اپنے گھر چل دیا۔ راستے میں میں نے سوچا کہ میاں نواز شریف کتنا بھولا بھالا اور معصوم سا انسان ہے، دل کا کھرا انسان، کام میں بھی مستعد اور معاملہ فہم ہے۔ اس کے طور اطوار نیک ہیں۔ خدا کرے ایسے ہی لوگ ہماری سیاست میں آئیں اور پاکستان کی قسمت سنوار دیں۔ لیکن ابھی تو مارشل لاء نافذ ہے۔

مارشل لاء کے اندر سے سیاست کہاں برآمد ہوگی۔ بریگیڈیئر صاحب کی باتیں کچھ بے محل اور خواب وخیال نظر آنے لگیں۔ اس زمینی حقیقت کے باوجود میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ خدا کرے پاکستان میں سیاسی عمل دوبارہ شروع ہو جائے۔ یحییٰ خان اور ایوب خان کے مارشل لاؤں نے تو پاکستان ہی توڑ دیا تھا اور اب جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء موجودہ پاکستان کی روح کو توڑ کر اس کے معاشرہ کے اندر نفرت کا زہر پھیلا رہا ہے۔ سندھ پنجاب سے بدظن ہے تو سرحد و بلوچستان بھی غیر مطمئن ہیں۔ لسانی اور مسلکی جھگڑے الگ کھڑے ہیں اور یوں اس مارشل لائی مہم جوئی نے ہمارے معاشرہ کو ذرہ ذرہ کر کے رکھ دیا ہے۔ بریگیڈیئر قیوم کا فلسفہ اپنی جگہ، مگر جرنیلوں کے ملازم اور پروردہ سیاست دان کیا خاک بنیادی تبدیلی لا سکیں گے۔ سیاسی عمل بحال بھی ہو جائے تو کیا ہمارے سیاستدان مارشل لائی آلائشوں اور سوچوں سے اوپر اٹھ سکیں گے۔ پرانے سیاستدان فوج سے برسرپیکار ہیں، انہیں تو فوج کبھی نہیں آنے دے گی۔ تو کیا پھر سیاستدانوں کی کوئی نئی پود آئے گی؟

یہ سوچ کر میرے ذہن میں ایک بجلی سے کوندی اور مجھے صاف نظر آ گیا کہ آئندہ کی سیاست نئے سیاستدان ہی کریں گے۔ ان سیاستدانوں میں شاید نواز شریف بھی ہوگا۔ بریگیڈیئر قیوم کو شاید کچھ معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ آخر ایوب خان نے بھی یہی کچھ کیا تھا اور پاکستان بنانے والے سیاستدانوں کو ختم کر کے ایک نئی پود تخلیق کی تھی۔ اب جنرل ضیاء الحق بھی یہی کچھ کرنے والے ہیں۔ اس زمانے میں میں فیڈرل سکیورٹی سیل میں کام کرتا تھا جو ایک انٹیلی جنس ادارہ تھا اور جنرل ضیاء الحق کے لئے ہر طرح کی صورتحال کے تجزیئے کرتا تھا۔ میرے ساتھ بہت سے فوجی افسران بھی کام کرتے تھے۔ بریگیڈیئر ظفر اقبال اس ادارے کے سربراہ تھے۔ بریگیڈیئر صاحب کمال کے صاحب نظر تھے۔ پیشے سے تو وہ فوجی تھے، مگر دل کے صاف اور قومی امور میں قائداعظم کے پیروکار، مارشل لاء کو ناپسند کرتے تھے اور سیاسی عمل کو ملک وملت کے لئے اچھا سمجھتے تھے۔ میں نے سوچا بریگیڈیئر ظفر اقبال سے مستقبل کا سیاسی نقشہ ڈسکس کریں گے۔

اگلے روز میں نے جناب ظفر اقبال سے پوچھا کہ وہ ملک میں کیا سیاسی صورتحال دیکھ رہے ہیں؟ میں نے

دیکھا کہ بریگیڈیئر صاحب بہت پریشان ہیں، آہیں بھر کر کہنے لگے سندھ کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ میں نے ابھی ابھی وہاں کا دورہ کیا ہے۔ سارا صوبہ نفرت اگل رہا ہے۔ ایم آر ڈی کی تحریک وہاں بہت نکلی ہوئی ہے۔ اسلام اور فون وہاں نفرت کا نشان بن چکے ہیں۔ دہشت گردی زوروں پر ہے۔ سندھ کی تمام جیلیں توڑ دی گئی ہیں اور ڈاکو وہاں کے مقامی ہیرو بن گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اور مارشل لاء اب ایک بند گلی میں پہنچ گئے ہیں۔ اب کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔

''راستہ تو تلاش کرنا ہوگا، بریگیڈیئر صاحب'' میں نے عرض کیا۔

''کوئی راستہ نہیں ہے۔ سب اندھیرا ہے۔ یہ Fight to the Finish لگتی ہے۔ اللہ خیر کرے'' ظفر اقبال نے کہا۔

''نہیں بریگیڈیئر صاحب، راستہ ہے۔ نئے سیاستدان تلاش کریں جو تصادم کی بجائے تعاون کی راہ اپنائیں۔ اس طرح فوج بھی بچ جائے گی اور سیاست بھی۔ تصادم والوں کو بھی مارنے پیٹنے کی بجائے کوئی قابل قبول سیاسی راہ دکھائیں، وگرنہ بہت نقصان ہو جائے گا''۔

''ہاں چودھری صاحب کچھ سوچیں، وگرنہ بڑی تباہی ہو جائے گی'' یہ کہہ کر بریگیڈیئر ظفر اقبال نے ایک فائل نکالی اور مجھے تھما دی۔

اس فائل میں راجہ منور احمد کی طرف سے ارسال کی ہوئی ایک سکیم تھی، جس کے مطابق ملک میں غیر جماعتی انتخابات کروانے کو کہا گیا تھا۔ کیونکہ جنرل ضیاء الحق کی نامزدہ مجلس شوریٰ ناکام ہو چکی تھی۔ پیپلز پارٹی کا احتجاج زوروں پر تھا۔ لوکل باڈیز موجود تھیں، مگر سیاسی طوفان کو پوری طرح جذب نہیں کر پا رہی تھیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ لوگوں کی سیاسی تشفی کے لئے انہیں غیر جماعتی انتخابات میں الجھایا جائے۔ اس طرح عوام وخواص کی توانائی اس طرف مڑ جائے گی اور منظم سیاسی جماعتیں دیکھتی رہ جائیں گی۔ سیاسی جماعتوں کی تنظیم کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جائے گی اور وہ متوازی وعمودی خطوط پر بٹ کر رہ جائیں گی۔ جو جماعتیں بائیکاٹ کریں گی، وہ بھی موثر نہیں

رہیں گی، کیونکہ اس طرح لوگوں کے بہت سے مفادات سے ان کا ٹکراؤ ہو جائے گا۔ جہاں تک منتخب نمائندوں کے اندر نظم وضبط رکھنے کی بات ہے، بہتر ہے کہ تمام تر اختیارات خود صدر کے پاس رہیں۔ وہ ان انتخابات سے پہلے ایک ریفرنڈم کے ذریعے اپنے آپ کو مستقل صدر منتخب کروالیں۔ اسمبلی میں سے وزیر اعظم اور صوبائی اسمبلیوں میں سے وزرائے اعلیٰ کی نامزدگی کا اختیار بھی اپنے ہی پاس رکھیں۔ اس طرح اصل طاقت صدر کے ہاتھ میں رہتے ہوئے عامتہ الناس کا سیاسی غم وغصہ نیوٹرالائز ہو جائے گا۔ اس سکیم کو میں نے غور سے پڑھا، اس کے حسن وقباح کو پرکھا اور اس خراب صورتحال سے نکلنے کے لئے اس کے نقائص کے باوجود نہایت غنیمت سمجھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگر ایک دفعہ سیاسی عمل شروع ہو گیا تو پھر وہ اپنے لئے بہتر راستے خود بخود بناتا جائے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ستھرائی ہوتی جائے گی۔ ان خیالات اور جذبات کے اظہار کے ساتھ میں نے وہ فائل واپس بریگیڈیئر صاحب کو دیدی اور پھر ہم اسی سوچ پر مبنی سرگرمیاں جنرل ضیاء الحق کو بھیجتے رہے تاکہ جنرل صاحب کو سیاسی حل اپنانے کے لئے حوصلہ ملتا رہے۔ جیسے جیسے اس راہ پر معاملات چلنے شروع ہوئے، میاں نواز شریف کا چہرہ میرے سامنے آنے لگا۔ انہوں نے مجھ پر تاثر ہی کچھ ایسا چھوڑا تھا کہ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا اللہ کرے کہ میاں صاحب جیسے سیاستدان ہی آگے آئیں۔ اور پھر ریفرنڈم ہوا اور بعد میں غیر جماعتی انتخابات کا اعلان بھی ہو گیا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔

سیاسی سفر

میاں نواز شریف گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی کی کابینہ میں ایک نامزد وزیر تھے۔ عہدہ سیاسی تھا مگر وہ سیاسی راستے سے اس عہدہ پر نہیں پہنچے تھے۔ انہیں سیاست کی راہ پہلی دفعہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات نے دکھائی۔ سیاست ان کے خاندان میں کبھی تھی ہی نہیں۔ ان کے والد تو ایک سیدھے سادھے کاروباری شخص ہیں، جنہوں نے سب کچھ اپنی محنت سے کمایا تھا۔ ان کے چچا صاحبان اور دوسرے رشتہ دار بھی سیاست کے قریب نہیں پھٹکے تھے۔ میاں نواز شریف خاندان کے پہلے فرد تھے جو وزیر نامزد ہو کر اس گرد آلود راہ پر آ نکلے۔ سنا ہے طالب علمی کے دوران بھی وہ طلبہ کی سیاست سے دور ہی رہتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب ان کی انڈسٹری کو 1972ء میں نیشنلائز کر دیا تو ضرور نوجوان نواز شریف نے ایک گہری تڑپ محسوس کی تھی اور وہ بھٹو اور اس کی سوچ کے سخت خلاف ہو گئے اور بھٹو مخالف سیاستدانوں سے میل ملاپ بڑھا لیا۔ لیکن پھر بھی سیاست میں کوئی زیادہ فعال یا عملی حصہ نہیں لیا۔ وہ ایئر مارشل (ر) اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال میں ضرور شامل رہے، مگر زیادہ تک بیک

گراؤنڈ کے ہی کھلاڑی رہے۔ 1977ء میں بھٹو کا تختہ الٹ جانے پر ان کے والد جنرل ضیاء الحق کے مداح ہو گئے کیونکہ دونوں میں بھٹو مخالفت قدر مشترک تھا اور جب جنرل غلام جیلانی پنجاب کے گورنر بنے تو ان کی نظر انتخاب نوجوان نواز شریف پر پڑی اور یوں اور سیاست کے دشت میں آ گھسے لیکن ان کے لئے اصل سیاسی میدان 1985ء کے الیکشن ہی میں سجا۔

1985ء کے غیر جماعتی انتخابات پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم آر ڈی میں اس کی ساتھی جماعتوں نے ان کا مکمل بائیکاٹ کر دیا، مگر عوام نے ان انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی کا خیال تھا کہ ریفرنڈم کی طرح لوگ اس غیر جماعتی انتخاب میں بھی حصہ نہیں لیں گے لیکن یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی۔ ریفرنڈم میں تو صرف جنرل ضیاء الحق کی صدارت کا مسئلہ تھا، لہٰذا لوگ گھروں سے باہر ہی نہیں نکلے، مگر یہاں تو باقاعدہ امیدوار تھے جن کا مقامی اور ذاتی اثر و رسوخ تھا۔ اس لئے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور پھر یہ کہ امیدواروں نے اس کام پر دل کھول کر پیسہ لگایا۔ عوام کو اور کیا چاہئے تھا۔ کھانا پینا اور رونق میلہ۔ ویسے بھی الیکشن ہوئے بہت مدت ہو گئی تھی۔ لوگ مارشل لاء سے خوفزدہ ہی نہیں، بور بھی تھے، لہٰذا جنرل ضیاء الحق کا یہ غیر جماعتی سیاسی کھیل کامیاب رہا۔ میاں نواز شریف نے بھی لاہور کے ایک حلقہ انتخاب سے صوبائی اور قومی اسمبلی کے لئے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا اور اپنے حلقہ انتخاب میں سب سے زیادہ اور دلکش بینرز لگائے جو مناسب وقفہ کے بعد بدل دیئے جاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ کام انہوں نے باقاعدہ ایک فرم کو ٹھیکہ پر دیا تھا۔ بینرز اور سٹکرز پر مناسب الفاظ اور نعروں کی عبارت کے لئے بہت عمدہ دماغوں کو کثیر مشاہرہ پر ملازم رکھا اور یوں ایک نہایت ہی سائنٹفک طریقہ سے الیکشن کا اہتمام کیا اور خود گھر گھر جانے لگے۔ جس علاقہ سے یہ الیکشن لڑ رہے تھے وہاں ان کی کشمیری برادری اور آرائیں برادری کی اکثریت تھی۔ میاں محمد اظہر ان کے ساتھ تھے جو آرائیں برادری کے سرخیل تھے۔ یہ خود ایک امیر آدمی تھے اور ساتھی بھی امراء ہی میں سے تھے۔ ساتھ ساتھ برادری کا بھی خوب گٹھ جوڑ بن گیا تھا۔ اس علاقہ میں میری گوجر برادری کے بھی بہت زیادہ ووٹ تھے اور میری رشتہ

داری آرائیوں کے ساتھ بھی تھی کیونکہ میری اہلیہ اسی برادری سے تھیں۔ معلوم ہوا میاں نواز شریف اپنے حلقہ میں بہت پاپولر جا رہے ہیں اور عام تاثر ابھرا کہ ان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا اور ان کی جیت یقینی ہے۔ ایسی باتیں الیکشن جیتنے کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ تاثر دینے کے لئے بھی میاں صاحب نے ایک ٹیم تشکیل دے رکھی ہے جو تھڑوں، حماموں اور دکانوں وغیرہ پر بیٹھ کر ایسی معصومانہ اور پرتاثیر باتیں کرتی رہتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ میاں کی جیت تو بس یقینی ہے۔ مجھے میاں صاحب چونکہ پہلی ہی ملاقات میں بھا گئے تھے، اس لئے میں انہیں ملنے گیا۔ اس وقت تو وہ گھر پر نہیں تھے مگر بعد میں ٹیلی فون پر بات ہوئی تو آنے کا مدعا پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ ویسے ہی ملنے آیا تھا۔ پوچھوں الیکشن کیسے چل رہے ہیں۔ میں ان کی یادداشت سے بہت متاثر ہوا کیونکہ انہیں ہماری پہلی ملاقات کی تمام تفاصیل یاد تھیں۔ یہاں تک کہ میاں ریاض الحق کا نام بھی یاد تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے حلقہ میں میرے بھی بہت سے جاننے والے ہیں، حکم کریں تو میں بھی اس سلسلہ میں کچھ کروں۔

''ہاں! ضرور، نیکی اور پوچھ پوچھ'' میاں صاحب نے کہا، پھر یکدم کہتے ہیں کہ آپ تو سرکاری ملازم ہیں۔ آپ یہ کام کیسے کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کام میں ذاتی حیثیت میں کروں گا۔ یہاں میری برادری اور رشتہ داریاں ہیں اور میں لاہور میں تعینات بھی نہیں ہوں۔

''ہاں ذاتی حیثیت میں ضرور کریں۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا''

میاں نواز شریف سے یہ میری دوسری نیم ملاقات تھی جو ٹیلی فون پر ہوئی۔ اس دوران مجھے پتہ چلا کہ یہ وہی میاں شریف ہیں، جن کا کاروبار سرائے سلطان میں ہوا کرتا تھا۔ ہوا یوں کہ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور کا پچاس کے عشرہ میں طالبعلم تھا، تو میں اکثر شیخ محمد افضل صاحب سے، جن کا کاروبار بانساں والے بازار میں تھا، ملنے جایا کرتا تھا۔ ان کا تعلق ہوشیار پور سے تھا اور میں بھی وہیں سے تھا۔ وہاں بہت سے لوگ آتے تھے اور اکثر و بیشتر میاں شریف کی ایمانداری اور صحیح تول کی بہت تعریف کرتے تھے۔ شاید یہ لوگ اس وقت سریا اور گارڈر بیچا

کرتے تھے اور اس کاروبار میں کم تولنا عام تھا، مگر میاں شریف سختی سے صحیح ناپ تول کے پابند تھے اور کاروباری ادائیگیوں میں بھی بہت باقاعدگی تھی۔ اس لئے ان کی مارکیٹ میں بہت اچھی ساکھ تھی۔ یہ بات یاد کر کے مجھے اور بھی زیادہ اطمینان ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے کردار کے لوگوں کو سیاست کی طرف دھکیل دیا ہے اور اس طرح میرے جذبات میاں صاحب کی طرف اور بھی بہتر ہو گئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کا ایک بہت ہی عمدہ تصور بنا لیا اور دعا کی کہ اللہ انہیں کامیاب کرے۔ لوگ تو ویسے ہی ان کے خاندان کی شرافت کی وجہ سے ساتھ تھے۔ ہماری دعا بھی شامل ہو گئی اور یہ زبردست کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ لوگوں نے دل کھول کر انہیں ووٹ دیئے اور وہ دونوں سیٹوں سے کامیاب رہے۔ ان کے 63000 ووٹ تھے اور ان کے نزدیک ترین حریف کے صرف چھ ہزار ووٹ تھے۔ بات آئی گئی ہو گئی، میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا، میاں صاحب کو مبارک باد بھی نہ دے سکا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نامزد ہو گئے۔ اب مجھے افسوس ہوا کہ میں نے انہیں مبارک باد کیوں نہ دی اور میں ذرا جھینپ سا گیا۔ میاں صاحب کی کامیابی کی میں نے ضرور دعا کی مگر میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس اعلیٰ منصب کے لئے چن لئے جائیں گے۔ مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ اپنی سستی اور نالائقی پر ندامت بھی ہونے لگی۔ اب میں خواہاں تھا کہ میں واپس صوبہ پنجاب میں جا کر کسی ڈویژن میں دو سال کے لئے ڈی آئی جی پولیس تعینات ہو کر آئی جی پولیس کی پوسٹ کے لئے کوالیفائی کر سکوں اور یہ اختیار اب اللہ نے میاں نواز شریف کو سونپ دیا تھا۔ اب مجھے انہیں براہ راست ملنے میں حجاب ہو رہا تھا، لہٰذا میں ایک بار پھر بریگیڈیئر قیوم کے پاس گیا اور مدعا بیان کیا۔ ان کی وساطت سے میرا تبادلہ صوبہ پنجاب میں ہو گیا۔ میاں صاحب کو میں پوری طرح یاد تھا اور انہوں نے بلا تاخیر یہ کام کر دیا اگلے ہی دن میں ان کے سیکرٹری مہر جیون خان کے پاس پہنچ گیا۔ میاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور میری درخواست کے بغیر ہی مہر صاحب سے کہنے لگے کہ انہیں کسی رینج میں لگانا ہے۔ ظاہر ہے میں بہت خوش ہوا اور واپس گھر آ گیا۔ شاید اس وقت جولائی کا مہینہ تھا۔

میں نے دو ہفتے تو انتظار کیا۔ جب کوئی خبر نہیں آئی تو میں نے پھر مہر جیون خان سے رابطہ کیا۔ کہتے ہیں

ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ ایک اور ہفتہ گزر گیا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں مہر صاحب سے ملنے چلا گیا۔ مہر جیون خان ایک بہت ہی صاف گو اور کھرے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ پہلے تو میاں صاحب آپ کے لئے بہت متردد تھے، اب خاموش ہیں۔ درمیان میں کچھ گڑبڑ ضروری ہوئی ہے۔ اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میاں صاحب سے ملنا حاصل تھا۔ میں نے آئی جی پنجاب سے بات کی تو وہاں سے بھی کوئی خاص حوصلہ افزاء جواب نہ ملا۔ اب مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ایک دو دفعہ بریگیڈیئر قیوم سے ملاقات کی کوشش کی تو وہ بھی ٹرخا گئے۔ میں حیران تھا کہ کیا ہو گیا کہ اتنے میں مجھے حکم ملا کہ میں راولپنڈی جا کر ڈھوک کھبہ کیس کی تفتیش کروں۔ یہ ایک سنسنی خیز قتل تھا، جس میں ایک ہی خاندان کے 9 افراد قتل کر دیئے گئے تھے اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔ تمام اخبارات اسے دہشت گردی کی واردات گردان رہے تھے۔ میں اس طرح کے کام کے لئے تو پنجاب نہیں آیا تھا اور پھر میاں صاحب نے اتنی محبت سے بلایا تھا۔ عجیب بات تھی بہر صورت حکم ملتے ہی راولپنڈی چلا گیا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات تھی۔

راولپنڈی میں اس مقدمہ کی تفتیش کے دوران دو تین دفعہ میاں صاحب سے بات ہوئی۔ وہ صرف تفتیش کا پوچھتے اور میری پوسٹنگ کی بات تک نہ کرتے۔ اب مجھے بہت غصہ آنے لگا کہ یہ خوب انسان ہیں۔ میں نے کچھ سوچا تھا اور یہ کچھ اور ہی طرح کے نکلے۔ اتنے میں عباس خان جو میرے جونیئر تھے، وہ سرحد کے آئی جی پولیس بن گئے اور میں ابھی رینج پوسٹنگ ہی کی تلاش میں تھا۔ خیر وقت گزرتا گیا، کہیں نومبر کے مہینے میں میری ملاقات ہو سکی اور وہ بھی ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی منت سماجت کے بعد۔ ملتے ہی کہتے ہیں:۔

"مجھے معلوم ہے آپ کا مسئلہ کیا ہے، آپ فکر نہ کریں کچھ کریں گے"۔

میں نے کہا کہ جناب وقت گزر رہا ہے۔ میرا جونیئر بھی آئی جی بن گیا ہے۔ مجھے تو ابھی کوالیفائی کرنا ہے۔

اس پر وہ کچھ فکر مند سے نظر آئے۔ اسوقت ان کے چہرے پر قدرے خفت تھی، وہ فرمانے لگے: "اصل میں بات یہ ہے کہ میں تو آپ کو پوسٹ کرنا چاہتا ہوں مگر گورنر جیلانی صاحب نہیں مان رہے۔ سب لوگ آپ کے

کام کی تعریف کرتے ہیں، مگر گورنر صاحب پتہ نہیں آپ کے خلاف کیوں ہیں۔ میں آپ کو پوسٹ کر سکتا ہوں مگر میں نے گورنر سے پوچھ لیا ہے۔ مجھے پوچھنا نہیں چاہئے تھا۔ اب تھوڑا سا انتظار کریں۔ آپ بریگیڈیئر قیوم سے کیوں بات نہیں کرتے۔ وہ گورنر صاحب کے بہت قریب ہیں"۔

اب میں پریشان ہو گیا مگر میرے منہ سے معاً نکلا کہ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔ میں تو آپ کی وجہ سے پنجاب آیا تھا۔ اگر گورنر صاحب کو اعتراض ہے تو آپ مجھے واپس مرکزی حکومت میں بھیج دیں۔ میں کسی کی منت کیوں کروں۔

"نہیں! آپ پریشان نہ ہوں، کچھ نہ کچھ ضرور کر لیں گے۔ تھوڑا انتظار کریں"۔ میاں صاحب نے کہا۔

"جناب گورنر صاحب آپ کے محسن ہیں۔ انہوں نے آپ کو چیف منسٹر نامزد کیا ہے۔ آپ ان کی مرضی کے خلاف بالکل کوئی کام نہ کریں۔ میرا اللہ مالک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ پر کوئی حرف آئے۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت مانگی۔

میاں صاحب نے کہا "آپ فکر نہ کریں میں ضرور کوئی راستہ نکال لوں گا"۔ میں نے اصرار کیا کہ "آپ مجھے واپس کر دیں"۔

کہتے ہیں "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اب آپ کو بلایا ہے تو کچھ کریں گے، یہ میرا اخلاقی فرض ہے۔ اب میں کس منہ سے آپ کو واپس کر سکتا ہوں"۔

میں نے اجازت لی تو بہت ہی تپاک سے گلے لگا لیا اور کہا: "ذرا انتظار کرو، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

یہ سن کر میں ایک عجیب و غریب کیفیت میں واپس لوٹا۔ میں ان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ سوچتا رہا کہ یہ شخص قول کا کتنا پکا ہے اور اسے اخلاقی قدروں کا کتنا خیال ہے۔ اس سے پہلے میں نے یہ باتیں کسی حکمران میں نہیں دیکھی تھیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی تو لغت اور ہوتی ہے جس میں مروت، حیا اور اخلاق قسم کی کوئی چیز عام طور پر

موجود نہیں ہوتی، لیکن یہ شخص تو کچھ دکھری ہی قسم کا ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ایک بات نبھانے کے لئے اپنے اتنے بڑے محسن کو خفا کرے۔ وہ مجھے صاف جواب دے سکتا تھا۔ کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔ اسے گورنر والی بات بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ میاں نواز شریف جھوٹ نہیں بول سکتا اور اس وجہ سے لوگ اسے سادہ لوح بھی کہتے ہیں اور سیاست میں اس کی ناکامی کی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ آج یہ بات میرے سامنے تھی مگر میں نے اس سے وہ نتیجہ نہیں نکالا جو لوگ نکال رہے تھے۔ میں نے راست گوئی کو راہ فلاح سمجھا اور میرے دل میں ان کی قدر مزید بڑھ گئی۔ دل ہی دل میں سوچا یہ شخص بہت زیادہ عزت پائے گا۔

31 دسمبر 1985ء کو ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور گورنر جیلانی کی جگہ مخدوم سجاد حسین قریشی پنجاب کے گورنر تعینات ہو گئے۔ فروری 1986ء میں مجھے ڈی آئی جی سرگودھا کی تعیناتی کے احکامات مل گئے۔ نواز شریف نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔

اگلے دن میں ہدایات کے لئے حاضر ہوا تو فرماتے ہیں: ''آپ سمجھدار آدمی ہیں، آپ کا تجربہ بہت ہے۔ علاقے میں انصاف کریں اور پولیس والوں کو کسی پر ظلم نہ کرنے دیں''۔

''کوئی سیاسی ہدایت''۔ میں نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں، سرگودھا سیاسی طور پر ذرا Sensitive ہے۔ سب کی عزت نفس کا دھیان رکھیں، مگر بے انصافی نہ ہونے پائے'' اور میں سرگودھا سدھار گیا۔

سرگودھا تعیناتی کے دوران محترمہ بینظیر بھٹو کا معروف زمانہ پاکستان واپسی کا سفر وقوع پذیر ہوا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنرل ضیاء الحق کی سختیوں سے تنگ آ کر بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے ہزاروں ورکر بیرون ملک پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بے نظیر لندن میں تھیں تو اجمل خٹک کابل میں جلاوطن تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اور ایئر مارشل اصغر خان جیسے لوگ اپنے اپنے گھروں میں نظر بند تھے۔ کوئی سیاسی آدمی ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں نہیں جا سکتا تھا اور یہ مذاق عام تھا کہ سندھ سے پنجاب سفر کرنے کے لئے جنرل ضیاء الحق سے ویزا کی ضرورت تھی۔

سندھ کے لوگ فوجی مظالم سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ کوئی ٹرین، لاری یا سواری وہاں کی شاہراہوں سے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر سکتی تھی۔ انسان انسان کا دیری بنا ہوا تھا۔ اس پس منظر میں بے نظیر بھٹو واپس آ رہی تھیں کہ دیکھئے پاکستان کے اندر جنرل زدہ جمہوریت کس طرح کا سلوک کرتی ہے۔ بینظیر بھٹو نے اپنی واپسی لاہور رکھی۔ اب یہ نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب اور محمد خان جونیجو وزیر اعظم پاکستان کے جمہوری اعصاب کا امتحان تھا۔ فیصلہ ہوا کہ بے نظیر بھٹو کی آمد پر کوئی غیر معمولی اقدامات نہ کئے جائیں۔ جلسے جلوسوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے کیونکہ یہ اس کا جمہوری حق ہے۔ انتظامیہ کے بہت سے بزرجمہروں اور جرنیلوں نے اس فیصلہ پر بہت زیادہ ناک بھوں چڑھائے اور اسے نواز شریف کی ناتجربہ کاری پر محمول کیا۔ مگر نواز شریف کا فیصلہ بہت زیادہ صائب رہا۔ بینظیر آئیں اور لاکھوں افراد نے ان کا استقبال کیا مگر جمہوری عمل کی وجہ سے ذرا بھر گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اس دوران وہ سرگودھا بھی آئیں اور ہم نے ان کے ساتھ وہی شریفانہ سلوک کیا۔ پیر ناظم شاہ اور جہانگیر بدر ایک حیرانی کے عالم میں میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ اس سلوک پر بے نظیر ہی نہیں سب لوگ حیران تھے۔ یہ نواز شریف کی فراست کا پہلا امتحان تھا اور وہ اس میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ یہ وہ معاملہ ہے جہاں سے نواز شریف کے خلاف حسد اور رقابت نے عجیب عجیب جگہوں پر جڑ پکڑی۔ یہاں تک کہ جنرل ضیاء الحق جنہوں نے نواز شریف کو بوجوہ نامزد کیا تھا، ان کے ذہن کو بھی نواز شریف کے خلاف کر دیا اور پروپیگنڈہ شروع ہو گیا کہ نواز شریف تو بے نظیر کے ساتھ مل گیا ہے۔ نواز شریف نے جہانگیر بدر کو ایک سینما مالک کے ذریعے بھاری رشوت دیدی ہے۔ نواز شریف کی بے نظیر سے قتل کی کوئی دشمنی نہیں ہے جبکہ ضیاء الحق نے اس کے باپ کو پھانسی پر چڑھایا تھا۔ الذوالفقار جس کے کرتا دھرتا مرتضیٰ بھٹو تھے، نے چودھری ظہور الٰہی کو قتل کر رکھا ہے۔ اصل ویر تو کہیں اور ہے اور یہ نواز شریف اپنی ہی سیاست بازی کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح سے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور زمیندارہ کلاس جو اپنی الگ سوچ رکھتی ہے، نواز شریف کے خلاف ہونا شروع ہو گئی، حالانکہ نواز شریف نے ایک اچھی روایت قائم کی تھی۔ اس وقت کے ڈی آئی جی میاں محمد اسلم حیات جو ایک نہایت ہی شریف اور بھلے مانس انسان ہیں، نے خود مجھ سے کہا کہ سنا

ہے کہ تمہارے چیف منسٹر نے جہانگیر بدر کو پیسے چڑھا دیئے ہیں اور اندرون خانہ بے نظیر سے صلح کر لی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بالکل غلط بات ہے اور لوگ بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ نواز شریف کیا ان کا تو پورا خاندان بھٹو مخالف ہے کہ اس نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا..... جواب آیا کہ کچھ پتہ نہیں، یہ کاروباری لوگ وقت آنے پر سب کچھ کر جاتے ہیں۔ میاں اسلم حیات جیسے ثقہ آدمی سے یہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ مگر یہ ایک خاص سوچ کا عکس تھا جو ان کے ذریعے ظاہر ہو رہا تھا اور میرا ماتھا ٹھنکا کہ وہ تو محمد خان جونیجو کے نفس ناطقہ ہیں۔ معلوم ہوا وسوسے کچھ زیادہ ہی گہرے ہیں اور اونچے محلات میں بازگشت کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ میاں اسلم حیات جنرل ضیاء الحق کے بھی خلاف تھے۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ معاملات پیچیدہ ہو رہے ہیں، حالانکہ یہ سارا معاملہ ایک صحیح فیصلے اور عمل پر مبنی ہے۔ معلوم ہوا میاں نواز شریف ہماری پرانی ڈگر کی سیاستی ہیرا پھیری پر پورے نہیں اتر رہے۔ وہاں تو کسی خوفناک خونخوار شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ظلم کرے، جلسے جلوس نہ کرنے دے اور سب کو اپنے جوتے کی نوک پر نچا کر ایک مضبوط منتظم کہلوائے۔ اسے کہتے ہیں کہ روزے بخشوانے گئے تھے کہ نمازیں گلے پڑ گئیں۔ خیر یہ دنیا کی ریت ہے کہ اکثر اچھائی اچھا نہیں لگتی اور اس کے اندر طرح طرح کے معانی ڈھونڈے جاتے ہیں۔

میری سرگودھا تعیناتی بہت مختصر رہی۔ اس دوران میاں نواز شریف یا ان کے کسی وزیر نے میرے کام میں دخل اندازی نہیں کی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایم پی اے اور ایم این اے بہت زیادہ تنگ کرتے ہیں اور اپنی مرضی کے تھانیدار وغیرہ لگواتے ہیں، مگر مجھے کبھی کسی نے ایسی سفارش نہیں کی۔ سب لوگ مجھے ملتے تھے اور سفارش وشکایت بھی کرتے تھے، مگر اس میں کوئی ناگوار پہلو نہیں ہوتا تھا۔ سرگودھا میں قریشی اور ملک برادری کی بہت زیادہ پارٹی بازی تھی مگر دونوں طرف سے کوئی ناجائز سفارش کبھی نہ آئی۔ میں حیران تھا کہ لوگ کیوں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ معلوم ہوا کہ بیوروکریسی کا یہ ایک طریقہ واردات تھا کہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی ناجوازیوں اور رشوت خوریوں کو سیاسی لوگوں کے دامن پر دھبے کے طور پر

اجاگر کردے۔ ہمارے ہاں اصل میں سیاست کی حریف ہماری بیوروکریسی ہے اور وہ سیاست کو بدنام کرنے کا ہر طریقہ استعمال کرتی ہے۔ اسے کہتے ہیں بندر کی بلا طویلے کے سر۔

سرگودھا میں مجھے ایک عجیب شخص ملا۔ اس کا نام بابو قطب الدین تھا۔ وہ ہوشیار پور کا مہاجر تھا اور میرا بھی وہیں سے تعلق ہے۔ وہ میری برادری کا بھی تھا لہٰذا وہ میرے قریب ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر 80 سال سے زائد تھی مگر صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔ معلوم ہوا کہ حضرت کو علم نجوم سے شغف ہے۔ فرماتے ہیں کہ آپ سرگودھا میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ آپ جلد تبدیل ہو جائیں گے۔ میں نے کہا مجھے دو سال کی شرط پوری کرنی ہے۔ بابو جی ایسا نہ کہیں۔ کہتے ہیں میرا علم تو یہی کہتا ہے۔ آپ انشاء اللہ بہتر جگہ بلکہ ترقی پر جائیں گے۔ مجھے یہ بات کچھ انہونی سی لگی۔ ایک دن صبح صبح آ دھمکے۔ کہتے ہیں میرے حساب میں آپ کو آج یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ آپ تو یہیں ہیں۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا کہ بابو جی آپ کا علم نجوم فیل ہو گیا ہے۔ میں ویسے بھی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی شام مجھے حکم ملا کہ فوراً لاہور پہنچ کر ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ کا چارج سنبھالیں۔ بابو قطب الدین ابھی میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں لاہور کی طرف سفر کر رہا تھا۔

تاج سے کھاج

حسب الحکم میں نے لاہور پہنچ کر فوراً سپیشل برانچ کے سربراہ کے طور پر چارج لے لیا۔ محکمہ پولیس کی یہ خاص برانچ خاص باتوں پر نگاہ رکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ میں نے اس شعبے میں پہلے بھی کافی کام کر رکھا تھا۔ پولیس کا یہ شعبہ منظم جرائم، دہشت گردی، تخریب کاری، معاشرہ میں گروہی رجحانات، سیاسی امور، ملکی اختلافات، طلبہ کے معاملات اور مزدوروں کے قضیئے وغیرہ پر نگاہ رکھتا ہے۔ یعنی امن عامہ کے سلسلہ میں یہ شعبہ حکومت کے آنکھ اور کان کا کام دیتا ہے۔ صوبائی حکومت کی ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری امن وعدل کا قیام ہے اور اس سلسلہ میں سپیشل برانچ کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، اس لئے سپیشل برانچ کے سربراہ اور صوبہ کے منتظم اعلیٰ، یعنی وزیر اعلیٰ کا بہت قریبی تعلق ہوتا ہے۔ یوں مجھے میاں نواز شریف کو بہت ہی زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس نازک محکمہ کا چارج لے کر میں ہدایات لینے میاں صاحب کے پاس پہنچا تو کہتے ہیں ''آپ دن میں کم از کم چار دفعہ مجھے فون پر پورے صوبے کی صورتحال بتایا کریں۔ علاوہ ازیں آپ آئی جی، ہوم سیکرٹری اور چیف سیکرٹری کو بھی مطلع رکھا کریں۔'' یہ بات مجھے بہت غیر ضروری محسوس ہوئی، مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ خاص معاملات جو ان کے قریب بہت زیادہ ضروری ہوں، جن کی خبر گیری رکھی جائے وہ تھے حزب اختلاف، خاص طور پر

پیپلز پارٹی کی Aciivity۔ طلبہ اور مزدوروں کے احوال و پروگرام، سرکاری ملازموں کی حرکات و سکنات اور خود ان کی جماعت کے ایم این ایز اور ایم پی ایز کی خبر گیری۔ اس وقت تک تقاضائے حالات غیر جماعتی انتخابات سے معرض وجود میں آنے والی اسمبلیوں کے اراکین کو جماعتی شکل دی جا چکی تھی اور سرکاری جماعت کا نام پاکستان مسلم لیگ رکھ دیا گیا تھا۔ سوائے چند ایک کے تمام ممبران اسی جماعت سے منسلک ہو گئے تھے کہ اسی لئے تو وہ آئے تھے۔ یہ جماعت کسی اصول پر مرتب نہیں ہوئی تھی بلکہ مفادات کی لڑی میں پروئی گئی تھی، کیونکہ وہ کسی سیاسی جدوجہد کے نتیجہ میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ممبران جنرل ضیاء الحق کی بی ٹیم کے طور پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنے اپنے زور پر ابھرے تھے۔ اس لئے اس جماعت کا کوئی نظم تھا اور نہ ہی کوئی روایت۔ اس کے ممبران کا ایک ہی مقصد تھا کہ اپنے اپنے کام اپنی اپنی مرضی کے مطابق نکلوائے جائیں اور اپنے علاقے میں اپنے آپ کو مضبوط سے مضبوط تر کریں۔ یہ ایک بھان متی، کا کنبہ تھا جس کا کوئی قبلہ تھا نہ مسلمہ قائد۔ بس یونہی اینٹ روڑے اکٹھے کر دیئے گئے تھے اور صوبہ کی حد تک اس کی راہبری یا سرورودی میاں نواز شریف کی ذمہ داری تھی، اس لئے میاں صاحب کے انٹیلی جنس چیف کی حیثیت سے میرا اس پر نظر رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ اصل میں ایک فوجی ڈکٹیٹر نے اپنی گردن بچانے کے لئے یہ ڈھکوسلہ گھڑا تھا کہ معاشرہ کے مقتدر لوگ اپنے اپنے جھنجھٹ میں پھنسے رہیں اور اسے کچھ نہ کہیں۔ بوجہ ملازمت سرکار کہ "نوکر ہے تو ناچا کر" کے مصداق مجبوراً میں نے خود بھی اس ناقص نظام کی آبیاری کی تھی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اب مجھے اس سسٹم کے قبیح نتائج دیکھنے کا خوب موقع مل رہا تھا اور اس قباحت کی صدارت میاں نواز شریف کر رہے تھے۔ اس ماحول میں ان کی پارٹی کے چہیتے کبھی کوئی نامعقول مطالبہ لے کر آ جاتے اور کبھی کوئی، میاں نواز شریف ان سب کو خندہ پیشانی سے ملتے۔ کبھی کام کرتے، کبھی ٹرخاتے، کبھی ملتوی کرتے اور اکثر و بیشتر فیلڈ انتظامیہ کو زیر بار کرتے مگر صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ جب بھی تنہا ہوتے تو بہت زیادہ کڑھتے رہتے۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہتے تھے مگر نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں بعض ناجوازیاں اپنے ممبران کے لئے کرنا پڑتی تھیں۔ وہ خود اپنے لئے کوئی غلط کام

نہیں کرتے تھے مگر اس ناقص سیاسی نظام کو آگے بڑھانے کے لئے وہ ممبران کے نخرے سہتے تھے۔ اس لئے مجھے حکم ملا کہ میں ان کے اپنے ممبران پر نگاہ رکھوں۔ ان کی اپنی جماعت کے اراکین ان کی حمایت میں بھی تھے اور حزب اختلاف بھی وہی تھے۔ یہ ایک عجیب صورت تھی اور لوگ توقع کر رہے تھے ایک مثالی جمہوری انداز و روایات کی کہ ہمارا معاشرہ راتوں رات انگلستان اور امریکہ بن جائے۔ یوں توقعات اور زمینی حقائق میں بہت بعد تھا۔ اب جرنیل پس منظر میں چلے گئے تھے اور میاں نواز شریف جیسے لوگوں کو عوامی غم و غصہ سہنے کے لئے سامنے لے آئے تھے۔ اب ان کے لئے ہونے یا نہ ہونے یعنی To be or not to be کا معاملہ بن گیا تھا۔ اسے کہتے ہیں گلے پڑے ڈھول کو بجانا، بجائیں تو خواری نہ بجائیں تو بربادی۔

حکمرانی کی اس نازک شاخ پر بیٹھے میاں صاحب کے لئے اصل مسئلہ اسمبلیوں سے باہر تھا، کیونکہ پیپلز پارٹی گلی کوچوں میں زوروں پر تھی اور اس نظم کو جعلی قرار دے رہی تھی۔ ہر وقت جلسے، جلوسوں پر زور تھا اور طرح طرح کی طعنہ بازیاں ہو رہی تھیں۔ اب مارشل لاء کی چھتری موجود نہیں تھی اور سرکاری جماعت منتشر تھی، لہٰذا یہ ان کی سیاسی و ذاتی بصیرت کا امتحان تھا کہ وہ معاملات کو کیسے سنبھالتے ہیں۔ ایک ایک قدم انہیں سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ دانشور طبقہ اس سارے نظام کے خلاف تھا اور اسے ایک مذاق سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی پڑھا لکھا طبقہ انگلستان اور امریکہ کو پیمانہ بناتا ہے تو دایاں بازو چودہ صدیوں پیچھے راہوں کا متلاشی رہتا ہے اور یوں سب لوگ حقیقتوں سے منہ چھپائے سایوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ کسی کو کسی طرح بھی تسکین نہیں ہوتی اور ہر طرف شکایتوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔ کوئی شخص مشکلات اور حدود و قیود کی رعایت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا اور جو بھی حکمران ہو اس سے معجزے کی توقع رکھتا ہے۔ بے چارے میاں صاحب کو میں نے اس مشکل میں پھنسا دیکھا۔ وہ کوئی افلاطون تو تھے نہیں۔ گوشت پوست کے عام انسان ہیں، ٹیڑھی راہوں پر چلنے کے لئے ایک عام بھولا بھالا انسان۔ میں نے دیکھا کہ تفکر نے انہیں کافی مضمحل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایک سال کے اندر اندر ذمہ داری نے ان کے سب کس بل نکال دیئے تھے لیکن انہوں نے ہمت نہیں

ہاری۔

اس پس منظر میں ان کا خبردار رہنے کا تقاضا سمجھ آ رہا تھا مگر میں نے اسے ایک اور زاویئے سے دیکھا۔ زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی کے لئے انفارمیشن کے ساتھ ساتھ اعتماد کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ خبر گیری انسان کو وہم کا شکار کر دیتی ہے اور اچھا بھلا انسان خبطی ہو کر اپنے اندر کی خوبصورتی کھو دیتا ہے۔ انتہائی خبر گیری کا لپکا بدترین وسوسوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لہٰذا کچھ عرصے بعد موقع پا کر میں نے میاں صاحب سے اس موضوع پر تفصیل سے بات کی اور عرض کیا کہ جب بھی کوئی اہم بات ہوگی میں خود ان سے رابطہ کر لیا کروں گا تاکہ وہ ضروری ہدایات دے سکیں۔ یہ بلاوجہ دن میں چار بار کا چکر مجھے اور آپکو پریشان کرتا رہے گا اور نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ میں نے بتایا کہ اطلاعات کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ آپ کے مطالعے کی اطلاعات بہت کم مگر بہت اہم ہی ہو سکتی ہے۔ ہر قسم کی اطلاع سے کنفیوژن ہی ہوگا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی مگر پھر کہنے لگے کہ "جنرل جیلانی تو کہتے ہیں کہ چیف ایگزیکٹو کو پل پل کی خبر رہنی چاہئے۔" تب میں سمجھا کہ ان کے ذہن پر جنرل جیلانی چھائے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جناب والا مارشل لاء کا قصہ اور ہوتا ہے۔ وہ تو خوف سے لوگوں کو قابو رکھتے ہیں۔ آپ کا ہتھیار خوف نہیں، لوگوں کی چاہت ہے، آپ کا سرمایہ لوگوں کا اعتماد ہے، باخبر ضرور رہیں مگر اتنا جتنا ضروری ہو۔ غیر ضروری جاسوسی جلن پیدا کرتی ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ "نواب کالا باغ اور جنرل عتیق الرحمان کی کامیابی کا راز ان کی حد سے زیادہ خبر گیری نہیں تھی۔" میں نے کہا نہیں، لوگ ان کے جلال کا شکار تھے، ڈر کا ہتھیار ڈرپوک لوگ استعمال کرتے ہیں۔ آپ ایک دل موہ لینے والی شخصیت ہیں، شرافت آپ کے گھر کی باندی ہے، آپ ان راہوں پر نہ چلیں، میاں صاحب ذرا خوشامد پسند ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تیر بالکل نشانے پر لگا۔ انہوں نے میری بات مان لی اور فرمانے لگے "مجھے پوری طرح باخبر رکھنا آپ کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ آپ ایک دفعہ فون کریں یا ایک ہزار دفعہ یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔" اور یوں اعتماد کا ایک سفر شروع ہوا۔ ویسے میاں نواز شریف کی ہر شریف انسان کی طرح سرشت میں تھا کہ جب وہ اعتماد کرتے ہیں تو پھر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور

توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کے اعتماد پر پورا اتریں۔ اعتماد ہو جائے تو غیر ضروری مین میخ نہیں نکالتے۔ بعد کی زندگی میں انہیں اس عادت سے نقصان بھی ہوا۔ بہر صورت ہر بات کے نفع نقصان کے دونوں ہی پہلو ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے پر اندھا اعتماد کرتے تھے، حالانکہ میرا ان سے تعلق صرف سرکاری تھا، جو زیادہ پرانا نہیں تھا۔

1986ء میں میاں نواز شریف کے لئے ایک بہت بڑا سیاسی اور انتظامی مسئلہ اس وقت اٹھا جب ان کی جماعت پاکستان مسلم لیگ نے 14 اگست کے یوم آزادی کے سلسلہ میں مینار پاکستان پر ایک جلسہ عام کا اعلان کیا۔ دوسرے ہی دن ایم آر ڈی نے بھی وہیں جلسے کا اعلان کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ مسلم لیگ کو جلسہ نہیں کرنے دینگے۔ بات وزیر اعظم محمد خان جونیجو تک پہنچی جنہوں نے اس کی صدارت کرنا تھی۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ یوم آزادی پر ہر کسی کو جلسہ کرنے کا حق ہے۔ ایم آر ڈی بھی کر لے اور ہم بھی، مقامات مختلف ہوں تا کہ کسی جھگڑے وغیرہ کا احتمال نہ رہے۔ مگر پیپلز پارٹی نہیں مان رہی تھی۔ آخر کار محمد خان جونیجو نے نہایت ذمہ داری اور بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا جلسہ ملتوی کر دیا اور ایم آر ڈی سے بھی اس توقع کا اظہار کیا، مگر وہ تو شرارت پر تلے ہوئے تھے اور سیاسی طور پر نوزائیدہ مسلم لیگ کی پیٹھ لگانا چاہتے تھے۔ آخر کار اس قضیہ کا انتظامی حل نکالا گیا۔ لاہور میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی اور ہر قسم کے جلسے جلوس پر پابندی عائد کر دی گئی، مگر ایم آر ڈی نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے جلسے کا اعلان کر دیا۔ اب میاں نواز شریف کی انتظامی صلاحیت کا امتحان تھا کہ وہ اس معاملہ کو کیسے حل کرتے ہیں۔ انہوں نے سب معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور انتظامیہ کو بھرپور اور سخت انتظامات کی ہدایت کی۔ اس وقت پیپلز پارٹی کا بہت زور تھا۔ وہ بھی ہر طرف سے جلوس نکال کر آ گئے۔ اس جلوس میں کچھ لوگ مسلح بھی تھے۔ ضلعی اور صوبائی انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حاجی محمد اکرم ہوم سیکرٹری کے علاوہ سب نے مشورہ دیا کہ انہیں جلسہ کر لینے دیں۔ بعد میں پرچہ کر دیں گے مگر میاں صاحب نہیں مانے۔ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹ گئے۔ کہتے ہیں کہ میں نے 10 اپریل کو مکمل اجازت دی تھی، اب بھی ہم نے اپنا جلسہ ملتوی کر دیا۔ اب اگر ہم نے کمزوری دکھائی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا لہٰذا تمام امور کو قانون قاعدہ کے ساتھ

مضبوطی سے سنبھالیں۔ ضلعی انتظامیہ نے ان ہدایات کی روشنی میں پولیس وغیرہ کے انتظامات کیے۔ پیپلز پارٹی والوں نے روکنے پر ہلڑ بازی شروع کر دی، پتھراؤ کیا، تھانہ لوہاری کو آگ لگا دی۔ پولیس نے ہوائی فائرنگ کی اور آنسو گیس چلائی۔ اس طرح یوم آزادی پر لاہور میں سخت گڑبڑ ہو گئی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور چار افراد مارے گئے۔ حسب دستور مقدمہ درج ہو گیا، ناظم شاہ، جہانگیر بدر، سلمان تاثیر وغیرہ مقدمہ قتل میں نامزد ہو گئے اور یوں پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی۔

اس وقت مجھے ان کی شرافت اور نرم جوئی کے ساتھ ساتھ ان کے عزم اور اندرونی مضبوطی کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ بعد میں ایم آر ڈی نے پورے ملک میں حکومت کے خلاف ایک زبردست تحریک چلا دی۔ تمام شہروں میں جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ ان دوران میں نے دیکھا کہ وہ متعلقہ اضلاع اور شہروں کے انچارج ڈپٹی کمشنروں، ایس پی صاحبان کو خود ٹیلیفون ملاتے اور صورتحال معلوم کر کے انہیں مناسب ہدایات دیتے۔ مناسب حوصلہ افزائی بھی کرتے اور غیر ضروری طاقت کے استعمال سے بھی روکتے۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ وہ ضلع راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر سے بات کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "پکڑ لیں یا چھوڑ دیں، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ گڑبڑ نہیں بڑھنی چاہیے۔ وہ معافی سے رکے یا گرفتاری سے بات ایک ہی ہے، مجھے کسی سے کوئی ضد نہیں ہے، بس ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے" ڈی سی نے شاید کچھ کہا ہو گا تو کہتے ہیں "سپیشل برانچ کی لسٹوں کو گولی مارو تم اپنا فیصلہ کرو" مجھے فکر ہوئی میں نے پوچھ لیا "سر کیا بات ہے؟"

"واہ چودھری صاحب، پرانی غلط لسٹیں بھیجتے ہو۔ اس میں مردوں کے بھی نام ڈال دیتے ہو اور پوچھتے ہو کہ کیا ہوا"

بس ان کا یہ کہنا تھا کہ میں گھبرا گیا۔ ایک فقرے میں مجھے انہوں نے سیدھا کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر میری گھبراہٹ کو محسوس کر کے کہتے ہیں: "کوئی بات نہیں، آپ کے کسی ماتحت نے یہ غلطی کی ہو گی، آئندہ دھیان رکھیں۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جو قتل کا مقدمہ جہانگیر بدر وغیرہ کے خلاف درج ہوا ہے، وہ خلاف واقعہ ہے۔ پیر ناظم شاہ خود میرے گھر آئے اور اپنی معصومیت کے ثبوت لائے۔ میں نے حاجی اکرم سے بات کی۔ ان کی بھی یہی اطلاعات تھی، حاجی صاحب نے میاں نواز شریف سے بات کی تو وہ فوراً ایک آزاد جوڈیشل انکوائری پر رضا مند ہو گئے اور جب ثابت ہو گیا کہ وہ لوگ بے گناہ ہیں تو بلا تامل وتوقف مقدمہ خارج کروا دیا۔ ایک بہت پرانے تجربہ کار بیوروکریٹ نے مشورہ دیا کہ مقدمہ کو پینڈنگ رہنے دیں۔ مخالف خائف رہیں گے تو کہنے لگے "یہ بری بات ہے میں جعلی اور جھوٹے مقدمات کو اپنے سیاسی اقتدار کے لئے بالکل سہارا نہیں بنانا چاہتا۔ اس سے سیاست میں ذاتی انتقام جیسی بری روایات کو فروغ ملتا ہے اور اس کا نتیجہ خجل خواری ہوتا ہے۔" اس پر ایک نہایت ہی معتبر سیاستدان نے کہا کہ میاں نواز شریف کیا بھولا آدمی ہے۔ اسے کیا خبر کہ پنجاب کا مزاج کیا ہے۔ پنجاب کا آدمی جوتے کے نیچے ٹھیک رہتا ہے۔ میاں صاحب کا زمیندارہ بیک گراؤنڈ ہمیں۔ یہ بالکل ناکام ہو جائیں گے، پنجاب میں شرافت کمزوری سمجھی جاتی ہے لیکن میاں صاحب کی پالیسی کامیاب رہی اور چند ہی دنوں میں پیپلز پارٹی کی تحریک دم توڑ گئی۔ وہ کام جو مارشل لاء کی کئی سال کی جاری سختیاں نہیں کر سکی تھیں، وہ میاں صاحب کی شرافت، نفاست، عزم، انتظامی صلاحیت، حوصلہ مندی اور انصاف پسندی نے کر دکھایا۔ میاں صاحب نے جہاں ڈھیل کی ضرورت تھی وہاں ڈھیل دی اور جہاں سختی کی ضرورت تھی وہاں سختی کی۔

میں نے دیکھا کہ میاں نواز شریف سیاسی عناصر از قسم طلبہ، مزدوروں اور سیاسی کارکنان وغیرہ کے لئے نہایت ہی نرم گوشہ رکھتے تھے اور عادی مجرمان کے لئے نہایت سخت تھے۔ فوری اور سخت انصاف کے لئے ہر وقت تڑپتے رہتے تھے۔ ہوم سیکرٹری اور چیف جسٹس سے میٹنگ پہ میٹنگ کرتے کہ جلد انصاف کی کوئی راہ ملے۔ خاص عدالتیں بنائیں جائیں اور کوڑوں کی سزا دی جائے تاکہ مثالی امن قائم ہو کر جرائم سے پاک معاشرہ قائم ہو سکے۔ فرقہ واریت کے جانی دشمن تھے اور تعلیمی اداروں میں بدامنی یا ہڑتال کے سخت مخالف، لیکن اس کے لئے وہ عمومی انتظامی طریقوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان امراض کے علاج کے لئے وہ علماء کرام اور تعلیمی ماہرین سے مشورہ

کرتے رہتے کہ معاملات طاقت کی بجائے تربیت سے سلجھ سکیں۔ ان باتوں پر بھی ہمارے پرانے بیوروکریٹ ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بیوروکریسی اپنی خاص ڈگر سے ہٹ کر نہیں چل سکتی اور اگر کوئی چلنے کی کوشش کرے تو اس کے افراد اس کی بہت مخالفت کرتے ہیں۔ بری سے بری سیاست میں بھی تازگی ہوتی ہے جبکہ بیوروکریسی باسی طور طریقوں پر ہی یقین رکھتی ہے اور تبدیلی لانے والے کو احمق اور ناتجربہ کار گردانتا شروع کر دیتی ہے۔

میاں صاحب نے بالکل شروع ہی میں فیصلہ کیا کہ پنجاب سیکرٹریٹ کو موجودہ جگہ سے کہیں باہر لے جایا جائے تاکہ شہر کی کثافت اور Congestion کم ہو اور ایک اچھا سیکرٹریٹ بھی بن جائے۔ موجودہ جگہ کی فروخت سے اتنی بڑی رقم حاصل ہو سکتی تھی کہ بغیر کچھ زیادہ خرچ کئے ایک نیا دفتر بن سکتا تھا مگر مجال ہے کہ بیوروکریٹس نے ان کی ایک بھی چلنے دی ہو۔ انور زاہد جیسے نیک اور پارسا شخص نے بھی اس کی مخالفت کی۔ ان کی ایک ہی دلیل تھی کہ یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ چیف سیکرٹری کے دفتر کے باہر لارڈ ہنری لارنس کا پتھر نصب ہے۔ یہاں سے کیسے جایا جا سکتا ہے۔ جب میاں نواز شریف نے بہت زیادہ اصرار کیا تو یار لوگوں نے ان کے والد محترم کو پکڑ لیا اور بتایا کہ آپ کا بیٹا سیکرٹریٹ پر پچاس کروڑ روپیہ خرچ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے وفاقی حکومت ناراض ہو جائے گی اور گڑبڑ کا اندیشہ ہے۔ باپ نے بیٹے کو سمجھایا، اب میاں نواز شریف کی سعادت مندی ہے کہ وہ باپ کے آگے عین اللہ کے حکم کے مطابق اف تک نہیں کہتے۔ لہٰذا ان کا یہ وژن بیوروکریٹس کی ملی بھگت نے آج تک پورا نہیں ہونے دیا۔ ویسے میں خود بھی اس گناہ میں شامل رہا ہوں، اب ریٹائر ہو کر پچھتاتا ہوں کہ میں نے ایسے کیوں کیا۔ میرا خیال ہے کہ انسان ریٹائر ہو کر زیادہ حقیقت پسند ہو جاتا ہے۔ اس وقت مجھ پر بھی بیوروکریسی کی بدی کافی غالب تھی۔

میاں صاحب نے چیف منسٹر بنتے ہی سب سے پہلا فیصلہ شہروں میں کچی آبادیوں کو پختہ کرنے کا کیا اور میرے برادر نسبتی امتیاز مسرور کو اس کا انچارج بنایا۔ اس طرح سے گاؤں میں غریب غیر کاشتکاروں کے لئے تین

اور پانچ مرلہ ہاؤسنگ سکیموں اور پلاٹوں کا اجراء کیا۔ حسن پیرزادہ جیسے درویش منش انسان کو اس کام کے لئے اپنا مشیر خاص بنایا۔ پیر صاحب ہر روز میٹنگ کر کے کام کی پراگرس لیتے اور میاں صاحب ہفتہ میں ایک دن میٹنگ کرتے اور ایک دن باقاعدہ موقعہ پر خود جاتے اور بعض جگہوں پر تو رات کو بھی کام ہوتا۔ وہ اکثر کہتے "بھٹو تو صرف نعرے لگاتا تھا، میں باقاعدہ عملی کام کرتا ہوں۔" حسن پیرزادہ بھٹو کے ورکر رہے تھے، میاں صاحب پیر صاحب سے پوچھتے بلکہ چھیڑتے کہ "بتاؤ بھٹو نے غریبوں کے لئے زیادہ کام کیا یا میں نے۔" پیر صاحب بھی جواباً کہتے کہ "بھٹو نے۔"

"وہ کیسے؟" میاں صاحب کہتے۔

"جناب بھٹو صاحب نے محسوس کر کے اس کام کو آواز تو دی۔ وہ آواز نہ دیتا تو آپ یہ کام کیسے کرتے؟" پیر صاحب کہتے۔

"بھٹو دھوکے باز تھا، ایسے ہی باتیں کرتا تھا، وہ اتنی مدت حکومت میں رہا تو پھر اس نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔ یہ کام میں کروں گا" اور انہوں نے واقعی وہ کام کیا اور خوب کیا، میاں صاحب شہر شہر کوچہ کوچہ پہنچے اور کچی آبادیوں کو پختہ کر کے چھوڑا، پانی، بجلی ہر سہولت کا بندوبست کیا۔ میاں صاحب کے دماغ میں جو چیز سما جائے پھر اسے کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ مشکلات آئیں تو ملتوی کر دیتے ہیں مگر پہلی فرصت ملتے ہی وہیں واپس آ جاتے ہیں اور اس دھن میں لگ جاتے ہیں۔ مزدوروں کے لئے انہوں نے بہترین ہسپتال بنائے۔ ان کے بچوں کے لئے نشتر کالونیوں میں ایچی سن کالج کے معیار کے سکول تعمیر کرائے اور مزدوروں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ضیاء الحق کے زمانے میں مزدور ہر وقت ہڑتال پر رہتے تھے۔ یہ ہڑتالیں بعد میں بالکل ختم ہو کر رہ گئیں۔ اس کی وجہ کوئی سختی نہیں تھی، بلکہ ویلفیئر کے وہ کام تھے جو میاں نواز شریف نے ان کے لئے کئے۔

اسی طرح سے طلبہ میں بہت زیادہ بے چینی رہتی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں تو اکثر طلبہ ایک دوسرے کو قتل کرتے رہتے تھے۔ میاں صاحب نے ان آلائشوں پر قابو پانے کے لئے ایک جامع لائحہ عمل تیار کر کے مہر جیون

خان کو سیکرٹری تعلیم لگایا جن کی سربراہی میں کالج / یونیورسٹی کے سربراہ اور ضلعی انتظامیہ روزانہ میٹنگ کرتے اور طلبہ کے مسائل کو حل کر کے رپورٹ پیش کرتے۔ مارشل لاء کے زمانے میں صرف روایتی سختی ہوتی تھی اور اس کے باوجود ہنگامہ آرائی بڑھتی رہتی تھی لیکن میاں صاحب نے سختی کے ساتھ ساتھ اصل مسائل کی طرف دھیان دے کر مسئلہ کو بہت حد تک جڑ سے اکھاڑ دیا۔ یہ سب ان کی ذاتی توجہ اور محنت کا نتیجہ تھا۔ افسوس لوگ بھول چکے ہیں کہ مارشل لاء کے زمانے میں حالات کتنے خراب تھے۔ مارشل لاء کو سنسر شپ کی سہولت حاصل تھی اور اس کی وجہ سے ظاہراً امن قائم ہوتا تھا مگر اندر سے حالات بہت زیادہ خراب تھے۔ لاہور میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی طالب علم قتل ہو رہا تھا یا زخمی، لیکن میاں صاحب نے یہ مشکل کام بھی کر دکھایا اور طلبہ کو واپس کلاسوں میں بھجوا دیا۔

میاں صاحب میں انتظامی بصیرت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک دفعہ لاہور میں سخت شیعہ سنی فساد ہو گیا۔ لوگ مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے اور لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہوا۔ شہر میں کرفیو لگانا پڑا اور فوج بلانی پڑی۔ جنرل ضیاء الحق خود لاہور آئے اور صورتحال پر بریفنگ لی۔ بریفنگ کے بعد صدر صاحب نے حکم دیا کہ ڈاکٹر اسرار اور دوسرے تمام سنی مولویوں کو گرفتار کر لیں اور سخت سزائیں دیں۔ میں نے عرض کیا کہ جناب والا اس سکے کا دوسرا رخ بھی ہے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میاں صاحب نے معاملہ سنبھال لیا اور کہا کہ "ہم دونوں اطراف یعنی شیعہ اور سنی لوگوں میں سے شرارتی لوگوں کو پکڑ رہے ہیں اور قانون کے مطابق انہیں سزائیں دلوائیں گے۔" اس طرح سے بات ختم ہو گئی ورنہ صدر صاحب کے حکم پر صرف یکطرفہ کارروائی ہو کر فساد بڑھ جاتا ہے۔ کشش کے ساتھ ساتھ میاں صاحب کی شخصیت میں فوری معاملہ فہمی اور حاضر جوابی بھی بہت زیادہ ہے۔

جاگیردار بمقابلہ سرمایہ دار

میں نے دیکھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں میاں نواز شریف کی انتظامی اور سیاسی کامیابی کی دھاک بیٹھ گئی اور حکومتی معاملات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ ہم اس صورتحال سے بہت خوش تھے کہ یکدم ان کے خلاف عجیب وغریب قسم کا پروپیگنڈہ شروع ہو گیا۔ کوئی کہتا کہ ان کے ہاں ہر کام پیسے سے ہوتا ہے تو کوئی اسے سفارش کی کرامات کہتا۔ ایک آواز اٹھی کہ میاں صاحب تو بالکل ان پڑھ ہیں۔ انگریزی بولنا تو درکنار ایک فقرہ تک لکھ نہیں سکتے۔ تقریر کے فن سے نابلد ہیں۔ ہر پوسٹنگ، ٹرانسفر پر پیسہ چلتا ہے۔ ایک دن میرے ایک برادر نسبتی نے نہایت معصومیت سے کہا کہ "بھائی جان سنا ہے میاں نواز شریف ڈی سی او سیشن جج لگانے کے پانچ ہزار روپے لیتا ہے" میں نے اس سے کہا کہ "بھئی میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ وہ لوگ تو بہت زیادہ امیر ہیں انہیں اس قسم کی جھک مارنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔" میں نے پوچھا کون کہہ رہا تھا تو معلوم ہوا ہے کہ چند ثقہ قسم کے وکلاء کہہ رہے تھے۔ میں حیران ہو گیا کہ کم از کم وکلاء کو تو سبھی معلوم ہونا چاہئے کہ سیشن جج کی تعیناتی ہائیکورٹ کرتی ہے مگر اڑانے کی کیا کہئے۔ چند دنوں کے بعد تو یہ بات عام ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ پیپلز پارٹی کا پروپیگنڈہ سیل یہ باتیں پھیلا رہا ہے تاکہ اس طرح نئی حکومت کا امیج خراب ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مخالف کی کردار کشی کو ایک طریقہ

واردات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ ہمارے دین میں غیبتکی سخت ممانعت ہے بلکہ اسے تو اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے مگر یہ ہتھیار ہمارے ہاں خوب چلتا ہے۔ بعد میں پاکستان مسلم لیگ نے بھی بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے خلاف اس ہتھیار کو خوب استعمال کیا مگر وہاں کچھ بنیاد تھی جس میں رنگ زیادہ بھر لیا گیا تھا مگر میاں صاحب کے متعلق یہ بات بالکل بے بنیاد تھی، مگر پروپیگنڈہ کا بہت اثر ہوتا ہے اور لوگوں نے ان باتوں پر یقین کرنا شروع کر دیا۔ کسی حکومت یا فرد کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا اعتماد یا ساکھ ہوتی ہے۔ اگر وہ خراب ہو جائے تو پھر بہت کچھ بگڑ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اصولوں سے عاری مارشل لاء زدہ غصیلی اور ادھوری جمہوریت میں یہ سب سے بڑا نقص ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسرے کی ٹانگ کھینچنا اپنا جمہوری حق سمجھتا ہے اور اس طرح سب لوگ بدنام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ لوگ جس شاخ پر بیٹھے ہوتے ہیں شیخ چلی کی طرح اس کو کاٹ رہے ہوتے ہیں اور جس برتن سے کھانے جا رہے ہوں اس کو گندہ کرتے رہتے ہیں جس کا فائدہ ہمیشہ بیوروکریسی اٹھاتی ہے چاہے وہ سول ہو یا ملٹری۔ یہ اتنے منظم ہیں مجال ہے جو ایک دوسرے کی بدنامی کریں اور اگر کوئی بات ہو بھی تو فوراً اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں مگر ہمارے مارشل لاء برانڈ کے سیاستدان اس کھیل کے بہترین ماہر ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے استاد جنرل ایوب خان کو دیکھا تھا کہ اس کے بے بنیاد اور مسلسل پروپیگنڈہ نے کس کامیابی کے ساتھ ان لوگوں کو بھی بدنام کر دیا تھا جن کے دامن پر داغ کا نشان تک نہ تھا اور انہوں نے بے انتہا قربانیوں کے ساتھ تخلیق پاکستان کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس "ایوبی" ہتھکنڈے کو اب پیپلز پارٹی میاں نواز شریف کے خلاف موثر انداز میں استعمال کر رہی تھی چونکہ ایسی باتوں کا کھوج لگانا میرے فرائض میں شامل تھا اس لئے میں نے ان لوگوں کی ٹوہ لگائی جو یہ حرکت کر رہے تھے۔ میاں صاحب کو بتایا تو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، اللہ مالک ہے۔ چودھری صاحب آپ زیادہ فکر مت کیا کریں" میں نے کہا "ایسے لوگوں کو پکڑ لیں"؟ "بالکل نہیں، یہ جھوٹ اپنی موت خود ہی مر جائیگا"۔ یہ تھا میاں نواز شریف کا ردعمل۔

کچھ دنوں بعد میاں صاحب کے خلاف باقاعدہ پمفلٹ چھپنے شروع ہو گئے۔ ایک پمفلٹ مجھے اچھی

طرح یاد ہے جس کا عنوان تھا "طاہر القادری سے طاہرہ سید تک" ہم نے انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ یہ پیپلز پارٹی کا کرتب نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کا تعلق خود مسلم لیگ سے ہے، میں حیران رہ گیا

ہائے ہم کس خیال میں گم تھے
دوستی کے لباس میں تم تھے

غیر جماعتی انتخابات کو ایسی ہی برکات سے دوچار ہونا تھا۔ اصل میں مسلم لیگ میں زمیندار طبقہ اس بات سے خوش نہیں تھا کہ کوئی شہری بابو اور سرمایہ دار پنجاب کا حاکم بنے کوئی انہیں لوہار کہتا اور کوئی کچھ جیسے کہ میاں نواز شریف نے ان کی جاگیر پر قبضہ کر لیا ہو۔ اکثر یہ بات کہی جانے لگی کہ حکمرانی کا تجربہ بلکہ حق صرف زمیندار کلاس کو ہے حالانکہ اس ملک کے بانی حضرت قائداعظمؒ کا جدی پشتی تعلق بزنس کلاس ہی سے تھا اور خود آپ حضور ﷺ تجارت سے وابستہ رہے تھے مگر زمینداروں کو ایسی باتوں سے کیا تعلق۔ اصل میں میاں نواز شریف نے شروع ہی میں جس طرح سے سیاسی اور انتظامی امور پر مضبوط پکڑ کر لی اس سے یہ لوگ پریشان ہو گئے کہ اگر یہ اسی طرح سے کامیاب ہوتے رہے تو پھر ان کا جدی پشتی حق حکمرانی مارا جائے گا۔ بہتر ہے کہ اس بلا کو شروع ہی میں ختم کر دیا جائے یعنی "گربہ کشتن روز اول" لیکن میں نے اس سلسلے میں فی الوقت میاں صاحب سے کوئی بات نہیں کی بلکہ ان معاملات کی ٹوہ میں لگ گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ ان معاملات کے پیچھے پیر صاحب پگاڑا شریف ہیں وجہ یہ تھی کہ میاں محمد نواز شریف نے ان کے آدمی کو راوی دریا میں سے ریت نکالنے کا ٹھیکہ نہیں دیا تھا کیونکہ رولز اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ پیر صاحب نے اسے اپنی توہین سمجھا اور نواز شریف کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ اس وقت پیر صاحب کا مرید خاص محمد خان جونیجو ملک کا وزیر اعظم اور پاکستان مسلم لیگ کا صدر تھا۔ پیر صاحب نے یوسف رضا گیلانی، ملک اللہ یار، نصر اللہ دریشک، حامد ناصر چٹھہ اور پنجاب کے دیگر بڑے بڑے زمینداروں کو میاں صاحب کے خلاف اکسایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے میاں صاحب کے پیچھے پڑ گئے اور سب سے پہلا محاذ پروپیگنڈہ کا کھولا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میاں نواز شریف بالکل نالائق ہیں۔

انہیں سیاست کی ابجد تک نہیں آتی۔ انہیں کیا معلوم کہ پنجاب کا کیا مزاج ہے۔ یہ تو صرف شہری بابو ہیں ساتھ ہی ساتھ انہوں نے انہیں عیاش ثابت کرنے کے لئے مختلف معروف عورتوں کے نام لینا شروع کر دیئے۔ انہوں نے سمجھا کہ میاں صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوان اور خوبصورت بھی ہیں لوگ ایسی باتوں پر ضرور یقین کریں گے لہٰذا انہوں نے یہ تحریک خوب زور و شور سے چلائی۔ بددیانتی کی مہم پیپلز پارٹی نے پہلے ہی شروع کر رکھی تھی یہ لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے اور یوں میاں صاحب کو سیاسی طور پر تباہ کرنے کا منصوبہ تیار ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو مجھے خبر ملی کہ جنرل ضیاء الحق بھی میاں نواز شریف سے مایوس نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ میاں صاحب پنجاب کو سنبھالنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے لئے ایک پرابلم بنتے جا رہے ہیں حالانکہ اصلیت اس کے بالکل الٹ تھی۔ میاں صاحب کی کامیابی ہی ان کی سب سے بڑی مشکل بنتی جا رہی تھی۔ یہ سب اس پروپیگنڈہ کا نتیجہ تھا جو جنرل ضیاء الحق کے کانوں میں ڈالا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بشارت الٰہی جو جنرل صاحب کے بردار نسبتی تھے اور اسلم خان صاحب جو جنرل صاحب کے قریبی دوست تھے کو اس سازشی گروہ نے کسی نہ کسی طرح قابو کر لیا تھا اور وہ نہایت معصومیت کے ساتھ ایسی باتیں جنرل صاحب کے کان میں ڈال دیا کرتے تھے۔ رائے احمد سلیم ایم پی اے اور میرے قریبی دوست مجھے وہاں کا احوال اس لئے بتاتے کہ میں خواہ مخواہ میاں صاحب کے ساتھ اتنا زیادہ نتھی نہ ہوں کیونکہ انہیں بہت جلد بدل دیا جائے گا۔ لیکن رائے صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کسی نفع نقصان کے میزان سے اپنا کام نہیں کر رہا تھا۔ میں تو صرف ادائے فرض کر رہا تھا اور یہی میری زندگی بھر کی تربیت تھی۔ میں نے ہمیشہ اصولوں ہی کو نفع سمجھا ہے۔ مصلحتوں کو نہیں، سچی بات یہ ہے کہ جنرل صاحب کی سوچ معلوم کر کے مجھے خاصی تشویش ہوئی کیونکہ اگر اس وقت جنرل صاحب نواز شریف کا ساتھ چھوڑ دیتے تو پھر نواز شریف کا مزید چلنا محال ہو جاتا۔

میں نے ان تمام معاملات کے بارے میں ابھی میاں صاحب کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا ہے کہ رانا پھول محمد کا مضبوط گروہ بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے کیونکہ انہیں یقین آ گیا تھا کہ اب میاں نواز شریف

نہیں بیچ سکتے۔ پھر معلوم ہوا کہ چودھری صدیق چیف سیکرٹری اور ذہین وفطین آئی جی پنجاب حافظ مصباح الدین جامی بھی اب میاں محمد نواز شریف کے مخالفین کے پلڑے میں لے گئے ہیں حتیٰ کہ بریگیڈیئر عبدالقیوم بھی ادھر ہی اپنا وزن ڈال رہے ہیں۔ اب حالات بے انتہا مخدوش نظر آنے لگے تھے کیونکہ اتنے طاقتور گروہ کے سامنے اکیلے میاں محمد نواز شریف کی شرافت یا صلاحیت کیا کر سکتی تھی۔ پھر پتہ چلا کہ حاجی محمد اکرم اور ڈاکٹر صفدر محمود کے سوا تمام بیوروکریسی بھی اب دوسری ہی طرف ڈھلک گئی ہے اور وہ لوگ ہمیں نواز شریف کے Three Stooges کہتے ہیں یعنی کرائے کے بندوق بردار، لیکن اصل بات اصولوں کی تھی کرائے کی نہیں ہم اپنے وزیراعلیٰ کی ڈیوٹی میں بالکل وفادار تھے اور ان باتوں کا معلوم کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔

اب مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ نواز شریف کے خلاف یہ منصوبہ مکمل طور پر تیار ہو چکا ہے تو میں نے یہ تمام تفاصیل حاجی محمد اکرم ہوم سیکرٹری کے ساتھ Discuss کیں۔ پوری صورتحال کا ایک نقشہ تیار کیا اور پنجاب میں سینکڑوں سال سے چلتی آ رہی دھڑے بندیوں کی تصویر بھی لکھ لی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ پنجاب کے ہر ضلع میں اگر ایک سیاسی دھڑا ایک طرف ہوگا تو دوسرا دھڑا لامحالہ دوسری طرف ہوگا۔ یہاں کی زمیندارہ کلاس کا یہ سب سے کمزور پہلو جس سے ہر حکمران نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ میاں صاحب تو پہلے ہی حکمران بن چکے تھے۔ اب وہ بہتر پوزیشن میں تھے کہ وہ سب سے زیادہ دھڑوں کو اپنے ساتھ لے کر چل سکیں۔ صرف اپنے کارڈ صحیح طریقے سے کھیلنے کی ضرورت تھی۔ حاجی محمد اکرم کا بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تجربہ تھا۔ ہم نے جب میاں صاحب سے یہ بات کی تو وہ بہت نروس ہو گئے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن جب ہم نے انہیں اس کا علاج بتایا تو ذرا سنبھل گئے۔ ہم نے عرض کی کہ آپ اپنے سیاسی ذرائع سے معلوم کریں اگر انہیں اچھی طرح یقین ہو جائے تو صرف اسی صورت میں وہ اپنے مخالفین کو Confront کریں اور بات کو اوپن کرنے سے پہلے مختلف ممبران کو طریقے سے بلا کر رام کر لیں۔ میاں صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی میاں شہباز شریف کے ساتھ مل کر یہ کام خوب اچھے طریقے سے کیا۔ بہت سے ایم پی اے صرف ملاقات کے خواہاں تھے میاں صاحب ذرا کم آمیز

تھے۔ ملنے لگے تو وہ ایسے ہی خوش ہو گئے چند ایک کے ضروری کام پھنسے ہوئے تھے انہوں نے وہ کر دیئے۔ بعض حضرات اپنی مرضی کے تحصیلدار اور ایس ایچ او چاہتے تھے اس میں میاں صاحب کو بہت حجاب تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح تو انتظامیہ برباد ہو جائے گی مگر اب یہ ان کی مجبوری بن گئی تھی وگرنہ ان کی حکومت گر جاتی۔

ابھی یہ خاموش سیاست چل ہی رہی تھی کہ مخالفین کھل کر سامنے آ گئے۔ صوبائی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ وہ اس مقابلہ میں بالکل جیت جائیں گے۔ پیر صاحب پگاڑا ان کے ساتھ تھے اور ان کی وجہ سے وزیر اعظم بھی ساتھ ہی سمجھے گئے۔ زمیندارہ کلاس کے کثیر منافقوں نے ان سے وعدے کر رکھے تھے اور سب سے بڑھ کر میاں صاحب کے خلاف جوان کی نالائقی اور بددیانتی کا پروپیگنڈہ چل رہا تھا، اس نے مخالف فریق کو مکمل یقین دلایا تھا کہ ان سے اب تخت لاہور کوئی نہیں چھین سکتا۔ ویسے بھی وہ وڑائچ جٹ ہونے کے حوالے سے اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کا جائز وارث تصور کرتے تھے۔ انہیں اپنے آپ پر اتنا یقین تھا کہ وہ صاحب خود مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ آپ میرا ساتھ دیں۔ چند دنوں کی بات ہے میں وزیر اعلیٰ بن رہا ہوں۔ میں نے ذرا ٹال مٹول کی تو فرماتے ہیں کہ بریگیڈیئر قیوم بھی میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ ان سے مشورہ کر لیں۔ یہ بات میں نے حاجی اکرم کو بتائی۔ حاجی صاحب اور ڈاکٹر صفدر محمود نے تجویز رکھی کہ میاں نواز شریف اسمبلی اجلاس کے آخری دن یکدم اٹھ کر ایوان میں ایک جذباتی تقریر کریں اور اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے لیں اس طرح رستے ہوئے زخم کی مرہم پٹی کر دیں، معاملہ صاف ہو جائے گا۔ ہماری ڈیوٹی لگی کہ اس کے نتیجہ کا اندازہ لگائیں، مجھے یاد ہے میں نے اپنی رپورٹ لکھ کر دی کہ 260 کے ہاؤس میں صرف 18 ایم پی اے ایسے ہیں جو میاں صاحب کے خلاف کھل کر ووٹ دینگے۔ خفیہ رائے شماری میں معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ اس لئے تقریر کے بعد اپنے حق والوں سے کہیں کہ وہ سب اپنی نشستوں سے اٹھ کر ووٹ دیں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ 23 اکتوبر 1986ء کو کھلا ووٹ ہوا اور میاں صاحب کی سیاسی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ گنتی میں عین 18 ووٹ ان کے خلاف تھے۔ اس وقت سے میاں صاحب کو میری اس اہلیت پر بے حد اعتماد ہو گیا اور میرے ساتھ بہت محبت اور شفقت فرمانے لگے۔

اسی دوران میں نے پنجاب کی دھڑے بندیوں کا فلسفہ اسلم خان صاحب کے ذریعہ جنرل ضیاء الحق تک بھی پہنچا دیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ بدلے ہوئے حالات میں میاں نواز شریف جیسا شخص ہی سارے پنجاب کو جنرل صاحب کے پیچھے کھڑا کر سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا زمیندار صرف آدھے پنجاب کو ساتھ رکھ سکتا ہے۔ دوسرا دھڑا لازماً مخالف ہو جائے گا اس لئے جنرل صاحب نے نواز شریف کو چن کر بہت ہی سمجھداری اور پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تیر بالکل ہدف پر لگا اور جنرل صاحب ایک ہفتہ بعد لاہور تشریف لائے اور اپنا مشہور زمانہ بیان کہ "نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے" دیا مگر یہ بیان اعتماد کے ووٹ کے بعد دیا اس سے پہلے نہیں۔ جنرل صاحب بھی بڑے استاد آدمی تھے۔ اس طرح میاں نواز شریف نے زمیندارہ کلاس کو شکست فاش دیدی اور ایک دفعہ پھر صوبے کی تعمیر و ترقی میں لگ گئے۔ لیکن اب ایم پی اے صاحبان کے منہ کو خون لگ گیا تھا اور وہ اپنے ذاتی کاموں کے لئے حد سے بڑھتے جا رہے تھے اور یہ قیمت میاں نواز شریف کو اپنی طبیعت کے خلاف ادا کرنا پڑی جس سے ان کی بدنامی کا پہلو بھی نکلا مگر یہ سب کچھ کیا دھرا غیر جماعتی انتخابات کا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں مارشل لاء اپنے زعم میں بہتری کا نام لے لے کر ہمارے نظام سیاست کو اتنا خراب کر چکا تھا کہ کوئی بھی اسے چلا نہیں سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میاں نواز شریف جیسے نیک پارسا اور صاف ستھرے انسان کے لئے بھی اس کی آلائشوں سے بچ نکلنا محال ہو گیا۔ بدقسمتی سے میاں صاحب اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے کاروباری گھرانے سے تھا لہٰذا یہ ہر کسی کے لئے کہنا آسان ہو گیا کہ وہ بے ایمانی سے کما رہے ہیں اور لوگ یقین بھی کرنے لگے۔ اگر تو میاں شریف اپنا کاروبار جو انہوں نے مزدور کے طور پر 1937 میں شروع کیا تھا اور قائداعظم کی تلقین کے مطابق ہندوؤں کے مقابلہ میں بڑھایا تھا کو بالکل بند کر دیتے اور سادھو سنت بن جاتے تب شاید یہ الزامات نہ لگتے مگر یہ عام حالات میں مشکل ہوتا ہے۔ میاں شریف اور نواز شریف کوئی انبیاءؑ کی جماعت میں سے تو تھے نہیں۔ عام گوشت پوست کے بنے انسان تھے۔ نیک بھی تھے تو بشری کمزوریاں بھی تھیں۔ کوئی بہت بڑے مدبر یا مصلح بھی نہیں تھے، بس عام سے لوگ تھے۔ ایک معمار کی طرح ان کے ذمہ وطن کی گلیوں اور سڑکوں کی تعمیر کا کام آیا تھا۔ تاریخ میں ہیرو کبھی کبھی آتے ہیں۔ ہیرو کا کام

تعمیر نہیں تخلیق ہوتا ہے اور وہ کبھی کبھی ہوتی ہے اور جب تخلیق ہوتی ہے تو تکلیف بھی ہوتی ہے جیسا کہ 1947ء میں ہوا۔ معمار نالی اور گلی کو درست کرواتا ہے اور میاں نواز شریف نے ہر کام پنجاب کے گلی گلی کوچے کوچے قریہ قریہ اور شہر شہر کیا اور طعنہ سہا کہ یہ لوگ تو گلی اور نالی کے سیاستدان ہیں۔ ان کا مقام قومی اور بین الاقوامی کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کی سوچ پست ہے وہ قومی افق پر نہیں چمک سکتے۔ ایسا کام تو بھٹو جیسا شخص ہی کر سکتا ہے یا اس کی اولاد۔ یہ میاں نواز شریف وغیرہ کس باغ کی مولی ہیں مگر یہ وقت ان ہی جیسے لوگوں کا تھا اور مل گیا۔ جاگیردار بھی سو گئے اور وکیل بھی۔ اب تعمیر وطن کی فیز تھی اور میاں نواز شریف نے اپنے ترقیاتی پروگرام کا نام باقاعدہ "تعمیر وطن" رکھا۔ انہیں سڑکیں بنوانے کا خاص شوق بلکہ خبط تھا اور وہ اسے صحیح طور پر ہر قسم کی ترقی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انجینئروں سے وہ سخت مایوس تھے۔ پی ڈبلیو ڈی کے قواعد وضوابط سے سخت نالاں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ قواعد کام کروانے کی بجائے رکاوٹ بنتے ہیں لہٰذا جوش جوانی اور کام کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے اکثر و بیشتر اس طرح کے قواعد کی ذرا بھر پرواہ نہیں کرتے تھے اور اکثر و بیشتر انہیں نرم کر کے حکم دیتے کہ فلاں سڑک یا نہر اتنے وقت کے اندر اندر بن جانی چاہئے۔ فلاں کچی آبادی تین ماہ کے اندر پختہ ہونی چاہئے اور مزے کی بات ہے کہ وہ دی ہوئی تاریخ کبھی نہیں بھولتے تھے اور اسی تاریخ کو موقع پر پہنچ جاتے اس طرح وہ انجینئروں کے خلاف اور انجینئر ان کے خلاف ہو گئے مگر انہوں نے کام ضرور چلا لیا۔ آخر جب بہت زیادہ تنگ آ گئے تو انہیں اعلیٰ شاہراہوں کی تعمیر کے لئے کسی فعال منتظم کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لئے فال حاجی محمد اکرم کے نام نکلی۔ ہمارے دوست حاجی صاحب کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی لیکن میاں صاحب نے ہائی ویز کا ایک خاص محکمہ بنا کر انہیں اس کا انچارج بنا دیا اور لامحدود اختیارات سونپ دیئے بہت سے انجینئر ان کے ماتحت لگا دیئے اور حکم دیا کہ موٹر ویز کا جال بچھانے کے لئے سروے اور نقشے تیار کئے جائیں۔ اب حاجی صاحب ڈر گئے، کہتے ہیں میں بڑھاپے میں جیل نہیں جانا چاہتا، میں تو قاعدے قانون کے مطابق ہی کام کروں گا اور قاعدے قانون میں یہ کام ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا تعمیر نو کے لئے ایسا تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ کہنے لگے کہ ملک میں کوئی انقلاب تھوڑا ہی آ گیا ہے۔ یہ کام تو ماؤزے تنگ ہی کر سکتا ہے اور میاں نواز

شریف ماؤزے تنگ نہیں ہے۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ حاجی صاحب کچھ کر گزریں مگر حاجی صاحب نے اپنا کام صرف سروے تک ہی محدود رکھا جو بعد میں اس وقت کام آیا جب میاں نواز شریف ملک کے وزیر اعظم بنے۔ بہترین سے بہترین بیوروکریٹ کی سوچ سیاستدانوں کے مقابلہ میں اکثر و بیشتر بوسیدہ ہی ہوتی ہے۔ ہر ترقی یا تبدیلی کے لئے رسک لینا پڑتا ہے اور رسک لینا بیوروکریٹ کی سرشت میں نہیں ہوتا حالانکہ حاجی محمد اکرم ایک بہت ہی اچھے اور نیک بیوروکریٹ ہیں لیکن نواز شریف نے ملک کیلئے اس طرح کے رسک لئے اور پھر بدنام بھی ہوئے۔ اگر کہا جاتا تو ہمیشہ کہتے تعمیر وطن کے لئے کچھ دھول تو پھانکنی ہی پڑے گی اور اس میں سے کچھ دھول خود اپنے چہرے پر بھی ضرور پڑے گی۔ چودھری صاحب پرواہ نہ کیا کریں۔ بندے کو بہادر ہونا چاہئے اور جو اچھا کام ہو کر گزرنا چاہئے۔ مگر اکثر و بیشتر وہ بہادری کے ساتھ ساتھ بے احتیاطی بھی ضرور کر جاتے تھے۔ شاید سچے لوگوں کا یہی خاصہ ہوتا ہے اور وہ بیوقوف کہلانے سے بھی نہیں گھبراتے، وہ اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں۔

گلشن کا کاروبار

اس وقت تک مجھے میاں صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ ان کی شخصیت کے بہت پہلو تھے۔ نہایت ملنسار اور نرم گو، معاملہ فہم اور فیاض، مددگار اور شائستہ، مگر کچھ باتیں ضرورت سے زیادہ ہی ان کے اندر موجود تھیں۔ ایک تو حد سے بڑھی ہوئی خود پسندی، جسے آپ انا نہیں کہہ سکتے۔ شاید وہ ان کی خدا پسندی کی وجہ سے دب کر عاجزی کی شکل اختیار کر گئی تھی، مگر وہ ان کی شخصیت کے اندر موجود تھی اور اکثر و بیشتر وہ خوشامد پسندی پر منتج ہو جاتی۔ امارات و اقتدار کے ساتھ ساتھ جوانی بھی بھرپور ہو تو شاید انسان ان دو خامیوں کا شکار ہو ہی جاتا ہے۔ خود بچنا چاہے بھی تو دوسرے خود غرض لوگ اپنے کمال فن کی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنے نہیں دیتے اور ایسے لوگ میاں صاحب کے ارد گرد بہت تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میاں صاحب کی یہ "صفت" انہیں زندگی میں ضرور دھوکہ دیتی رہے گی اور حالات و واقعات نے ثابت کیا کہ اس وجہ سے کبھی وہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا شکار ہوتے رہے اور کبھی وہ خوشامدیوں کے نرغے میں آ کر حقیقتوں سے بالکل دور ہو گئے۔ اسی کا پرتو تھا کہ وہ خود بھی تلخ گوئی نہیں کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ حکمرانی میں

بعض دفعہ حکمرانوں کو مجبوراً سخت لہجہ اپنانا ہی پڑتا ہے۔ ہاں اقتدار کے آخری مرحلہ میں جب وہ دوسری بار وزیراعظم بنے تو پھر کوشش کر کے تلخ گو ہوتے گئے، وگرنہ فطرت میں مروت ہی مروت اور حلاوت ہی حلاوت ہے۔ اس کا کرشمہ ان کی آنکھ میں حیا اور لحاظ تھا مگر ساتھ ساتھ خوشامدی پسندی بھی در کرتی گئی کیونکہ یہ بھی انسانی جبلت کا ایک حصہ ہے۔

وہ دوسروں سے ایک عجیب وغریب قسم کی ذاتی وفاداری کا تقاضا رکھتے تھے۔ وہ خود بھی بہت ہی وفا شعار تھے اور اپنے وعدے کو ضرور نبھاتے، مگر دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے۔ سرکاری معاملات میں بھی ان کا یہی رویہ تھا حالانکہ ریاست کے کاموں میں ذات سے زیادہ قاعدے قانون اور روایات سے وفاداری غالب ہوتی ہے اور وہ ایک خاص قسم کے درست رویئے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہاں آ کر میاں صاحب بہت سے معاملات کو خلط ملط کر جاتے۔ ایسی صورتوں میں کوئی ذاتی فائدہ یا نقصان کا ایشو نہیں ہوتا تھا مگر ایک ادا تھی جو انہیں پسند تھی۔ شاید یہ بھی ان کی خود پسندی ہی کا شاخسانہ تھا یا ایک لاشعوری جبلت۔ یوں نظام سے زیادہ وہ انسان پر نگاہ رکھتے اور جب ذرا فرسٹریٹ ہوتے تو گلوں شکوؤں سے کام لیتے مگر پھر بھی انتہا نہ کرتے اور کسی کی گردن نہ کاٹتے۔ خفا ہوتے تو کنارہ کش ہو جاتے اور بچوں کی طرح ملنا جلنا بند کر دیتے۔ ان کی یہ عادت بدی کی شکل تو اختیار نہیں کرتی تھی مگر چھوٹی موٹی دل شکنیوں اور بعض دفعہ بے انصافیوں اور عدم میرٹ پر منتج ہو جاتی اور حکمرانی میں یہ عادت کچھ زیادہ اچھی نہیں گردانی جا سکتی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ میں نے یہ بادشاہی بیماری پاکستان کے کئی حکمرانوں میں ضرورت سے زیادہ ہی دیکھی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ علت میاں صاحب میں ان سے کم ہی ہو۔

میاں صاحب کی ایک غلط عادت ان کی عجلت پسندی تھی۔ ان کی تربیت ایک کاروباری شخص اور صنعتکار کے طور پر ہوئی تھی، کاروبار میں جلد سے جلد نتائج پیدا کرنے اور کاموں کو سرعت سے مکمل کرنے ہی میں کامیابی ہے، لہٰذا میاں صاحب کاروبار سرکاری میں بھی وہی عادات ساتھ لے کر آئے۔ مانا کہ فعالیت کے لئے صلاحیت اور رفتار ضروری ہے مگر انسانی امور اور اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے وہاں کے فکری ماحول کو بہتر کرنا بھی

بہت ضروری ہے۔ انسانی اعمال میں انسانی رویے اور روح بہت زیادہ اہم ہوتے ہیں اور کاروبار میں اکثر و بیشتر مادی معاملات، لہٰذا میاں صاحب خواہ عدالت و کفالت اور انتظام و انصرام ہو یا امن و امان اس میں عجلت پسندی اور بعض دفعہ تو بے صبری تک کا اظہار کر جاتے۔ اسی طرح کی شخصی خوبیاں اور خرابیاں ان کی کامیابی اور ناکامی کا زینہ بنتی رہیں۔ کبھی وہ بہت زیادہ حقیقت پسند بن جاتے اور کبھی حقیقتوں سے بہت دور نکل جاتے لیکن ان کی نیت میں فتور کبھی نہیں آیا۔

ان معاملات و واقعات کو آج 1999ء میں جب وہ جیل جا چکے ہیں، مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ وہ اپنے مقدر کا راستہ خود ہی تراش لیتے تھے۔ کامیابی کا بھی اور ناکامی کا بھی۔ انہوں نے کمال رفتار اور صلاحیت سے سڑکیں اور پل بنوائے کہ دنیا حیران ہو گئی۔ موٹروے کو پنجابی محاورے کے مطابق "بمبو کاٹ" کی رفتار سے تیار کروایا۔ واپڈا میں چوری کے مجرموں اور ملکی دہشت گردوں پر برق رفتاری سے جھپٹے۔ مردم شماری کا مشکل مرحلہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ (یہی صورتحال شہباز شریف کی تھی کہ بوتی مافیا اور تجاوزات جیسے پیچیدہ معاملات کے پیچھے پڑے تو ہتھیلی پر سرسوں جما دی۔ خصوصی عدالتوں کے ذریعے جرائم کی بیخ کنی اور کیا کیا نہ کر گزرے) مگر جب خود اپنے آپ کو اقتدار سے گرانے کا مرحلہ آیا تو 1993ء میں اور 1999ء میں اتنی تیز رفتاری دکھائی کہ لوگ حیران رہ گئے۔ شاید ہر انسانی کی جبلت اسے اپنی تقدیری راہوں پر چلاتی ہے۔ مرے خیال میں یہ تقاضائے بشری ان کی شخصیت کی خوبیاں یا خامیاں ہیں مگر وہ دل کے بہت صاف ہیں۔ ایک سادہ سا بھولا بھالا انسان جو اکثر فیصلے درست کرتا رہتا ہے لیکن پھر مقدر کے ہاتھوں Greek Tragedy کے ہیرو کی طرح دھڑام سے نیچے آ گرتا ہے۔ شاید ذوالفقار علی بھٹو کا بھی یہی المیہ تھا۔ ایسے لوگ بے ایمان نہیں ہوتے۔ تدبیر بھی ان کی اچھی ہوتی ہے مگر تقدیر انہیں پابہ زنجیر کر کے قربان گاہ تک لے آتی ہے۔

معاف کیجئے گا میں نے یہ چند باتیں اس کتاب کے شروع میں اس لئے لکھ دیں کہ قاری کو میاں نواز شریف کی شخصیت سمجھنے یا پرکھنے میں کچھ مدد مل سکے۔

10 مارچ 1987ء کو وفاقی کابینہ میں چودھری انور عزیز وفاقی وزیر بلدیات کی تجاویز پر فیصلہ ہوا کہ آئندہ بلدیاتی انتخابات براہ راست کی بجائے جنرل ایوب خان کے بی ڈی سسٹم کی طرح بلاواسطہ طریقے سے کروائے جائیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی وجہ پیپلز پارٹی کا خوف ہے۔ ان کے خیال میں پیپلز پارٹی مسلم لیگ سے زیادہ ہر دلعزیز تھی اور اگر وہ لوکل باڈیز کے الیکشن جیت جاتی تو مسلم لیگ کی سیاسی ساکھ کو بہت زیادہ نقصان ہوتا۔ ان ہی دنوں پیپلز پارٹی نے آنے والے لوکل باڈیز انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کا عندیہ دیا تھا۔ پنجاب کی حد تک غلام حیدر وائیں اور میاں صاحب خوش تھے کہ شکر ہے پیپلز پارٹی ان کی حکومت کے تحت ان الیکشنوں میں حصہ لے کر کم از کم 1985ء کے الیکشنوں کے نتیجہ میں معرض وجود آنے والی حکومت کو Legitimacy تو دے جائے گی۔ علاوہ ازیں لوکل باڈیز کے الیکشن ویسے ہی غیر جماعتی ہوتے ہیں۔ حلقہ نیابت بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لوگ اپنے ذاتی نفع نقصان اور رنجشوں کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا پیپلز پارٹی اس طرح ہر جگہ منقسم ہو کر رہ جائے گی، اس لئے اس کا اس الیکشن میں شریک ہونا بڑا نیک شگون ہے لیکن اگر اس الیکشن کے طریقہ کار کو بدل کر بالواسطہ کیا گیا تو شاید وہ اس کا بائیکاٹ کر دے۔ یہ ہوتا تو اس کا سیاسی نقصان بہت تھا۔

یہ تھا وہ بنیادی اختلاف جس نے محمد خان جونیجو اور میاں نواز شریف کے درمیان اختلاف کی خلیج پیدا کی۔ محمد خان جونیجو اپنے طور پر اور میاں نواز شریف اپنے طور پر ان الیکشن کے ذریعے اپنی اپنی سیاسی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ یہ مسئلہ بنیادی طور پر چونکہ صوبائی ہوتا ہے اس لئے میاں نواز شریف اس سے فائدہ اٹھانے کی زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے، لہٰذا ان کی بات ماننا پڑی اور یوں یہ الیکشن جنرل ایوب خان والے بی ڈی سسٹم کے وصال کا ذریعہ بنتے بنتے رہ گئے جسے پوری قوم نے مسترد کر دیا تھا۔ خوف کے بہت سے روپ ہوتے ہیں اور بعض اوقات کچھ لوگوں کے لئے وہ اصولوں کا بہروپ بدل لیتے ہیں۔ چودھری انور عزیز اور سرتاج عزیز، میاں صاحب کے اس لئے خلاف تھے کہ وہ بی ڈی سسٹم کو دیہی ترقی کا زینہ قرار دے رہے تھے مگر اصل بات پیپلز پارٹی کا خوف تھا لیکن میاں نواز شریف نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ سو موجودہ نظام کے مطابق لوکل باڈیز

کے انتخابات کا اعلان ہو گیا۔

ان انتخابات کے لئے تمام سیاسی عناصر بشمول پی پی نے خوب تیاری شروع کر دی اور اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اپنے پارٹی جھنڈوں کے رنگوں کو اپنے امیدوار کی شناخت کا ذریعہ بنایا۔ مقامی حکومت اور محکمہ سپیشل برانچ نے یہ شہادتیں اس لئے اکٹھی کر لیں تا کہ "ناپسندیدہ" امیدواروں کو وقت ضرورت نابل کر کے انتخابی میدان سے باہر نکالا جا سکے۔ کئی امیدواروں کو بھی یہ بات بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس قانونی حربے کو آزمانے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملنے لگے۔ ہر طرف سے آواز اٹھی کہ فلاں فلاں کو نااہل قرار دیا جائے اور اس فلاں فلاں میں زیادہ تر پیپلز پارٹی کے لوگ تھے۔ مسلم لیگ کی مرکزی قیادت کی طرف سے بھی اس کے تقاضے بڑھنے لگے۔ درخواستوں اور حکم ناموں کے پلندے لگ گئے مگر میاں صاحب نے دخل اندازی کو مناسب نہ سمجھا کہ یوں ان الیکشنوں کی کریڈیبلٹی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اس فیصلہ پر پہنچنے کے لئے حاجی محمد اکرم کی صائب رائے کا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ یہ فیصلہ تو اچھا ہوا مگر میاں نواز شریف ایک دفعہ پھر الزامات کے نرغے میں تھے۔ اس وقت ان کے خلاف یہ الزام کہ وہ پیپلز پارٹی سے ملے ہوئے ہیں، دوبارہ بہت زور و شور سے ابھرا، حالانکہ وہ ایک سال قبل اس پارٹی کی بے وقت چلائی گئی تحریک کا نہایت سختی سے بھرکس نکال چکے تھے، مگر سیاسی مخالفوں کو اس سے کیا غرض، ان کی مطلب براری کا تقاضا یہی تھا اور وہ مسلم لیگ کے اندر ہی سے ان پر خوب کیچڑ اچھال رہے تھے۔

جوں جوں یہ انتخابات قریب آتے گئے خوف کے سائے بعض "مقتدر مقامات" پر لمبے ہوتے گئے اور وہ تھے جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمان کے وسوسے۔ یہ دونوں "عظیم" جرنیل خاص طور پر صرف اس کام کے لئے لاہور آئے اور بہت سے "ماہرین" کو اپنے ساتھ لائے۔ مجھ فقیر کو ان سب کی بریفنگ کرنا پڑی۔ میں نے بھی خوب تیاری کر رکھی تھی، ایک ایک ضلع، شہر بلکہ قریہ قریہ کے تفصیلی تخمینے تیار کر رکھے تھے جبکہ یہ حضرات محض عمومی اندازوں اور مفروضوں پر بھروسہ کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں حکومت پنجاب نے اس طرح لوکل باڈیز کے الیکشنوں کا اعلان کر کے بہت بڑا رسک لیا تھا جس سے نہ صرف پیپلز پارٹی فائدہ اٹھا سکتی تھی بلکہ اس میں ملک

کے اندر بڑے خون خراب کا بھی اندیشہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اس طرح تو ان کی آٹھ سالہ محنت جو انہوں نے پی پی کو ختم کرنے کے لئے کی تھی وہ بالکل رائیگاں چلی جائے گی۔" اس بات پر میاں صاحب بھی ذرا نروس ہو گئے مگر میں اپنی بات پر قائم رہا اور بہت زیادہ زور دیکر کہا کہ یہ تمام وسوسے بالکل بے بنیاد ہیں۔ خون خرابہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ انتخاب لوگوں کو اپنے اپنے حلقے میں نہ صرف مصروف رکھیں گے بلکہ تقسیم کر دینگے۔ خون بہانے والے ہجوم کہاں سے آجائیں گے۔ لوگ تو بکھرے ہوئے ہونگے۔ یہ بات نہ صرف لایعنی ہے بلکہ احمقانہ ہے۔ میں یہ سخت بات کہہ تو بیٹھا لیکن فوراً ہی ڈر گیا مگر جنرل ضیاء الحق نے اس کا ذرا بھی برا نہ منایا۔ یہ دیکھ کر میں نے اگلی بات بھی کہہ ڈالی کہ جناب والا پی پی کی پیٹھ تو ان الیکشنوں میں اچھی طرح ہارنے ہی سے زمین پر لگے گی۔ فوج کی ہار جیت جنگ میں ہوتی ہے تو سیاسی جماعت کی ہار جیت کا فیصلہ الیکشن کرتے ہیں۔ کوئی انتظامی کرتب کچھ نہیں کر سکتا۔ اب انہوں نے میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ شاید ان کے دل میں 1971ء کی جنگ کا نقشہ ابھر آیا ہو جس بدنامی کو ان کا آٹھ سالہ مارشل لاء بھی مٹا نہیں سکا تھا، پتہ نہیں ان کے دل میں کیا خیال آیا مگر انہوں نے اس کے بعد وہ میٹنگ یہ کہہ کر ختم کر دی کہ ان باتوں کا فیصلہ تو الیکشن والے دن ہی ہو گا۔ میں نے محسوس کیا کہ میاں صاحب کو میری یہ گستاخانہ گفتگو پسند نہیں آئی، مگر مجھے کہا کچھ نہیں۔ اب شاید یہ میرے اپنے اندر کا خوف تھا جو مجھے نروس کر رہا تھا۔ بلدیات کا وہ الیکشن ہو گیا تو سوائے پانچ جگہوں کے ہر جگہ مسلم لیگ کے لوگ بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ میں نے سوچا مجھے شاباش ملے گی مگر کسی نے بھی اس بارے میں سوچا تک نہیں۔ خیر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ لمبی سروس کی وجہ سے میں ان باتوں کا عادی تھا۔

اپنی محنت کا صلہ اہل قیادت سے نہ مانگ
مردے کبھی قبروں کی کھدائی نہیں دیتے

مسلم لیگ کے خدشے اور ضیاء الحق کے وسوسے سب بے بنیاد نکلے۔ خون خرابہ ہوا نہ پی پی جیتی۔ بلکہ پی پی کے اندر اس الیکشن سے ٹوٹ پھوٹ کا وہ عمل شروع ہو گیا جس کا خواب جنرل ضیاء الحق آٹھ سال سے دیکھ رہے

تھے۔ یہ ان الیکشنوں ہی کی برکت تھی کہ پی پی کے اندر سے معروف زمانہ چار کا ٹولہ ابھرا۔ راؤ رشید، ملک معراج خالد، سندھو اور میاں احسان جیسے جلیل القدر لوگ پیپلز پارٹی سے دست بردار ہو گئے۔

الیکشن تو ہو گئے مگر اب سیاسی جوڑ توڑ کا ایک اور گندہ کھیل شروع ہو گیا۔ اب محمد خان جونیجو کی خواہش تھی کہ ان کے چہیتے مختلف کارپوریشنوں، ضلع کونسلوں اور میونسپل کمیٹیوں کے سربراہ بنیں ادھر میاں نواز شریف اپنے لوگوں کو آگے لانا چاہتے تھے۔ وفاداریوں کا یہ عجیب وغریب کھیل ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے اس میں بھی میاں صاحب ہی کا پلہ بھاری رہنا تھا کیونکہ یہ مسئلہ کلی طور پر صوبائی تھا مگر اس کا غلیظ حصہ صوبائی اور ضلعی انتظامیہ کا بے دریغ استعمال تھا۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ میاں نواز شریف اسے جتوا دے۔ اس کے پاس ممبران کے ووٹ ہوں یا نہ ہوں۔ انتظامیہ کا بے محابہ استعمال لازماً رنجش ہی نہیں سیاسی غلاظت کا باعث بھی بن رہا تھا۔ ویسے ہماری یہ بیماری بہت پرانی ہے۔ ہماری سیاست کی خانہ خرابی کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔ 1987ء میں اس کی تیاری موجود تھی۔ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں اجلاس پر اجلاس ہو رہے تھے مجھے اور جناب انور زاہد (اس وقت کے چیف سیکرٹری) کو بھی بلایا جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم نے چیف منسٹر صاحب سے کہا کہ جناب والا جن لوگوں میں آپ یہ بندر بانٹ کرنا چاہتے ہیں وہ تمام کے تمام مسلم لیگی ہیں جو بھی جیتے گا وہ آپ ہی کا ہوگا۔ آپ کیوں غیر ضروری دخل اندازی سے بدنامی کما رہے ہیں۔ سب ہی آپ کے وفادار اور ورکر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ فطری طور پر بھی وہی لوگ اکثریت رکھتے ہوں جنہیں آپ اپنا زیادہ وفادار سمجھتے ہیں۔ آپ اس بات کا سروے کروالیں۔ جہاں جہاں آپ کے پسندیدہ لوگ خود بخود جیت رہے ہوں وہاں دخل نہ دیں اور کہیں کہیں حسب ضرورت مگر تھوڑا تھوڑا دخل دے لیں۔ میاں صاحب کو یہ بات اچھی لگی اور انہوں نے اس کا فیصلہ دے دیا مگر کمرے سے باہر نکلتے ہی ہم لوگوں کی شامت آ گئی۔ میاں صاحب کے بہت سے سیاسی ساتھیوں نے ناک میں دم کر دیا کہ ہاں! ہاں! آپ نے میاں صاحب کو ایمانداری اور شفاف الیکشن کی پٹی پڑھائی تو کیوں پڑھائی۔ اب ہمارا کیا بنے گا؟ ہمارے بہت سے دوست تو رہ جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو اپنے کام سے کام تھا انہیں حکومت یا جمہوری نظام کی نیک نامی یا

بدنامی سے کیا سروکار۔ یہ خود غرضی کی انتہا اور کوتاہ اندیشی کا کمال تھا مگر میاں نواز شریف پھر اس فیصلہ کے بعد اس پر ڈٹے رہے۔ چند جگہوں پر بے ضابطگی بھی ہوئی مگر تھوک کا کام رک گیا۔

اس سارے ڈرامے میں ہماری حیرانی کی اس وقت انتہا نہ رہی جب ایک دو کمشنروں نے ہماری عدم مداخلت کی پالیسی کی مخالفت کی۔ ہم نے کہا کہ آپ کی سہولت کے لئے ہی تو ہم نے یہ سب کچھ کیا ہے مگر آپ ہی معترض ہو رہے ہیں۔ نہایت آرام سے فرمانے لگے کہ "پھر ہماری کیا اہمیت رہ جائے گی"، "ہائے رے میری اہمیت" "ہائے رہے میری انا" "ہائے رے میرا اقتدار"۔ سیاسی لوگوں کو دیکھو اور ان بیوروکریٹس کو دیکھو کیا "خوبصورت" ذہنیت پائی ہے۔ ہم نے سوچا چلئے ان حالات میں میاں نواز شریف جیسا انسان بمعہ اپنے نقائص اور خوبیوں کے ہی غنیمت ہے کہ کچھ نہ کچھ تو سیاسی شائستگی کا خیال رکھا۔ جو وہ کر رہے تھے انگلینڈ کے مقابلہ میں شاید وہ بہت زیادہ برا تھا مگر ہمارے اپنے ماحول میں اتنا بھی کافی تھا۔ کچھ تو بہتری کی امید ہو رہی تھی۔

امید بہاراں پر تو قدغن نہ لگاؤ

آثار بہاراں تو نہ پہلے تھے نہ اب ہیں

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں بی بی سی نے اپنے ایک پروگرام میں انہیں شرافت کی سیاست کا مبتدی قرار دیا۔ ہمارے ہاں سیاست میں منتقم مزاجی کا عنصر بہت زیادہ ہے اور پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ میاں نواز شریف نے مروجہ انتظامی طریقوں سے ہٹ کر اس طرح کا سٹائل اپنایا تھا۔ ان کا اپنا پس منظر شہری تھا، کاروباری تھا لیکن جاگیردارانہ نہ تھا یا شاید ان کی ذاتی اور خاندانی روایت یہ تھی۔ بات جو بھی تھی میاں نواز شریف ہمارے سیاسی افق پر ہوا کے ایک تازے جھونکے کی طرح تازگی لے آئے اور ایک اچھی روایت قائم کر دی۔ عوام نے میاں محمد نواز شریف کو شرافت کی سیاست کا علمبردار قرار دیا۔ مخالفوں کے اغوا اور قتل کی روایت کو ختم کیا۔ جھوٹے مقدمات کی بھرمار کی قبیح روایت کو بدلا۔ اس کی بجائے اپنے ساتھیوں کو مثبت انداز میں نوازنے کا طریقہ اپنایا۔ شاید وہ بھی قابل اعتراض تھا مگر پہلے طور طریقوں سے بہت زیادہ شائستہ اور مہذب۔ اس وقت اور بعد میں بھی میاں نواز

شریف کتابی نہیں عملی مراحل سے گزر رہے تھے اور اس امتحان میں خاصے کامیاب نظر آئے۔ یہ ان ہی کا حوصلہ تھا۔ کتاب یا کالم لکھ لینا آسان ہے مگر عمل بہت دشوار ہوتا ہے۔ میاں نواز شریف عمل کے میدان میں خاصے کامیاب جا رہے تھے۔ یوں وہ ہر دلعزیز ہونا شروع ہو گئے۔ سیاست کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ملکی ترقیاتی پروگراموں سے کبھی توجہ نہیں ہٹاتے تھے۔ یہ ان کا خاص پیکیج تھا، پارکس بنوا رہے ہیں، نئے نئے جنگلات اور شجرکاری کروا رہے ہیں۔ سڑکوں کے جال بچھانے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں، دیہات میں کچے کھال پختہ ہو رہے ہیں، نئے سکول اور شفاخانے بن رہے ہیں۔ یوں انہوں نے ہماری سیاست کے مزاج کو ترقیاتی پروگراموں سے منسلک کر کے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں سڑکوں، شفاخانوں اور تعلیمی اداروں کی اجتماعی مانگ کو ابھارا۔ اب جہاں بھی وہ جاتے لوگ سڑکوں، پختہ نالیوں اور بجلی کا مطالبہ کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے دفتر، اسمبلی اور سیکرٹریٹ میں بھی ترقیاتی کاموں ہی کا ورد ہوتا۔ یوں انہوں نے ترقی کی راہوں پر پوری قوم ہی کو گامزن کر دیا وگرنہ ہماری جاگیردارانہ سیاست نے لوگوں کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا تھا بلکہ ایسی باتوں کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی تھی۔ یاد رکھئے جب لوگ اپنی بہتری کے تقاضے کرنے لگ جائیں تو ان کی اشتہاء بڑھتی ہی جاتی ہے، مطالبے زور پکڑتے جاتے ہیں اور پھر اسی نسبت سے معاشرتی بے چینی بھی بڑھتی ہے۔ زمیندار اسی لئے کمیوں کو اس طرف نہیں آنے دیتا اور انہیں ان کے اس ٹھکانے پر رکھتا ہے جس سے سماج میں ایک جمود طاری رہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں سکون بھی کہتے ہیں کیونکہ اس طرح تخلیقی عمل بند ہو جاتا ہے اور ہر طرح کی تکلیف اور احساس تکلیف بھی۔ میاں نواز شریف تبدیلی کے پیامبر بنے تو پھر ساتھ "تخلیق کی تکالیف" بھی لے کر آئے۔ خوشیوں کے ساتھ ساتھ بے چینیوں کو جگانے کا باعث بھی بنے اسی بات کو چینی دانشور لاؤ طی تخلیق و تبدیلی کا تکلیف دہ تحرک کہتا ہے اور جب یہی لوگ بے حرکت ہو کر سو جاتے ہیں تو ایک پرسکون غنودگی طاری ہو جاتی ہے مگر معاشرہ کی ترقی پھر رک کر رہ جاتی ہے۔ ترقی میں ہے تکلیف سراسر اور میاں نواز شریف اس بنیادی تبدیلی کا سبب بن رہے تھے۔ بھٹو بھی بنے مگر الفاظ کی حد تک اور میاں نواز شریف عمل کے میدان میں کود پڑے۔ الفاظ کم اور عمل زیادہ دکھانے لگے۔ وہ طبعاً ایک شرمیلے انسان

ہیں۔ وہ اپنے عمل کے فلسفہ کو بیان نہیں کر رہے تھے اور کر بھی نہیں سکتے تھے جو سرکاری مبلغ ہوتے ہیں وہ اس قسم کے بنیادی عمل کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ محض روٹین کا سرکاری پروپیگنڈہ کرتے رہے اور نواز شریف کا تعمیر و ترقی کا عمل تشنہ اظہار ہی رہا۔ یہ عمل زمین پر تو اپنے نقش چھوڑتا رہا مگر انسانی ارواح بانجھ ہی رہیں۔

نواز، جونیجو جھگڑا

محمد خان جونیجو وزیر اعظم پاکستان اور محمد نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کے مابین شرافت وشائستگی کے علاوہ اور کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ نواز شریف فعال اور مستعد تھے تو جونیجو سست گام۔ نواز شریف تیز گام تھے تو وہ پسنجر ٹرین۔ جونیجو روایت اور جمود کے آدمی تھی تو نواز شریف تبدیلی وتحریک کا پھریرا۔ جونیجو سٹیٹس کو پسند تھے تو نواز شریف تلاطم پسند مگر حالات نے دوران کو ایک ساتھ جوت دیا تھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے ہوشیار اور خائف تھے۔

جو کچھ میں نے پیچھے لکھا اسے ذرا ذہن میں لائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھ رہی تھی اور ارد گرد کے لوگ اس خلیج کو اور زیادہ وسعت دے رہے تھے۔ بے نظیر بھٹو کی آمد پر لوگوں نے نواز شریف پر نرمی کا الزام لگا کر سودے بازی تک کا طعنہ دیا۔ پرویز الٰہی والے معاملہ میں تو بات بہت زیادہ کھل کر سامنے آگئی حالانکہ جونیجو صاحب کے کہنے پر میاں نواز شریف نے چودھری صاحبان سے دوبارہ صلح کر لی تھی۔ لوکل باڈیز الیکشن نے اس خلیج کو بہت زیادہ وسیع کر دیا اور یوں دونوں کے درمیان ایک خاموش سرد جنگ شروع ہو

گئی۔

اس پس منظر میں 1988ء کے سینٹ الیکشن آ گئے اور یار لوگوں نے اسے جونیجو، نواز شریف دنگل کی شکل دیدی۔ اس انتخاب کے لئے بہت سے حضرات میدان میں کود پڑے۔ بڑے بڑے اشتہار اخباروں کی زینت بننے لگے۔ کوئی پیر پگاڑو کی گود میں جا بیٹھا اور کوئی کسی اور کی طرف دیکھنے لگا۔ افق پر کوئی قابل ذکر حزب اختلاف موجود ہی نہیں تھی۔ ہر طرف مسلم لیگ ہی مسلم لیگ تھی مگر لوگوں کا مزاج ابھی تک غیر جماعتی تھا اور وہ ایک دفعہ پھر 1985ء کے عمل کو دہرانے پر تلے ہوئے تھے۔ سارے ملک میں ممبران کے ووٹوں کا ایک نیلام گھر کھل گیا اور تجوریوں کے منہ بھی کھل گئے مگر پنجاب کی حد تک معاملات بہت سدھر چکے تھے۔ میاں نواز شریف کی وجہ سے یہاں کافی حد تک مسلم لیگ منظم ہو چکی تھی اور پارٹی ڈسپلن بہتر ہو گیا تھا۔ میاں نواز شریف نے جن امیدواروں کو چنا ان کے انتخاب کے لئے صوبائی ممبران کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنا کر ایک ایک صوبائی وزیر کو اس کا انچارج بنا دیا۔ چونکہ سب ممبر مسلم لیگی ہی کے تھے اب وہ اس سیاسی شکنجہ میں سے کیسے باہر نکل سکتے تھے۔ اس طرح ہر ایک کو پارٹی لائن پر ووٹ دینا پڑا اور اس بندوبست سے انتہا یہاں تک پہنچی کہ امیدوار بننے کے شائقین کو تجویز کنندہ اور تائید کنندہ تک نہ مل سکے اور نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں نواز شریف کے حمایت یافتہ تمام امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ دوسرے صوبوں میں بہت سے آزاد امیدوار اپنی دولت کے بل پر جیت کر مسلم لیگ کے لئے ندامت کا باعث بنے۔ اس بے مثال کامیابی نے اسلام آباد میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں اور حسد کے اژدہا نے منہ کھول دیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میاں صاحب کی اس کامیابی کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا مگر جونیجو صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اسے اپنے لئے خطرہ سمجھ لیا اور طرح طرح کی باتیں بنانا شروع کر دیں۔ جونیجو صاحب خود تو نہیں بولتے تھے مگر ان کے حوالے سے بولنے والے بہت تھے اور انہیں سے اکثر و بیشتر نے اسے میاں صاحب کی امارات کا کرشمہ گردانا، حالانکہ ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں یہ تو ایک علاقائی سیاسی بندوبست تھا مگر مخالفوں کو زاس سے کیا۔ بدخواہوں نے اسے بددیانتی اور ووٹوں کی خریداری کی شکل دیکر میاں صاحب کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ پی پی کو اللہ دے، اسے اور کیا چاہئے تھا

جب خود مسلم لیگ والے ایک صاف ستھرے عمل کو گندہ کھیل قرار دے رہے ہوں تو وہ کیوں پیچھے رہ جائیں۔ لہٰذا 1988ء کے سینٹ الیکشن کی کامیابی بھی نواز شریف کو اچھی طرح بدنام کرنے کے لئے استعمال کی گئی۔ جونیجو صاحب کو اور زیادہ بدظن کرنے کے لئے طاقتور نواز شریف کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا حالانکہ طاقتور نواز شریف جونیجو ہی کا مضبوط دست و بازو بن رہا تھا لیکن دوستوں نے اسے الٹا کر کے دکھایا جب بھی نواز شریف راولپنڈی جاتے اخبار والے انہیں سیرز، سیرز، یعنی قیصر روم لکھتے۔ اس طرح نواز شریف جونیجو جھگڑا شروع ہو گیا جس کا بعد میں جنرل ضیاء الحق نے خوب فائدہ اٹھایا۔

جن دنوں یہ معاملہ چل رہا تھا بابو قطب الدین ماہر علم نجوم جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے میرے پاس خاص طور پر لاہور آئے، فرماتے ہیں کہ اب جنرل ضیاء الحق کی خیر نہیں ہے۔ اس کے ستارے بہت زیادہ گردش میں آ گئے ہیں اب جو بھی وہ کام کرے گا، الٹا ہی پڑے گا۔ اس کا اقتدار اب ختم ہو جائے گا۔ میں نے بابو صاحب کی بات کا یقین نہ کیا اور اسے مذاق میں ٹالنے لگا مگر وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھے۔

کہتے ہیں تم اسے مذاق سمجھتے ہو۔ میں پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور تم ہنس رہے ہو اور مجھے تقریباً جھڑک کر رکھ دیا۔

تب بھی جب میں ہنستا رہا تو یکدم کہتے ہیں کہ بھئی 6 اگست کے بعد تو وہ مجھے زندہ بھی نظر نہیں آ رہے اور تم ہنس رہے ہو۔

اب میں سنجیدہ ہو گیا بلکہ پریشان بھی کیونکہ بابو قطب دین کی بہت سی پیش گوئیاں سچ نکلی تھیں۔

"اللہ نہ کرے کہ ضیاء الحق فوت ہوں، اس کے بعد تو نواز شریف بہت کمزور پڑ جائے گا۔ وہ بابو بھی ہمارا مہربان ہے، ہماری عزت کرتا ہے، ضیاء الحق کے بعد تو محمد خان جونیجو اسے ہڑپ کر جائے گا" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ سوچتے ہیں۔ ہمارا علم تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔ نواز شریف کے ستارے بہت اونچے اور مضبوط ہیں اس کا سیاسی مستقبل بہت درخشندہ ہے، نواز شریف کا پاکستان کی آئندہ سیاست میں بہت زیادہ اہم رول

ہے۔"

"نہیں بابو جی جونیجو تو اسے کچا ہی کھا جائے گا۔ یہ بھلا سا آدمی ہے۔ جنرل صاحب کی وجہ سے چل رہا ہے وگرنہ اسے سیاسی ہیرا پھیریاں نہیں آتیں۔ بھولے بھالے آدمی کا سیاست میں کہاں گزارا۔" میں نے کہا۔

"نہیں یہ آپ کی بھول ہے۔"

"ضیاء الحق چلا جائے گا مگر جونیجو تو بیٹھا ہی رہے گا۔"

"نہیں جونیجو بھی نہیں ہوگا۔" بابو نے کہا

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسمبلیاں موجود ہیں، کام کر رہی ہیں، یہ کام تو چلتا ہی رہے گا۔" میں نے کہا۔

"جواباً بابو جی بولے نہیں یہ سارے کا سارا ٹنٹا ہی مک جائے گا، کوئی اسمبلی، کوئی جونیجو، نواز شریف کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے وہ بہت طاقتور بن کر ابھرے گا۔" آپ دیکھئے گا ایک دن آئے گا کہ نواز شریف جنرل ضیاء الحق اور جونیجو دونوں فیملیوں کا سہارا بنے گا۔"

اب میں بابو جی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

29 مئی 1988ء کی شام یدم جنرل ضیاء الحق نے ملک کی تمام اسمبلیوں کو اپنے آٹھویں دستوری ترمیم کے حاصل شدہ اختیارات کے تحت ختم کر کے جونیجو حکومت کو چلتا کیا۔ پنجاب کی صوبائی اسمبلی بھی تحلیل کر دی مگر میاں نواز شریف کو ہی وہاں کا عبوری وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اس دن بلکہ اس لمحہ بابو قطب دین کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔

ہوا یوں کہ 3 اپریل 1988ء کو فوج کے اوجڑی کیمپ راولپنڈی میں رکھے ہوئے اسلحہ بارود کو آگ لگ گئی۔ افغان مجاہدین کے لئے وہاں بہت زیادہ جدید اسلحہ رکھا جاتا تھا جس میں جدید ترین میزائل بھی تھے اور سکیورٹی کا وہاں کوئی اچھا بندوبست نہیں تھا۔ اوجڑی کیمپ پہلے تو شہر سے باہر تھا مگر بعد میں وہ راولپنڈی اور اسلام آباد کے عین وسط میں آ گیا۔ اس حادثہ میں 100 سے زیادہ شہری ہلاک ہو گئے بہت زیادہ زخمی ہوئے اور لاتعداد

دکانیں اور مکان مسمار ہو گئے۔ اس المناک حادثہ پر پاکستان بھر میں بہت زیادہ شور مچا۔ کوئی جنرل ضیاء الحق کو اس کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا اور کوئی جنرل اختر عبدالرحمان کو۔ جنرل حمید گل اس وقت آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور اوجڑی کیمپ کا یہ معاملہ ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ وہ بھی تنقید کا نشانہ بنے۔ لولی لنگڑی جمہوریت کی برکت سے اخبارات بہت حد تک آزاد ہو چکے تھے۔ اس حادثہ کا خوب چرچا ہوا اور لوگ ان جرنیلوں کی سزایابی کا مطالبہ کر رہے تھے لہٰذا محمد خان جونیجو کو رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا اور انہوں نے تین وفاقی وزراء پر مبنی ایک انکوائری ٹیم تشکیل دیدی اور اعلان کیا کہ انکوائری رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے رکھی جائے گی۔ اس بات پر جنرل ضیاء الحق بہت زیادہ برہم ہو گئے۔ انہوں نے بلا شرکت غیرے اتنی دیر حکومت یک تھی ان کا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اب وہ اپنی ہی تخلیق کردہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے وہ تو حکم دینے کے عادی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ متعلقہ ذمہ دار جرنیلوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مشہور کر دیا گ کہ محمد خان جونیجو اب پارلیمنٹ کے ذریعے ان جرنیلوں کو چلتا کریں گے..... اور جنرل ضیاء الحق نے 29 مئی کی شام وہ پارلیمنٹ ہی توڑ ڈالی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری اور میری آنکھوں کے سامنے بابو قطب الدین کی تصویر لہرا گئی۔

پارلیمنٹ کی قربانی کی ایک وجہ جنیوا معاہدہ بھی تھا جس کے مطابق روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی کی صورت بن گئی تھی۔ امریکہ روس کی پسپائی چاہتا تھا وہ ہو گئی مگر افغانستان میں حکومت کون کرے گا وہ معاملہ طے نہ ہوا۔ ضیاء الحق چاہتے تھے کہ ساتھ ہی ان کا فارمولا بھی طے ہو جائے وگرنہ وہاں سول وار ہو جائے گی مگر امریکہ کو اس سے سروکار نہیں تھا اس نے اپنا کام نکال لیا تھا اور روس کو وہ واپسی کی گنجائش دینا چاہتا تھا۔ محمد خان جونیجو اس امریکی چال کو سمجھ نہ سکے۔ انہوں نے معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور ضیاء الحق سے پوچھا تک نہیں جنہوں نے اتنی دیر افغانستان کی جنگ لڑی تھی۔ معاملے کو جونیجو سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس لئے جب اوجڑی کیمپ والا معاملہ ہوا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا اپنا نامزد کردہ وزیر اعظم یہ شرارت بھی کر ہی گزرے گا۔ یوں بقول بابو قطب وہ سارا ناٹک گیا جس کی بنیاد پر جونیجو صاحب کا اقتدار قائم تھا لیکن نواز شریف کا اقتدار پھر بھی قائم رہا۔

جنرل ضیاء الحق نے اسمبلیاں توڑتے ہوئے اس کی ایک وجہ ان اسمبلیوں کی نفاذ اسلام میں ناکامی کو بھی قرار دیا۔ یعنی جو کام وہ اپنے بلاشرکت غیرے اقتدار میں نہیں کر سکے اسے اسمبلیوں کی نااہلی قرار دے دیا۔ اسے کہتے ہیں شیر جب چاہے انڈے دیتا ہے اور جب چاہے بچے دیتا ہے۔ بہرصورت جنرل ضیاء الحق اب صدارتی نظام کا سوچنے لگے کہ پاکستان میں چونکہ پارلیمانی نظام ناکام ہو چکا ہے اس لئے اب اسے واپس لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے حالانکہ اس تجربے کو ابھی تین سال بھی نہیں ہوئے تھے اور اس میں بھی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر والا معاملہ تھا۔ انگلینڈ جیسے ملک میں جمہوریت کی آبیاری کے لئے صدیاں لگی تھیں اور یہاں کے جرنیل بس دن گن رہے تھے۔ ہمارے ہاں جمہوریت کو آپ جب چاہیں کوئی بھی جھوٹا سچا الزام لگا کر رخصت کر سکتے ہیں بلکہ ہمارے جرنیل تو برطانیہ کی جمہوریت میں بھی ہزار نقص نکال سکتے ہیں بس موقع ہی نہیں ملتا۔

29 مئی کے کچھ دنوں بعد جنرل صاحب نے 16 نومبر کو غیر جماعتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ مقصد تھا کہ اب ایک دفعہ پھر اپنی مرضی کی پارلیمنٹ لا کر اس سے دستور میں مطلوبہ ترامیم کرا کر صدارتی نظام لایا جائے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جنرل صاحب نے پہلے بھی غیر جماعتی انتخابات کروائے تھے لیکن ان کے بعد کاروبار حکومت چلانے کیلئے انہیں جماعت تشکیل دینا پڑی اس کے باوجود اب پھر وہ غیر جماعتی صورت پر واپس آ گئے۔ کس قاعدے قانون اور دستور کے تحت؟

اپنی مرضی و منشا کے تحت؟

جب چاہا پارٹی بنالی اور جب چاہا ختم کر دی۔

جب چاہا پارلیمانی نظام کو اسلام کہہ لیا اور جب چاہا صدارتی نظام کو اسلامی لبادہ پہنا دیا۔ بہرصورت انہیں صدارتی نظام میں زیادہ آسانی اور اقتدار نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں وہ خود ہی صدر تھے۔

اس صورتحال سے قطع نظر میاں نواز شریف اپنی قوت مجتمع کر رہے تھے اور اپنی وزارت اعلیٰ کے اختیارات کا خوب سیاسی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے پیپلز پارٹی کے چار کے ٹولہ کو بھی قریب کر لیا اور غلام

مصطفیٰ جتوئی سے بھی تعلقات بڑھا لئے تا کہ سندھی محمد خان جونیجو کی جگہ سندھ ہی کے بھاری بھرکم سیاستدان کو لایا جائے۔ جتوئی صاحب مسلم لیگ میں تو شامل نہ ہوئے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے اپنی این پی پی قائم رکھی مگر نواز شریف انہیں قریب لے آئے اور جنرل ضیاء الحق سے ان کی ملاقات بھی کروادی۔ میں نے دیکھا کہ نواز شریف اپنے سیاسی کارڈ بہت عمدہ کھیل رہے تھے۔ ظاہراً وہ کوئی چالاک شخص نظر نہیں آتے تھے اور تھے بھی نہیں، مگر اپنی چالیں خوب چلتے تھے اور جب مسلم لیگ کی صدارت پر جونیجو صاحب سے اختلاف کھل کر سامنے آگیا تو پھر جتوئی کارڈ بہت کام آیا۔ جونیجو صاحب کو صدارت سے ہٹانے کی مصلحت کچھ اس طرح کی تھی جیسی کہ آج کل نواز شریف کی حکومت کی برخواستگی کے بعد سامنے آئی ہے۔ کہتے ہیں کہ تاریخ ضرور اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر اب کردار ذرا مختلف ہیں۔ جونیجو کی جگہ نواز شریف ہے اور ضیاء الحق کی جگہ جنرل پرویز مشرف۔ اس وقت کے نواز شریف کی جگہ ضیاء الحق کا بیٹا اعجاز الحق کھڑا ہے مگر اس صورت میں جو کچھ نواز شریف نے کر دکھایا وہ اعجاز الحق کے بس کی بات نظر نہیں آرہی اور ہی ضیاء الحق کی جگہ جنرل مشرف پر کر سکے ہیں۔ نواز شریف نے اپنی سیاست صرف دولت کے بل بوتے پر نہیں چلائی۔ یہ لوگوں کی خام خیالی ہے۔ انہوں نے اس میدان میں شروع ہی سے بہت محنت کی ہے اور اپنے کارڈ عقل سے کھیلے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ لوگوں نے انہیں ہمیشہ UNDERSESTIMAT کیا ہے اور اس سے خوب مار کھائی ہے۔ بینظیر نے نتیجہ ہی ایک اخذ کیا کہ نواز شریف نے روپے پیسے کی سیاست کی ہے حالانکہ یہ سراسر غلط بات ہے۔ وہ دولت مند ضرور ہیں بلکہ ان کے والد دولت مند ہیں مگر ان کی سیاست میں اور بہت سے عوامل بھی داخل ہیں۔ بے نظیر نے تو اس بات پر اس حد تک یقین کر لیا کہ دونوں دفعہ اقتدار میں آکر دولت بنانے پر زور لگایا۔ شاید یہی اب راہ سیاست رہ گئی ہے نتیجتاً اپنی سیاست کا بیڑا غرق کر لیا۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ نواز شریف کی کامیابی کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ ان کی محنت، خلوص اور شائستگی تھی اور ہے مگر بھٹکوں کو کون سمجھا لکتا ہے۔ ہاں نواز شریف کی بدنامی کی صورتیں ضرور نکلیں۔ جونیجو نے نواز شریف کے خلاف بہت انکوائریاں کیں اور بینظیر نے تو انتہا ہی کر دی مگر کچھ بھی

نہ ملا تو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق کہنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ بہت چالاک ہیں مگر کبھی یہ احساس نہ کیا کہ لوگوں کا جائز طریقوں سے بھی امیر ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ 1937ء میں یہ لوگ کون سے اقتدار میں تھے بلکہ اس وقت تو مزدور تھے اور بینظیر کے باپ کے اقتدار میں آنے تک بغیر کسی سیاست کے وہ پاکستان کے متمول ترین 22 خاندانوں میں آ چکے تھے۔ اسے کہتے ہیں میں نہ مانوں، اب پھر نواز شریف کا امتحان ہے دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

9 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق لاہور تشریف لائے اور اس فقیر کو کہا گیا کہ آنے والے الیکشنوں پر صدر صاحب کی بریفنگ کریں جو میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تک کی۔ مجھے اشارہ ملا تھا کہ میں صدارتی نظام کی حمایت بھی کروں مگر میں اپنی سوچ کے خلاف نہ جا سکا۔ میں نے ضیاء الحق کے سامنے کہا کہ جناب والا یہ بالکل مت کریں جو نظام آپ نے خود دے رکھا ہے اسے ہی چلنے دیں۔ سب نے غیر جماعتی الیکشن تسلیم کر لئے ہیں اس میں آپ کی جیت ہے۔ اگر پی پی بائیکاٹ کر دیتی یا دستوری نکتہ دانی پر اتر آتی تو آپ کے لئے مشکل پیدا ہو جاتی۔ میں نے انہیں یہ بھی عرض کیا کہ بھٹو صاحب بھی تختہ دار پر اس لئے چڑھ گئے کہ جتنا ملا تھا بجائے اس کے کہ اس پر صبر شکر کرتے وہ بے محابہ اختیارات کی ہوس کا شکار ہو کر اس سے بھی گئے۔ وہ بھی صدارتی نظام اپنی لامحدود اختیارات کی تسکین کے لئے چاہتے تھے مگر اس کے بجائے پھانسی چڑھ گئے۔ حد سے بڑھی ہوئی حرص جناب صدر حادثہ بن جاتی ہے۔ آپ اس سے گریز کریں، وہ مان گئے اور اس بات کا اعلان بھی کر دیا مگر حادثہ نے انہیں آلیا اور 17 اگست 1988ء کو وہ بہاولپور کریش میں فنا ہو گئے اور ساتھ ہی ان کی حرص اقتدار بھی۔ شاید نواز شریف بھی اس دفعہ اسی حرص کا شکار ہو کر جیل جا پہنچا ہے۔ مگر آدمی اچھا ہے، وہ بھولا بھالا سا شریف آدمی ہے مگر اقتدار کی لت بری بلا ہے۔ وہ بے ایمان نہیں اقتدار و جاہ پسند ضرور ہے اور وہی اس کے لئے مشکل بن گئی ہے۔ شاید وہ اس دفعہ بھی سچ پر ہوا۔ اگر ایسی بات ہے تو اللہ اس کا ضرور ساتھ دے گا اور اس کا ماضی اس طرح کی گواہی دیتا ہے۔

نیا دور

اب تک تو نواز شریف جنرل ضیاء الحق کے سائے تلے ایک شاگرد کی طرح چل رہے تھے۔ انہیں سیاسی چیلنج ضرورت تھے مگر ایک سہارا بھی موجود تھے وہ صورتحال اب یکسر بدل گئی۔ جونیجو صاحب سے پہلے ہی اختلاف نے راستے علیحدہ کر دیئے تھے اور اب جنرل صاحب بھی چلتے بنے۔ اب وہ تھے اور بینظیر بھٹو، پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی۔ اب نواز شریف کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کے حادثہ کے وقت نواز شریف کوہ مری میں تھے۔ اطلاع ملتے ہی راولپنڈی چل دیئے۔ انور زاہد چیف سیکرٹری پنجاب سے تمام حالات معلوم کئے۔ اس حادثہ کے بعد صدر کی کرسی خالی ہوگئی۔ اسمبلیاں پہلے ہی برخواست ہو چکی تھیں اس لئے ملک میں یکدم اقتدار کا ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ ویسے بھی جنرل ضیاء الحق گیارہ سال سے پاکستان کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھٹو جیسے بڑے انسان کو پھانسی لگائی تھی اور افغانستان کی جنگ میں زبردست کردار ادا کیا تھا لہٰذا ان کی موت ایک بڑا سانحہ بن کر بہت بڑا خلا پیدا کر گئی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے اب ذرا دوسری قسم کی آندھی چلنے والی تھی۔

غلام اسحاق خان اس وقت سینٹ کے چیئرمین تھے لہٰذا دستور کے مطابق عارضی طور پر صدارتی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آن پڑی۔ غلام اسحاق خان پاکستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ تجربہ کار بیوروکریٹ تھے اور انہوں نے پاکستان کے تمام اہم عہدوں پر کام کر کے تمام کاروبار سلطنت کو خوب دیکھ رکھا تھا۔ وہ کیبنٹ سیکرٹری رہے، واپڈا کے چیئرمین رہے، سٹیٹ بنک کے گورنر رہ چکے تھے، ڈیفنس سیکرٹری، فنانس سیکرٹری اور پھر سیکرٹری جنرل کہ ہر قسم کا تجربہ انہیں حاصل تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے خلا کو وہ پر تو نہیں کر سکتے تھے مگر معاملات کو سنبھال سکتے تھے، سو سنبھال لیا۔ جنرل اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف تھے۔ وہ بہاولپور کے حادثہ کے وقت وہیں تھے اور وہاں رکے بغیر وہ راولپنڈی پہنچ گئے۔ اس وجہ سے مشہور ہو گیا کہ اس حادثہ میں ان کا ہاتھ ہے لہٰذا وہ مارشل لاء لگانے سے گھبرا گئے وگرنہ شاید ملک میں مارشل لاء نافذ ہو جاتا۔ اس طرح جمہوری تجربہ بال بال بچ گیا اور نواز شریف کے لئے اللہ نے نیا سیاسی افق وا کر دیا۔

اس حادثہ کے بعد جو مسلم لیگی نواز شریف کے ساتھ تھے وہ سب راولپنڈی اور اسلام آباد میں اکٹھے ہو گئے تاکہ جنرل صاحب کی تجہیز و تکفین میں حصہ لے سکیں اور امور مملکت بھی طے کر سکیں۔ نواز شریف چونکہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اس لئے زیادہ تر لوگ انہی کے ساتھ نتھی ہو گئے تھے جبکہ حامد ناصر چٹھہ اور شجاعت حسین وغیرہ جونیجو صاحب کے ساتھ تھے۔ تین دن تک یہ لوگ راولپنڈی میں موجود رہے اور ہر وقت نواز شریف کے گرد جھگھٹا لگا رہتا تھا۔ اکثریت کی رائے تھی کہ جنرل ضیاء الحق مسلم لیگ کے لئے ایک بوجھ تھے اور اب وقت ہے کہ اس سیاسی بوجھ کو اتار پھینکا جائے وگرنہ آئندہ الیکشن میں ان کی جماعت کو نقصان ہو گا۔ نواز شریف تین دن تک یہ باتیں سنتے رہے اور آخر میں اعلان کیا کہ نہیں، وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ جنرل صاحب تو ان کے مہربان تھے، وہ اپنے محسن سے اس طرح منہ نہیں موڑ سکتے۔ یہ بری بات ہے۔ سیاست جائے بھاڑ میں، میں جنرل ضیاء الحق کے اسلامی مشن کو جاری رکھوں گا اور اس کا بانگ دہل اعلان کروں گا جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں وہ ساتھ دیں جو نہیں دینا چاہتے وہ آزاد ہیں، وہ اپنی سیاست کریں۔ ہم نے دیکھا کہ نواز شریف مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے

اخلاقی اصول نہیں چھوڑتے تھے، یاد رکھئے اس وقت تک جنرل ضیاء الحق کی شخصیت کا سحر ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی لوگ گومگو کی حالت میں تھے بہت سے لوگ ان کی مارشل لائی سختیوں اور زیادتیوں کو ابھی نہیں بھولے تھے۔ نواز شریف نے یہ فیصلہ صرف اور صرف اصولوں کی بنیاد پر کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اس فیصلہ سے انہیں بعد میں سیاسی فائدہ بھی ہوا۔

غلام اسحاق خان کی نئی حکومت نے فیصلہ کیا کہ تمام معاملات جنرل ضیاء الحق کے فیصلوں کے مطابق چلیں گے اور اعلان شدہ 16 نومبر کے الیکشن مقررہ وقت پر کرائے جائیں گے۔ انہوں نے امور مملکت چلانے کے لئے ایک سکیورٹی کونسل بھی بنادی۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ چونکہ جنرل ضیاء الحق نے کوئی عبوری وزیر اعظم نہیں بنایا تھا اس لئے وہ بھی ایسا نہیں کریں گے حالانکہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو عبوری وزیر اعظم بنانے کے لئے جنرل اسلم بیگ اور میاں نواز شریف نے زور دیا تا کہ عبوری انتظامیہ میں سندھی نمائندگی ہو سکے کیونکہ جنرل ضیاء الحق بھی انہی سطور پر سوچ رہے تھے مگر غلام اسحاق خان نہیں مانے۔

اس نئی سیاسی صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نواز شریف نے لنگر لنگوٹ کس لیا اور اپنی تمام تر ذاتی اور سرکاری قوت اس بات پر لگادی کہ پیپلز پارٹی نہ جیت سکے اور ان کی اپنی جماعت مسلم لیگ جیت جائے۔ اس کام کے لئے انہوں نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے محمد خان جونیجو کو گلے لگایا اور اپنے تمام پرانے اختلافات بھول کر جونیجو صاحب کو دوبارہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنایا۔

اس دوران وہ مصطفیٰ جتوئی اور جماعت اسلامی سے بھی بہت قریب ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ اکٹھے مل کر الیکشن لڑنے کا سوچ رہے تھے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جونیجو کی سخت سیاسی رقابت تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل نہیں چل سکتے تھے۔ پاکستان آرمی بھی جونیجو صاحب کے خلاف تھی کیونکہ انہوں نے جنیوا معاہدہ اس کی سوچ کے خلاف کیا تھا۔ ان حالات میں فوج کو خلاف کر لینا بھی کوئی قرین مصلحت نہیں تھا مگر نواز شریف نے کمال فراست اور تحمل سے کام لے کر ان تمام عناصر کو ساتھ ملا لیا۔ آج آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کام کتنا

دشوار اور صبر طلب تھا مگر نواز شریف کی دور رس نگاہ آنے والے سیاسی خطرے کو بھانپ چکی تھی اور وہ ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ نواز شریف کے علاوہ باقی سب لوگ اپنے اپنے محدود دائروں میں سوچ رہے تھے اور ایک دفعہ پھر 1970ء کا تماشا کرنے کو تھے۔ نواز شریف بار بار کہتے کہ اگر پیپلز پارٹی مخالف ووٹ بٹ گیا تو پھر بینظیر اتنی بڑی اکثریت سے جیتے گی کہ پاکستان کی فوج بھی کچھ نہیں کر سکے گی اور وہ ہر ایک سے چن چن کر بدلہ لے گی۔ فوج کو بھی نہیں بخشے گی۔ پیپلز پارٹی کا ٹریک ریکارڈ پہلے بھی کوئی اتنا اچھا نہیں ہے مگر اب تو وہ مزید تلخ ہو کر واپس آئے گی اور اگر کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں ہوگا تو پھر یہ ملک کے لئے اچھا شگون نہیں ہوگا اور وہ رکاوٹ فوج کی بجائے سیاسی ہونی چاہئے۔ میں نے محسوس کیا کہ جرنیلوں کی گود سے اٹھنے والا نواز شریف اس وقت تک سیاسی اور فکری طور پر بہت زیادہ بالغ نظر ہو چکا تھا اور محمد خان جونیجو اپنی مقامی رقابت سے اوپر نہیں اٹھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ پیر صاحب پگاڑا کو سنبھالنا بھی اسکا سر درد تھا۔ اب وہ جونیجو کے خلاف زہر کھائے بیٹھا تھا۔ جتوئی کو ویسے ہی پسند نہیں کرتا تھا اور نواز شریف سے دشمنی پال رہا تھا۔ نواز شریف نے جتوئی صاحب کے ذریعہ انہیں بھی رام کر لیا اور بعد میں خود پیر صاحب کے ہاں حاضر ہو گئے۔ پیر صاحب ذاتی حصار سے باہر نہیں نکل رہے تھے وہ پیپلز پارٹی کے اندھے طوفان کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان سب ''بڑے'' لوگوں کو یکجا کرنے کا سہرا ''نادان'' نوجوان نواز شریف کے سر تھا۔ مگر نام پھر بھی ان ہی کا بڑا تھا کیونکہ نواز شریف کی تربیت بڑوں کی عزت کرنا تھی اور اس نے وہ تاثر قائم رکھا۔

ان اقدامات کے باوجود ابھی تک ان لوگوں کی سیاسی حیثیت مستحکم نہیں تھی اور وہ طوفان کے سامنے تنکے نظر آ رہے تھے لہٰذا ان سب کی مدد جنرل حمید گل نے کی اور بہت سی جماعتوں کو اکٹھا کر کے ایک انتخابی تنظیم میں پرو دیا۔ کوشش تو پہلے سے ہی ہو رہی تھی مگر حمید گل کی مداخلت سے تمام معاملات دو دن کے اندر اندر طے ہو گئے اور اسلامی جمہوری اتحاد یعنی IJI کے نام سے ایک الائنس معرض وجود میں آ گیا جس کا ایک منشور، ایک جھنڈا اور ایک ہی نشان راتوں رات بن گیا۔ یوں پیپلز پارٹی مخالف قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئیں۔ اسلامی اتحاد کی تخلیق

تنظیم میں جماعت اسلامی کی انتظامی صلاحیت نے بہت کام دکھایا۔ اس کے نظریاتی ورکرز نے پورے ملک میں اس نئی تنظیم کو متعارف کروادیا۔ مسلم لیگ یک طرف سے نواز شریف کے اقتدار نے اسے قوت بخش دی اور یوں جمہوری اتحاد پیپلز پارٹی کا ہم پلہ بن گیا۔ اب یہ سیاسی کھیل یکطرفہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس سارے کھیل میں نواز شریف کا رول سب سے نمایاں تھا اور ملک مارشل لاء کی مصیبتوں سے بچتا نظر آرہا تھا۔

ان انتخابات کی تیاری میں نواز شریف نے ترقیاتی فنڈز کو بڑی مہارت سے استعمال کیا چونکہ وہ پنجاب کے چیف منسٹر تھے اس لئے انہوں نے پاکستان مسلم لیگ کے امیدواروں کو اپنے اپنے علاقوں میں سکول، کالج، ڈسپنسریاں اور سڑکیں بنوانے کے لئے خوف فنڈز دیئے۔ اس وقت تک ووٹر ترقی آشنا ہو چکے تھے اور وہ محض کھوکھلے نعروں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ اپنا طلسم کھو بیٹھا تھا اور لوگ عملی کام چاہتے تھے اور عمل کے حوالے سے نواز شریف کا ریکارڈ بہت عمدہ تھا۔ یوں اکثر جگہوں پر مسلم لیگ اور پی پی کی پوزیشن برابر نظر آنے لگی۔ جیت ہار کا فرق جماعت اسلامی کے نظریاتی ووٹ نے ڈالا۔ شہروں میں جماعت کے ووٹ زیادہ تھا اور اکثر شہروں سے آئی جے آئی کی جیت کے آثار زیادہ نامودار ہو گئے چونکہ شہر ہمیشہ دیہات کے رجحان کو متاثر کرتا ہے اس لئے اس کا اظہار وہاں بھی ہونے لگا۔ نواز شریف کے لئے زیادہ جلسے کرنا بھی آسان تھا کیونکہ انہیں چیف منسٹرک تمام سہولتیں میسر تھیں لہٰذا وہ پنجاب کی حد تک پی پی اور بینظیر کے مقابلہ میں زیادہ VISIBLE ہو گئے بلکہ چھا گئے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن کی مدد بھی اسے حاصل تھی۔ اس لئے آئی جے آئی کو پی پی پر سبقت مل گئی۔ ان طور طریقوں پر ایک مثالی جمہوری معاشرہ میں سخت اعتراض ہو سکتا ہے مگر ہمارے زمینی حالات انگلینڈ اور امریکہ سے ابھی مختلف تھے اور اب تک ہیں۔ ہمارا موازنہ ہماری اپنی تاریخ اور پیمانوں سے ہی ہو سکتا ہے۔ 1977ء میں ہم نے جعلی پرچیاں ڈلوا کر دھاندلی کی تھی اور پھر جمہوریت سے منہ موڑ کر مارشل لاء کی پرستش کی تھی۔ اس دفعہ مارشل لاء کو رخصت ہوئے ابھی تین سال بھی نہیں ہوئے تھے اس لئے ان روایات کی بات کرنا جنہیں ترتیب پانے میں تین سو سال لگے تھے کوئی زیادہ عقل کی بات نہیں ہے اور ہی اصول کی، کچھ اصول

ضرور اٹل ہوتے ہیں مگر زیادہ تر اصولوں کی آبیاری وقت کرتا اور اسے عرف عام میں تہذیب گری کہتے ہیں جس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ بہر صورت نواز شریف کا طریقہ بھٹو کے طریقہ سے زیادہ بہتر تھا۔

الیکشن ہوئے تو آئی جے آئی اور پی پی نے پنجاب کی حد تک برابر سیٹیں حاصل کیں تین دن بعد صوبائی الیکشن ہوئے تو پنجاب میں مسلم لیگ نے پی پی سے دو زیادہ سیٹیں حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ 33 آزاد امیدوار منتخب ہو گئے اور یوں پاکستان مسلم لیگ پنجاب کی حد تک جیت گئی۔ سندھ سے دو قوتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ اندرون سندھ میں مکمل طور پر پی پی کی جیت ہوئی اور کراچی حیدر آباد سے ایم کیو ایم ابھر کر آ گئی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جونیجو اپنی اپنی سیٹیں ہار گئے بلکہ بہت بری طرح سے ہارے۔ سرحد میں پی پی کا پلڑا بھاری رہا اور بلوچستان میں حسب دستور قبائلی سردار جیت گئے۔ سندھ سے مسلم لیگ مکمل طور پر ہار گئی اور سرحد سے بھی کوئی اچھی کارکردگی سامنے نہ آ سکی بلکہ جنرل فضل حق وزیر اعلیٰ فرنٹیئر خود اپنی سیٹ بھی نہ جیت سکے۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق کے دور کے بعد میاں نواز شریف وہ واحد سیاسی سپوت تھے جو پی پی کے طوفان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت اور محنت کا پھل تھا جس کی آبیاری وہ پچھلے تین سال سے کر رہے تھے مگر ان کے مخالفوں نے اسے ان کی دولت کا کرشمہ قرار دیکر ان کی تکذیب کرنے کی کوشش کی اور مشہور کر دیا کہ انہوں نے یہ کامیابی دولت سے خریدی ہے اور بہت سے ضعیف الاعتقاد نام نہاد دانشور اور صحافی ایسی بے پر کی باتوں پر یقین کرنے لگ گئے۔ اصل میں ہمارے اکثر صحافی زمینی حقائق کو کم ہی دیکھتے ہیں اور خود اپنے ہی پیدا کردہ پروپیگنڈہ پر یقین کرنا شروع کر دیتے ہیں اس میں مزید مرچ مصالحہ متعلقہ سیاسی مخالفین بھر دیتے ہیں اور پھر غیر اخلاقی الزامات کا ایک ایسا سماں پیدا ہو جاتا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا، یا کم از کم کون کم جھوٹا ہے اور کون زیادہ۔ اسے کہتے ہیں گڈ مڈ کی سیاست جسے ہمارے ہاں بنیادی طور پر جرنیلوں نے جنم دیا کیونکہ ان کی تربیت ہی اس سٹرٹیجی کی ہوتی ہے کہ دشمن کو دھوکے سے مارو اور سیاست میں دشمن مخالفین ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ان کے پیروکار، ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیاست کو شیوہ پیغمبری سے گرا کر شعبدہ بازی میں

بدل دیتے ہیں اور جب الزامات خوب جڑ پکڑ جاتے ہیں تو یکدم شب خون مارتے ہیں اور مارشل لاء کے ذریعہ بچی جمہوریت کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں حالانکہ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ببول (کیکر) پر آم کا پھل لگانا۔ جمہوریت عشق کا نام ہے اور عشق ہمیشہ صبر طلب ہوتا ہے جبکہ لمحہ سلاسل سرعت وشرارت کا شرارہ۔ دراصل ہم بہت سی باتوں میں مستعار معیاروں کے مارے ہوئے ہیں اور اپنی حقیقتوں کے اندر جھانک کر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔

1988ء کے انتخابات کے نتیجہ میں وفاقی سطح پر پی پی کا پلڑا بھاری تھا اور پنجاب میں مسلم لیگ کا پلڑا بھاری تھا۔ کچھ لوگ آزاد بھی تھے، حکمرانی کا فیصلہ اب ایم کیو ایم کے ہاتھ میں تھا۔ قاضی حسین احمد، بریگیڈیئر امتیاز اور نواز شریف نے کافی حد تک ایم کیو ایم کو اپنی طرف مائل کر لیا اور مولانا فضل الرحمٰن کو بھی۔ اکبر بگٹی بھی ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح کوشش ہوئی کہ ان سب کو اکٹھا کر کے نواز شریف کی سربراہی میں مرکزی میں حکومت تشکیل دیدی جائے۔ اس طرح تین یا پانچ ووٹوں کی اکثریت سے یہ کمزوری حکومت بنتی جس کا مقصد پی پی کو باہر رکھنا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر امتیاز سے اس بے تکی ترتیب کی کمزوری پر بات کی تو فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ حکومت بن تو جائے پھر دیکھا جائے گا، ضرورت پڑی تو وزیر اعظم اسمبلی کو تحلیل کر کے ایک دفعہ پھر الیکشن کروا دے گا''

مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ یہ کیسی مریضانہ سوچ ہے۔ دراصل فوجی ذہن سیاسی مضمرات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ صرف جوڑ توڑ ہی سوچ سکتا ہے، اس جوڑ توڑ نے تو ملک توڑ دیا تھا۔ اصلی سیاستدان انسانوں کے دلوں کو ٹٹولتے ہیں تو فوجی سیاستدان محض کاغذی نقشوں پر انحصار کرتے ہیں اب تو یہ جنگ بھی زیادہ تر نقشوں پر ہی لڑتے ہیں۔

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

فوجی راجوں سے اٹھنے والے سیاستدان بھی شاید اس لئے اس طرح کی حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں وگرنہ قائداعظم اور ان کے پیروکار تو ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے جناب انور زاہد سے یہ بات جا کر کہی کہ اس طرح کا نقشہ بن رہا ہے، اگر ایسا ہوا تو اندرون سندھ جس نے اتنا بھرپور مینڈیٹ بینظیر کو دیا ہے وہ غم وغصہ سے پھٹ اٹھے گا اور ایک دفعہ پھر مشرقی پاکستان جیسے حالات ہو جائیں گے۔ کوئی ٹرین یا سواری ادھر سے پنجاب نہیں آسکے گی اور ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا آپ نواز شریف سے بات کریں کہ وہ ابھی پنجاب ہی میں رہیں، یہاں اپنی سیاسی پوزیشن مستحکم کریں اور بعد میں مرکز کا سوچیں۔ ابھی وہ جوان ہیں اللہ انہیں موقع ضرور دے گا۔ اس وقت وہ ملک بچائیں، چنانچہ جناب فریدالدین میں اور جناب انور زاہد اسی شام نواز شریف سے ملے اور انور زاہد نے اس موضوع پر تفصیل سے بات کی۔ پہلے تو نواز شریف شماریات کا سہارا لیتے رہے مگر جب انہیں ممکنہ خدشات اور عوامی سندھی ردعمل کا بھیانک نقشہ کھینچ دیا جس سے ملک تباہ ہو سکتا تھا تو یکدم بولے:

"شیخ صاحب! پاکستان کی قیمت پر نہیں، میں پاکستان کی قیمت پر کبھی وزیراعظم نہیں بننا چاہوں گا۔ میں ایسی پرائم منسٹری پر لعنت بھیجتا ہوں میں بھٹو نہیں ہوں کہ اپنی اقتدار کے لئے ملک توڑ دوں مگر میں کیسے مان لوں کہ بینظیر کے ہاتھوں میں پاکستان سلامت رہے گا۔ وہ ایسی ویسی ہی ہے، ذرا سوچ لیں" اور پھر کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، ہم بھی خاموش ہو گئے۔

آخر شیخ انور زاہد نے کہا کہ یہ بات میں نے بہت سوچ سمجھ کر کہی۔ موجودہ صورتحال میں آپ پنجاب ہی میں رہیں اور بینظیر والا تجربہ ہو لینے دیں اس کے بعد میاں صاحب نے پنجاب ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ انہوں نے خالصتاً ملکی نقطہ نگاہ سے کیا۔ میاں نواز شریف کے اندر ایک جذباتی محب وطن کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کے اس فیصلہ نے میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ احترام کا جذبہ پیدا کیا وگرنہ ہم نے بہت سے لوگوں کو سجدہ میں گرے دیکھا ہے جب وقت قیام ہوتا ہے۔

وہ ایک شخص جو قد میں مجھ سے بڑا تھا
دیکھا تو ایک اور کے قدموں میں پڑا تھا

بینظیر حکمرانی

میاں نواز شریف کا 1980ء میں مرکز نہ جانے کا فیصلہ خالصتاً ملی جذبوں کے تحت تھا لیکن دوسری طرف ذاتی انا اور تکبر کا غلبہ تھا۔ شاید بھٹو کی بیٹی ہونے کے ناطے ان کا یہ فطری ردعمل تھا کہ وہ اپنے باپ کی پھانسی کا بدلہ لیں۔ پھر وہ زہر جو انہوں نے اپنے دل میں اپنی ان بے پناہ تکالیف کی وجہ سے پال رکھا تھا جو انہیں ان کی ماں، بہن، بھائیوں اور پورے خاندان کو جنرل ضیاء الحق اور ان کے ٹولے نے اتنے سال دی تھیں اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ قید تنہائی سے لے کر جائیداد کی قرقی تک وہ کون کون سی عقوبتیں اور ذلتیں تھیں جو خود انہوں نے اور ان کی پارٹی نے نہیں سہی تھیں۔ کہیں کوڑوں کی بھرمار اور کہیں لاٹھی اور گولی۔ اک بربریت تھی جو مارشل لاء والوں نے سالہا سال سے اپنا رکھی تھی۔ یہ سب کچھ بھگتنے کے بعد اب بینظیر کو باپ والی کرسی واپس مل رہی تھی۔ یہ اقتدار ادھورا یوں رہ گیا تھا کہ نواز شریف نے ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب پر انہیں قبضہ نہ کرنے دیا۔ یہ تو شیر بلکہ شیرانی کے منہ سے پر لطف لقمہ چھیننے والی بات تھی۔ اس لئے نواز شریف محترم کی تمام تر تلخیوں کا ٹارگٹ بن گئے۔

ہمیں بینظیر کی اس بے مثل تڑپ کا اندازہ تو تھا مگر ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کون کون سی حدود

پھلانگ جائیں گی۔ سب سے پہلے مجھے اس کا علم تب ہوا جب محمد اقبال ٹکا کے ساتھ گفتگو میں چودھری اعتزاز احسن نے کہا کہ نواز شریف بینظیر کے آگے کیسے ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ کاروباری آدمی ہیں۔ ایک انکم ٹیکس افسر کی مار نہیں، میں نے کہا یہ تو کوئی اچھی بات نہیں وفاقی کا کام تو مل جل کر ہی چل سکتا ہے مگر وہاں معاملہ ہی اور نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح راؤ رشید نے کہا کہ نواز شریف کس باغ کی مولی ہیں۔ انہیں تو پولیس کا ایک ڈی ایس پی درست کر دے گا۔ یہ بڑی ہی غیر سیاسی اور جاہلانہ سوچ تھی اور ایک قسم کی قابل نفرت تکبر کا اظہار بھی۔ حالانکہ چند ماہ قبل ہی راؤ رشید وزارت کی بھیک مانگنے نواز شریف کے پاس آئے تھے۔ یہ سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں کا تو یہی وطیرہ رہا ہے۔ ہمارے حکمرانوں میں یہی رویہ اور جذبہ کارفرما رہا ہے۔ ایوب خان، یحییٰ خان، بھٹو اور ضیاء الحق یہی کچھ کرتے رہے تھے۔ یہ میری بھول تھی کہ نواز شریف کے تین سالہ شائستہ دور حکومت نے ہمیں یہ سب کچھ بھلا کر رکھ دیا تھا۔ اصل میں نواز شریف کی شائستگی کی سیاست ایک استثنیٰ تھی۔ ہماری اصل یہی تھی اور اب ہم اصل کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔

2 دسمبر 1989ء کو بینظیر بھٹو نے بحیثیت وزیر اعظم پاکستان حلف اٹھایا اور سب سے پہلا حکم یہ جاری کیا کہ میاں نواز شریف کو صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف نہ اٹھانے دیا جائے۔ مخدوم سجاد حسین گورنر پنجاب نے صدر غلام اسحاق کے حکم پر حلف دلا دیا اب بینظیر کا غصہ غلام اسحاق خان پر تھا۔ غلام اسحاق خان ابھی عارضی صدر تھے۔ انہیں بینظیر کے ووٹوں کی ضرورت تھی لہٰذا ان دونوں میں مخدوم سجاد حسین گورنر پنجاب کو اس عہدے سے ہٹانے پر سودا ہو گیا۔ ان کی جگہ جنرل ٹکا خان پنجاب کے گورنر مقرر ہو گئے مگر اس سارے قصے میں نواز شریف باقاعدہ اور دوبارہ پنجاب کے چیف منسٹر بن چکے تھے۔

یہ تھی ایک نئی غلیظ سیاست کی شروعات، اس میں بینظیر قصوروار تھیں یا نواز شریف اسکا اندازہ تو حالات و واقعات ہی سے لگایا جا سکتا ہے مگر کوئلوں کے کاروبار میں منہ دونوں طرف ضرور کالا ہوتا ہے۔ اس دورانیے میں بھی نواز شریف نے کمال صبر و تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا اور شائستگی کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیا۔

25 دسمبر 1988ء کو محترمہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے لاہور تشریف لا رہی تھیں۔ وہ اپنی تقاریر میں نواز شریف کا ذکر بہت حقارت سے کر رہی تھیں جس پر میاں صاحب بھی بہت جز بز ہو جاتے تھے۔ غصہ میں آ کر کہنے لگے کہ وہ بینظیر کا استقبال نہیں کریں گے اور لاہور سے باہر چلے جائیں گے۔ یہ عجیب صورتحال بننے والی تھی۔ اسپر راؤ رشید نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ کسی طرح میاں صاحب کو منائیں وگرنہ وزیر اعظم کی بہت زیادہ توہین ہو جائے گی۔ میں نے میاں صاحب سے بات کی تو فرماتے ہیں کہ بینظیر اس عزت افزائی کی مستحق نہیں ہیں۔ وہ میرے متعلق غلط زبان استعمال کر رہی ہیں، میں نے عرض کیا کہ یہ بات درست ہے مگر ہم ایک وفاق ہیں، وفاق پاکستان کے وزیر اعظم کا استقبال آپ پر لازم ہے۔ آپ اس وفاق کی سب سے بڑی اکائی ہیں۔ آپ وفاق کا احترام نہیں کریں گے تو وفاق کہاں جائے گا۔

یہ سن کر وہ پریشان ہو گئے اور کہنے لگے: ''ہاں! آپ کی یہ بات تو درست ہے مگر بینظیر وفاق کی علامت کے طور پر Behave بھی تو کریں۔ پی پی کے ورکر نہایت بدتمیز ہیں۔ وہ ایئر پورٹ پر ضرور میری بے عزتی کریں گے اور بینظیر خوش ہوں گی''

چونکہ میاں نواز شریف کی کمزوری ان کی پاکستان سے محبت تھی اس لئے میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا:

''جناب چار دن بعد سارک ملکوں کی اسلام آباد میں میٹنگ ہے جہاں راجیو گاندھی وزیر اعظم بھارت بھی آ رہے ہیں، وہ کیا کہیں گے کہ پاکستان اپنے نفاق کے بدترین موڑ پر کھڑا ہے کیونکہ یہاں کا سب سے بڑا صوبہ وفاق سے ناراض ہے۔ اب تو پاکستان ضرور ہی ٹوٹ جائے گا۔ خدا کے لئے ایسا نہ کریں''

اس پر انہوں نے بلا تامل کہا: ''ہاں یہ درست ہے میں وزیر اعظم کو ضرور ایئر پورٹ لینے جاؤں گا لیکن راؤ رشید صاحب سے بات کریں کہ وہ اپنے ورکروں کو سنبھال کر رکھیں'' میں نے راؤ صاحب سے بات کر لی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ ''وہ ورکروں کو ذرہ بھر بدتمیزی نہیں کرنے دیں گے''

25 دسمبر کو میاں صاحب حسب وعدہ لاہور ایئر پورٹ پر بینظیر بھٹو کا استقبال کرنے کے لئے گئے مگر پی پی کے کارکنوں نے بدتمیزی کی انتہا کر دی اور میاں صاحب کے خلاف ہر قسم کے غلیظ نعرے بلند کئے۔ میاں صاحب نے نہایت استقامت کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کیا مگر غصے سے ان کا رنگ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ بینظیر آئیں اور میاں صاحب سے سرسری ملاقات کے بعد اپنے ورکروں کے جلوس میں شہر کی طرف چل دیں جو اس وقت بھی میاں نواز شریف کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ میاں صاحب اپنی اس بے عزتی کو حوصلے کے ساتھ پی گئے۔

اس توہین کے باوجود میاں نواز شریف نے اگلے دن وزیر اعظم پاکستان بینظیر بھٹو کی دعوت کی اور انہیں ایک خوبصورت شال تحفے میں دی تاکہ ایک خوشگوار ماحول بن سکے مگر اس ملاقات میں بینظیر کی تمام تر گفتگو طنزیہ اور نشتر زنی بنی تھی۔ وہ ایک کالج ڈیبیٹر کی طرح بات بات پر پوائنٹ سکور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور جنرل ضیاء الحق کے تمام گناہ نواز شریف کے سر تھوپ رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے تعاون اور تمیز کی ایک بھی بات نہیں کی بلکہ مذاق اور ٹھٹھے سے کام لیتی رہیں۔ اس کے مقابلہ میں میاں نواز شریف نہایت شگفتہ گوئی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بینظیر دھماکہ خیز تھیں تو میاں صاحب نہایت دھیمے اور دلربا لیکن اس ملاقات نے بہت زیادہ تلخی پیدا کر دی۔

اسی دن بینظیر کے حکم پر رینجرز نے لاہور پولیس کو لکھ بھیجا کہ وزیر اعظم کی لاہور آمد پر ایئر پورٹ کے بیرونی گیٹ میں بم رکھ کر وزیر اعظم کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کا سب سے بڑا ذمہ دار نواز شریف ہے۔ اس تحریر کے ساتھ انہوں نے ایک مچھلی مار بم بھی ثبوت کے طور پر بھیج دیا جو کہ انہوں نے برآمد کیا تھا یہ "بم" اصل میں ایک پٹاخہ ہوتا ہے جسے "میرج بم" کہتے ہیں اور اسے مچھلیاں پکڑنے والے اکثر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دھماکے کی آواز سے مچھلیاں بے ہوش ہو کر پانی کی سطح پر آ جاتی ہیں۔ یہ تھا بینظیر کی طرف سے نواز شریف کے حسن سلوک کا بدلہ۔ خیر کیس میں تو کچھ بھی جان نہیں تھی مگر اس سے معاملات بہت بگڑنا شروع ہو گئے۔

اس کیس نے مجھے ایوب خان، بھٹو، ضیاء الحق سب کے ادوار یاد کروا دیئے جب یہ بات عام ہوا کرتی تھی

کہ اپنے سیاسی مخالفین کو خوار کرنے کے لئے اس طرح کے جھوٹے مقدمات کا سہارا لیا جاتا۔ ایئر مارشل اصغر خان پر ڈاکہ زنی، چودھری ظہور الٰہی پر بھینس چوری کرنے اور خود بھٹو پر فیلڈ مارشل کے زمانے میں ٹریکٹروں کے کیس بنتے رہے تھے۔

کیا دور ہے جاسوس کھڑے سوچ رہے ہیں
لوگوں کو کس جرم میں گرفتار کیا جائے

اس قبیح رسم کو آ کر نواز شریف نے ختم کیا کیونکہ انکا پس منظر شہری اور شریفانہ تھا وگرنہ اس طرح کے جھوٹے مقدمات حکمرانوں کے لئے معمول کا مشغلہ تھے۔ مجھے معاً خیال آیا کہ مہذب نواز شریف نے ہمیں کتنا بدل کر رکھ دیا تھا مگر آپ ٹیڑھے راستوں پر کب تک سیدھا چلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آخر یہ راستے خود آپ کو ٹیڑھا کر دیتے ہیں۔

29 دسمبر 1988 کو اسلام آباد میں سارک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جنوبی ایشیا کے تمام سربراہان مملکت نے حصہ لیا اور رات کو ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا۔ بینظیر بھٹو نے جان بوجھ کر میاں نواز شریف کی سرعام توہین کرنے کے لئے انہیں خلاف آداب محفل میں سولہویں میز پر جگہ دی۔ بینظیر کی طرف سے ذاتی ضد کی یہ انتہا تھا۔ قدرتی بات تھی نواز شریف نے اس کا بہت برا منایا اور یوں دونوں کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔

1986ء میں جب جمہوری اقدار کے عین مطابق بینظیر کو جلسے جلوسوں کی کھلی چھٹی دی گئی تو یار لوگوں نے نواز شریف پر الزام لگایا تھا کہ وہ بینظیر سے مل گئے ہیں۔ جب جاگیرداروں نے ان کے خلاف سازش کی تو بھی انہوں نے کہا کہ میاں صاحب اور بھٹو خاندان کے درمیان خون کا ویر نہیں ہے اس لئے وہ موزوں آدمی نہیں ہیں اور جب لوکل باڈیز الیکشن اور سینٹ کے حوالے سے وہ سیاسی طور پر کامیاب ہو گئے تو انہیں سینئر کا لقب دیا گیا اور اب وہ سب لوگ بکری کے میمنوں کی طرح میاں صاحب کے پیچھے پناہ ڈھونڈ رہے تھے مگر بینظیر تھیں کہ سب حدود و قیود پھلانگ رہی تھیں اور نواز شریف مجسم صبر و استقلال بنے کھڑے تھے۔

بینظیر کا اگلا وار آل پاکستان سروس کے ان افسروں کے خلاف تھا جو صوبہ پنجاب میں تعینات تھے۔ صوبے سے مشورہ کئے بغیر چیف سیکرٹری انور زاہد سمیت بہت سے افسروں کو یکطرفہ حکم سے مرکز میں بلا لیا گیا، ان میں یہ فقیر بھی شامل تھا۔ یہ صورتحال میاں نواز شریف کو مشکل میں ڈالنے کے لئے پیدا کی جا رہی تھی۔ اگر وہ ان احکامات پر عملدرآمد ہونے دیتے تو انتظامیہ پر ان کی گرفت بالکل ختم ہو جاتی۔ اس طریقہ سے بینظیر اپنی مرضی کے چیف سیکرٹری لے آتیں جس سے وہ محکمہ پولیس اور دیگر افسروں کی تقرری کر کے گورنر رول لگائے بغیر براہ راست پنجاب حکومت کو کنٹرول کر سکتی تھیں اور میاں صاحب کی چیف منسٹری دھری کی دھری رہ جاتی۔ اس صورتحال کا مقابلہ میاں صاحب نے نہایت مضبوطی اور خوبصورتی سے کیا اور ذرہ بھر اپنے اخلاقی اصولوں سے نہ ہٹے.....

نواز شریف نے ان تمام افسروں کو بلایا جن کا اس طرح تبادلہ کیا گیا تھا ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ان کے ساتھ اتنا اچھا کام کیا ہے اور انہیں مرکز جانے کی اجازت دیدی تا کہ ان کے کیریئر پر کوئی حرف نہ آئے اور وہ غیر ضروری مشکلات میں نہ پڑیں۔ اس پر میں نے اور جناب انور زاہد نے اعتراض کیا کہ وزیر اعظم کا حکم قاعدے قانون کے خلاف ہے وہ ایسے احکامات صوبہ سے مشورہ کئے بغیر جاری نہیں کر سکتیں۔ اس لئے اس پر عمل سے پہلے قانونی پوزیشن ضرور لینی چاہئے۔ وگرنہ الٹا آپ کی انتظامیہ زیر و ہو کر رہ جائے گی لہٰذا اس نہج پر خطوط لکھے گئے مگر بینظیر کا تو کھیل ہی یہی تھا۔ انہوں نے افسروں کو معطل کرنے کی دھمکی دیدی جو کہ وزیر اعظم کا اختیار تھا لہٰذا متعلقہ سرکاری ملازم ڈر گئے۔ یہ نواز شریف کا اخلاقی امتحان تھا کہ اب وہ کیا کرتے ہیں انہوں نے بلا تامل افسروں کو جانے کی اجازت دے دی اور مرکز سے بھیجے ہوئے افسروں کو لینے سے انکار کر دیا بلکہ رخصت ہونے والے افسروں کی جگہ انہوں نے صوبائی افسروں کی تعیناتی کر دی۔ انور زاہد اور میں نے قاعدے قانون کا موقف اختیار کرتے ہوئے مرکز میں رپورٹ نہیں کی۔ جناب انور زاہد چونکہ گریڈ 22 کے افسر تھے اس لئے انہیں معطل کرنے کا اختیار صدر کے پاس تھا وہ تو معطل نہ ہوئے مگر مجھے وزیر اعظم نے معطل کر دیا جس کے لئے مجھے ایک قانونی جنگ لڑنا پڑی۔ پاکستان کے معروف قانون دان ایس ایم ظفر میرے وکیل تھے۔ ان کی معاونت اور واقعاتی

حقانیت کی وجہ سے ہم یہ مقدمہ جیت گئے اور یوں نواز شریف کے درست موقف کو تقویت ملی۔

میاں نواز شریف چونکہ بنیادی طور پر نہایت ہی شریف انسان ہیں بالکل اسم بامسمیٰ انہوں نے اس دوران اکثر اوقات مجھے اپنی فکر سے آگاہ کیا اور کہا کہ میں ان کی وجہ سے کہیں اپنا کیریئر خراب نہ کرلوں۔ میرا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا کہ میں ایک اصولی جنگ لڑ رہا ہوں اور وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ میں اپنی سیاسی جنگ خود لڑ سکتا ہوں۔ میں کسی کو غیر ضروری خطرے کا شکار کر کے قربانی کا دنبہ نہیں بنانا چاہتا۔ ظاہر ہے میرے دل پر اس کا اچھا اثر مرتب ہوتا۔ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ وہ یہ بات اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ کسی چالبازی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ میں نے جنرل ایوب خان سے لے کر اب تک تمام حکمرانوں کے ساتھ بہت ہی قریب رہ کر کام کیا ہے۔ میں نے ان جیسا مخلص اور صدق دل کا حکمران نہیں دیکھا۔ وگرنہ ہمارے حکمران اور ہیرا پھیری ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ اسے اپنی سیاست یا سٹریٹیجی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو استعمال کرتے ہیں اور پھر اس طرح پھینک دیتے ہیں کہ اس طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے مگر میاں نواز شریف میں آنکھ کی حیا اور وفاداری بہت زیادہ ہے۔ طبیعت میں ذرا بھر بخل نہیں ہے بلکہ طبعاً وہ بادشاہ ہیں تبھی لوگ انہیں مغل شہزادہ کہتے ہیں۔

اسی دوران بینظیر نے نواز شریف کے خاندان کا کاروبار تباہ کرنے کی ٹھانی اور تمام بنکوں کو ہر قسم کا قرض دینے سے منع کر دیا۔ سرکاری بنکوں نے بہت احتجاج کیا کہ اتفاق لمیٹڈ بہت ہی اچھی پارٹی ہے اور اس کی وجہ سے ان بینکوں کا کاروبار بھی چل رہا ہے مگر مجال ہے بینظیر پر ذرا بھر اثر پڑے۔ انہیں تو ذاتی انتقام سے غرض تھی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ نیشنل بنک نے ایک تکنیکی ایل سی جو صرف تین ہزار روپے کی تھی، وزیر اعظم کے خوف سے یہ کہہ کر کھولنے سے انکار کر دیا کہ پارٹی کی مالی حیثیت مشکوک ہے۔ وہ پارٹی جس کا کاروبار اربوں روپوں پر پھیلا ہوا تھا بنک کے نزدیک اس کی حیثیت تین ہزار کی بھی نہ رہی تھی اسے کہتے ہیں سپید کو سیاہ کرنا۔ ریلوے نے اتفاق فونڈریز کے لئے ویگنیں دینے سے انکار کر دیا۔ واپڈا، سوئی گیس اور ٹیلیفون کے محکموں نے اتفاق والوں کو ہر طرح

سے ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ انکم ٹیکس اور کسٹمز کے محکمے ہاتھ جھاڑ کر میاں فیملی کے پیچھے پڑ گئے یہاں تک کہ سکریپ کا بیرون ملک سے لانا ناممکن بنا دیا۔ اتفاق کے لئے سکریپ لانے والا ایک بحری جہاز ''جونا تھن'' اس وقت تک سمندر میں لنگر انداز رہا جب تک بینظیر وزیر اعظم کے عہدے پر قائم رہیں مگر میاں نواز شریف کے پائے استقلال میں ذرا بھر لغزش نہیں آئی۔ ان کے کاروباری خاندان نے فنڈز کا بہت زیادہ بھاری شرائط پر متبادل بندوست کیا۔ کچھ غیر ملکی بنکوں سے قرض لیا اور کچھ کو آپریٹو کمپنیوں سے ہائر سود پر ادھار لے کر گزارہ کیا۔ یہ وہ وقت ہے جب خود اتفاق خاندان میں اس دباؤ پر پہلی دفعہ پھوٹ پڑنا شروع ہوئی۔ میاں شریف رکے ات بھائی تھے اور ساتوں بھائی اکٹھا کاروبار کرتے تھے مگر اس دباؤ سے بعض عزیزوں کے قدم لڑکھڑا گئے اور ایک دوسرے سے شکر رنجی بڑھنی شروع ہوئی جو بعد میں بہت زیادہ خراب صورت اختیار کر گئی چونکہ اتفاق برادرز کی مارکیٹ ساکھ بہت اچھی تھی اس لئے وہ بچ گئے ورنہ اتنے زیادہ دباؤ کو شاید ہی کوئی بزنس ہاؤس برداشت کر سکتا۔ یہ کاروباری بقا میاں نواز شریف کی چیف منسٹری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ میاں محمد شریف کی نصف صدی کو محیط کاروباری نیک نامی کی مرہون منت تھی۔ چیف منسٹری تو وجہ ابتلا تھی۔ چیف منسٹری کا قضیہ نہ ہوتا تو کاروبار کو کون چھیڑتا وہ تو پہلے بھی چلتا تھا۔

محترمہ بینظیر بھٹو میاں نواز شریف کو ہر قیمت پر پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے ہٹانا چاہتی تھیں کیونکہ اس کے بغیر ان کے اقتدار کی تکمیل نہیں ہو رہی تھی لہٰذا انہوں نے اپنے سیاسی ساتھیوں کو پنجاب کے ایم پی اے خریدنے کے لئے لاہور بھیج دیا۔ ملک کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری بنک ان کی صوابدید پر تھے۔ بینظیر کے میاں آصف علی زرداری الگ اپنی دکان کھولے بیٹھے تھے اور ہر کام میں کروڑوں اربوں روپے لے رہے تھے تاکہ اپنی بیگم کی حکومت کو مزید ''مضبوط'' بنا سکیں۔ ہر طرف رشوت کا بازار گرم تھا۔

تم نے معاشرے کو غلط گام کر دیا
رشوت کو عام ملک کو بدنام کر دیا

وہ پیسہ بھی اسی ''کارِ خیر'' کے لئے تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب بینظیر نے اتفاق برادرز کے علاوہ مسلم لیگ کے ان تمام ایم پی ایز اور ایم این ایز کو بھی فرداً فرداً ہراساں کرنا شروع کر رکھا تھا، جو کاروبار کرتے تھے انہیں سے بہت سے خوفزدہ تھے اور بعض کو اپنے اپنے کاموں کا لالچ تھا۔ غیر جماعتی انتخابات نے ان کی وفاداری، روایات یا ڈسپلن کی پرورش بھی نہیں ہونے دی تھی۔ اس ماحول میں ان کو ساتھ رکھنا ایک کارے دارد تھا مگر نواز شریف نے انہیں اپنے ساتھ رکھا اور اس حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نواز شریف کو بھی اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ کشمکش کا یہ وہ گندا دور ہے جب میاں نواز شریف کو ان لوگوں کے بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں میں تحصیلداریاں اور تھانیداریاں تقسیم کرنی پڑیں۔ زمینیں اور پلاٹ تقسیم کرنے پڑے۔ قانون قاعدے نرم کرنے پڑے اور یوں انتظامی بدنظمی اور بددیانتی کی طرف قدم بڑھانا پڑا۔ بینظیر کی ہارس ٹریڈنگ نے جواباً نواز شریف کو بھی ہارس ٹریڈنگ پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس وقت میں نے میاں نواز شریف کو شدید ذہنی دباؤ میں دن رات بہت قریب سے دیکھا۔ وہ کسی ذاتی نقصان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتے تھے۔ ان کی اصل پریشانی اس قسم کے برے کام تھے جو انہیں اپنی پارٹی کو قائم دائم رکھنے کے لئے کرنا پڑ رہے تھے۔ کئی دفعہ تو وہ بالکل باغی ہو جاتے اور بہت سے کاموں سے صاف صاف جواب دے دیتے اور ''فقیر بزرگ سیاستدان'' انہیں سمجھاتے کہ ایسی حالت میں ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ آگے جا سکتے ہیں اور نہ ہی پیچھے۔ اس وقت میاں صاحب کے ساتھ مسلم لیگ کے علاوہ اور بہت سی ''پارسا'' جماعتیں بھی تھیں اور ان کے تقاضے سب سے بڑھ کر ہوتے تھے بعد میں ان ہی لوگوں نے نواز شریف کے خلاف سب سے زیادہ باتیں کیں حالانکہ اس صورت حال میں میاں صاحب نے کوئی ذاتی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ خاندان کے کاروبار کا بیڑا غرق کروا لیا۔ ایک مخصوص صورتحال سے نپٹنے کے لئے یہ کام ''کارِ خیر'' کے طور پر کئے اور بڑے بڑے سیاسی علماء نے میری آنکھوں کے سامنے اس کی نہایت ہی عمدہ تاویلیں دیکر فتوے دیئے مگر میاں نواز شریف کی طبیعت پر سخت بوجھ رہتا۔ مرتا کیا نہ کرتا والی بات آ بنی تھی ان کے سر پر ایک جنگ تھوپ دی گئی تھی اور وہ اسے ایک جنگ ہی سمجھ کر لڑ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اس جنگ میں بہت سی

ناجوازیاں ہوئیں مگر اس کے ذمہ داری محض نواز شریف نہیں تھے بلکہ اس کے ذمے دار بینظیر کا غیر معقول اور متکبرانہ رویہ تھا اور ان دونوں سے بڑھ کر جنرل ضیاء الحق کی غیر جماعتی انتخابات کی "عظیم" سٹرٹیجی تھی جس نے تمام اخلاقیات کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اس لئے تو کہتے ہیں کہ فوجیراج ہمیشہ بدترین برائیوں کی راہیں ہموار کرنے والا بلڈوزر ہے کہ پردہ سے غائب بھی ہو جائے تو بدیوں کی راہیں مستقل چھوڑ جاتا ہے۔ بینظیر کی تلخیاں بھی اسی رویئے سے جنم لے رہی تھیں اور میاں نواز شریف کی بھکتیاں (برداشت) بھی اس فصل خاردار کا کرشمہ تھی اور پورا پاکستان اپنے راستوں پر بکھرے کانٹے اپنی آنکھوں کے پپوٹوں سے چن رہا تھا۔

اس باہمی کشمکش نے جہاں میاں نواز شریف کو مشکل میں ڈالا وہاں ان کی شخصیت کی پختگی کا بھی سامان ہوا۔ وہ سیاست کی ٹیڑھی راہوں پر سیدھے چلنے والے سیاستدان تھے مگر اب وہ ٹیڑھی پگڈنڈیوں سے بھی واقفیت حاصل کر رہے تھے۔ عوام یہ سارا تماشہ صبر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نواز شریف کو ستائش کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اس جھگڑے نے میاں نواز شریف کو ایک بہت بڑا لیڈر بنا دیا اور وہ عوام کی آنکھ کا تارا بن رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کوئلے کی دلالی میں ان کے چہرے پر بھی سیاہی ملی جا رہی تھی مگر وہ اس میں سے سرخرو ہو کر نکل رہے تھے۔ عامتہ الناس کی ایک عجیب نگاہ ہوتی ہے اور وہ تمام تر دھول کے باوجود بہت دور تک درست دیکھ لیتی ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ آواز خلق کو نقارہ خدا سمجھو اور اب خلق خدا نواز شریف کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ نواز شریف پر پی پی حکومت میں بے انتہا الزامات تھوپے گئے مگر حقائق ان کا بالکل ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تمام تر ابلاغ عامہ ان کے خلاف استعمال ہو رہا تھا اور پاکستان کا سب سے بڑا چور انہیں کہا جا رہا تھا مگر عوام یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ الٹا ان کی عزت میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اس روسیاہی کے کاروبار میں عوام حقیقت کو اچھی طرح بھانپ سکتے تھے۔ کسٹمز اور انکم ٹیکس، واپڈا اور ٹیلیفون کے محکموں نے جتنی بھی انکوائریاں کیں سب میں ان کے ہاتھ صاف نکلے۔ ایف آئی اے نے زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر کچھ نہ مل سکا۔ اس کڑے امتحان میں سے کوئی سادھو تو گزر سکتا ہے اگر میاں نواز شریف جیسا انسان جس کا خاندان کاروبار میں بھی ہو اور سیاست میں بھی آدھمکے اس کا اتنا

صاف ستھرا نکل جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا اور وہ بھی اس حکومت کے دور میں جو ان کی بدترین دشمن تھی۔ لوگ اس طرح کی بھی بات کرتے ہیں کہ بینظیر اس لئے میاں صاحب کا لحاظ کرتی تھیں کہ بعد میں جب ان کی باری ہوگی تو میاں صاحب ان کا خیال رکھیں گے۔ یہ سوچ بہت ہی بچگانہ تھی اور بعید از قیاس بھی اسے کہتے ہیں دور کی کوڑی لانا۔ حقیقت یہی ہے کہ ذاتی طور پر ان کا دامن بالکل صاف تھا اور صاف رہا لیکن اس انوکھی گندی سیاست نے بہت سی دھول ضرور اڑائی جس سے ان کا چہرہ داغدار ہوا اور چمکا بھی۔ ان متنازعہ باتوں کا فیصلہ عوام ہی کر سکتے ہیں۔ میاں صاحب کو بیوروکریٹس کی بے ہودگیوں کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا وہ بدترین مارشل لاء کے رویئے ہی سے ابھرے اور بدترین انتقامی سیاست کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے کردار کو کسی خلایا مثالی معاشرہ کے پیمانوں پر نہیں تولا جا سکتا اس کا ایک خاص پس منظر ہے اس سے ہٹ کر بات کرنا غلط ہے۔ میں نے چونکہ یہ تماشا بہت ہی قریب سے دیکھا اس لئے اکثر دکھ ہوتا ہے کہ ہم کتنی غیر حقیقی باتوں پر اتنی آسانی سے یقین کر لیتے ہیں اصل میں ان کا قصور ایک کامیاب امیر باپ کے گھر پیدا ہونا اور پھر اچانک سیاست کے ریگزاروں میں پہنچ جانا ہے۔

اس سیاسی کشمکش میں اللہ تعالیٰ نے بھی نواز شریف کا پلڑا بھاری کیا۔ انکے خلاف جب عدم اعتماد کا ووٹ ہوا تو پی پی نے اپنے مزید 5 ووٹ کم کر لئے شاید اللہ تعالیٰ نواز شریف کی مدد کر رہا تھا۔ ہمارے دوست مرحوم سراج منیر نے اس وقت کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نواز رہا ہے، نواز شریف سجدے میں گر جا اور نواز شریف سجدہ ریز ہو گئے۔

جوابی حملہ

بینظیر بھٹو کی طرف سے جب زیادتی کی انتہا ہوگئی تو نواز شریف کے ساتھیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب بہت ہو گیا ENOUGH IS ENOUGH محض دفاع کافی نہیں آپ جوابی سیاسی حملہ کی تیاری کریں اور بینظیر کی حکومت کو عدم اعتماد کے ذریعے گرائیں۔ اس وقت مرکز میں چودھری شجاعت حسین پاکستان مسلم لیگ کے پارلیمانی قائد تھے اور غلام حیدر وائیں اسلامی اتحاد کی طرف سے قائد حزب اختلاف تھے۔ وہ پارلیمنٹ میں حزب اقتدار کے لئے لے رہے تھے، غلام مصطفیٰ جتوئی بھی مظفر گڑھ سے ضمنی انتخاب لڑ کر قومی اسمبلی میں پہنچ چکے تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان بھی ممبر پارلیمنٹ تھے۔ مولانا فضل الرحمان جمعیت العلمائے اسلام کے لیڈر کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ارکان کی قیادت کر رہے تھے۔ ایم کیو ایم بینظیر کے ساتھ تھی۔ غلام مصطفیٰ کھر آزاد ممبر تھے اس طرح چند ایک اور آزاد تھے۔ 119 ممبران کی تعداد ضروری تھی کیونکہ اس وقت 10 یا 20 سیٹیں خواتین کی تھیں جو اب موجود نہیں ہیں۔ باقی میں 20 اقلیتی ممبران تھے اور 8 فاٹا سے یعنی قبائلی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

نواز شریف کے سیاسی ساتھیوں نے کئی سکیمیں تیار کیں جس کے مطابق مختلف طریقوں سے پیپلز پارٹی کے ارکان کو اپنے ساتھ ملانے کے مشورے تھے۔ میاں صاحب اس طرف مائل نہیں ہو رہے تھے کیونکہ بعض صورتوں میں بعض ہتھکنڈے بہت UNDER HAND یعنی اخلاق سے گرے ہوئے تجویز کئے جاتے تھے

اور روپے پیسے کے خرچے کی بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ نواز شریف ان سب باتوں سے گریز کر رہے تھے۔ پی پی کے بعض ممبر انصرف اس لئے مسلم لیگ کے ساتھ آنا چاہتے تھے کہ وہ اپنی ہائی کمان سے ناراض ہو گئے تھے مگر وہاں نواز شریف کے لئے ایک اور قسم کی دشواری تھی کہ ان کے حلقوں سے ہارے ہوئے مسلم لیگی بڑے ہی جدی پشتی مسلم لیگی تھے۔ وہ ان کے مخالف کو اپنے ساتھ ملا کر اپنے پکے مسلم لیگیوں کو ناراض نہیں کر سکتے تھے اور ویسے بھی ان لوگوں کی آپس کی مخالفتیں بہت سخت تھیں۔ یوں یہ معاملہ بہت پیچیدہ تھا ہماری سیاست میں صرف پیسہ نہیں تھا۔ یہ تاثر بہت حد تک غلط ہے، یہاں دشمنی اور برادری بہت ہے، پیسے کی سیاست فاٹا کی حد تک ہے کہ وہاں کا رواج ہی یہ ہے یا پھر اقلیتوں کے معاملہ میں اس طرح کا معاملہ چلتا ہے۔ غیر جماعتی انتخابات اور نظریاتی سیاست کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہاں کاموں کی سیاست چلتی ہے۔ تھانہ کچہری سے جو کام کروا سکے وہی چودھری ہے اور وہی ووٹ کا سب سے زیادہ مستحق۔ یہاں اثر و رسوخ کا سکہ چلتا ہے اور بیوروکریسی میں سونے چاندی کا سکہ چلتا ہے۔ سیاستدان کام چلاتے ہیں اور سرکاری ملازم دام بناتے ہیں اور دونوں میں مقامی سطح پر ملی بھگت ہو جاتی ہے۔ تحصیلدار تھانیدار پیسہ بناتا ہے اور ایم پی اے، ایم این اے کام نکلواتا ہے اور جو روپیہ پیسہ سرکاری ملازم بٹورتے ہیں اس سے ان سیاستدانوں کا منہ بھی کالا ہوتا ہے اور وہ رشوت خور کہلواتے ہیں۔ ہمارے ہاں غیر جماعتی انتخابات کے کلچر نے بددیانتی اور بے انصافی کو اسی طریقے سے پالا پوسا ہے۔ ہمارے صحافی جس رشوت وغیرہ کا شور مچاتے ہیں وہ ایک سطحی مطالعہ ہوتا ہے یا پھر ایک بلیک میلنگ کا ہتھکنڈہ، اصل قصہ ذرا مختلف ہے۔ سیاستدان یا تو دربار سرکار سے پرمٹ اور پلاٹ لے کر پیسے بناتے ہیں یا پھر ان محکموں کے عمال سے رقوم لیتے ہیں جنہیں عرف عام میں ترقیاتی محکمے کہتے ہیں از قسم انہار، بلدیات اور شاہرات کیونکہ وہاں سرکار کا کروڑوں خرچ ہوتا ہے اور ہر ٹھیکے پر کمیشن مقرر ہوتا ہے اور شکایت کنندہ کوئی نہیں ہوتا۔ بہر صورت ایم پی ایز اور ایم این ایز کی وفاداریاں خریدنے کے لئے عام تاثر کے خلاف نقد روپیہ پیسہ کم ہی چلتا ہے۔ یہ لوگ کاموں اور چودھراہٹ کی خاطر اپنی وفاداریاں دیتے ہیں۔ اس مشق سے پہلے پہل میاں نواز شریف گریزاں تھے کیونکہ وہ دفاع کے مرحلے میں اپنے

ایم این ایز اور ایم پی ایز کے نخرے خوب برداشت کر چکے ہیں اور مزید روسیاہی کا کاروبار نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جب میاں صاحب نے جوابی حملے میں کافی دیر لگا دی تو چند دوستوں نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ مرکز میں غلام مصطفیٰ جتوئی کو قائد نہیں بنانا چاہتے تاکہ آئندہ کا سیاسی کھیل ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ بعض دوستوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو اس لئے آگے نہیں لانا چاہتے کہ اگر وہ انہیں وزیر اعظم بنواتے ہیں تو پھر ان کا دوست غلام مصطفیٰ کھر پنجاب میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جائے گا اور یوں میاں صاحب کے لئے پنجاب میں ایک سیاسی چیلنج پیدا ہو جائیگا۔ یہ سب باتیں جب میاں نواز شریف تک پہنچیں تو انہیں بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ یہ تو بہت زیادہ زیادتی ہے۔ میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں سایوں سے ڈروں۔ بینظیر ایک حقیقت ہے اور جتوئی ایک سایہ۔ وہ تو میرا اور میرے خاندان کا بیڑا غرق کر رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر میری مدد سے جتوئی سامنے آ جائیگا تو مجھے وہ اس قسم کا نقصان تو نہیں پہنچائیگا وہ تو سیاسی طور پر میرا محتاج ہوگا۔ میں کیوں ایسا سوچنے لگا۔

یہ وہ سٹیج تھی جب میاں نواز شریف نے بینظیر کے خلاف تمام مخالفین کو ایک سٹیج پر اکٹھا کرنے کا سوچا۔ میاں صاحب دھنکے پکے ہیں۔ جب فیصلہ کر لیں تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ سب سے پہلے انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک تنظیم بنائی جائے جو اسلامی جمہوریت اتحاد، حکومت سے باہر دوسری جماعتوں اور آزاد اراکین کو ایک تسبیح میں پرو دے۔ اس سلسلہ میں نوابزادہ نصر اللہ خان نے بہت کام کیا۔ جتوئی تو پہلے ہی J.I. میں تھے۔ اب مصطفیٰ کھر اور مولانا فضل الرحمٰن کو بھی شامل کرنا تھا۔ ایم کیو ایم کو بھی ساتھ ملانا تھا لہٰذا تنظیم کا سکوپ بڑھانے کے لئے اس کا نام تجویز کیا گیا۔ C.O.P یعنی متحدہ حزب اختلاف۔ دوسرے الفاظ میں حکومت ایک طرف اور مخالفین دوسری طرف۔ اب اس تنظیم میں سب ہی سما سکتے تھے۔ اس سکیم پر نہایت خاموشی سے کام شروع ہوا اور بے نظیر حکومت کو ماس وقت پتہ چلا جب غلام مصطفیٰ جتوئی کی سربراہی میں اس تنظیم نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کر کے بتا دیا کہ ان کے ساتھ 97 ممبران قومی اسمبلی موجود ہیں۔ اس کام سے حکومت کے ایوانوں میں

سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ اب صرف 22 ممبران درکار تھے۔ اگر وہ حزب اختلاف کو مل جاتے تو حکومت گر سکتی تھی۔

پیپلز پارٹی فاٹا کے ممبران اور اقلیتوں کے ایم این ایز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگی کہ وہ کسی وقت بھی اپنی وفاداری بدل سکتے ہیں۔ بدلنے والوں کو اب صاف نظر آ رہا تھا کہ اب حکومت واقعی بدل سکتی ہے، بس چند ایک ایم این ایز کی مزید ضرورت ہے اور جونہی حزب اختلاف کو وہ لوگ مل گئے حکومت گر جائیگی۔ یہ وہ موقع تھا جب میاں نواز شریف نے اپنے سیاسی ساتھیوں کی لاہور میں ایک خفیہ میٹنگ بلائی اور پی پی کے ان ممبران کی فہرست تیار کی گئی جو ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھے اور پھر دوستیوں اور تعلقات کے حوالے سے اپنے ایم این ایز کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اپنے اپنے قریبی پیپلز پارٹی کے ممبران کو ساتھ ملائیں اور فرداً فرداً میاں صاحب کو آ کر بتائیں۔ یہ سارا کام نہایت ہی خفیہ طریقے سے شروع ہوا۔ جنرل مجید ملک نے قبائلی ممبران پر کام کیا اور میاں شہباز شریف نے اقلیتی ممبران سے دوستی بڑھائی۔ مولانا فضل الرحمٰن نوابزادہ نصر اللہ کی وجہ سے آئے تھے۔ آزاد ممبران کو جتوئی صاحب لائے، ان دنوں سنا تھا کہ جنرل اسلم بیگ چیف آف آرمی سٹاف نے ایم کیو ایم کے ممبران دیئے۔ مگر کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ چودھری ارشد نے تو ایم کیو ایم کی مراجعت بہت پہلے بتا دی تھی۔ میاں زاہد سرفراز بھی یہی دعوے رکھتے ہیں۔

جب یہ سب تیاری ہو رہی تھی تو میاں نواز شریف کی طرف سے تمام تر CO-ORDINATIO سینیٹر آصف فصیح الدین وردگ کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک دن بتایا کہ کام گڑبڑ ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں اچھا بھلا معاملہ چل رہا تھا کہ جنرل اسلم بیگ کے مشورہ پر میاں نواز شریف نے مرکز کا معاملہ موخر کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے سرحد اسمبلی پر کام کر کے وہاں اپنی حکومت بنائیں۔ یوں پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے تین صوبوں میں جب بینظیر مخالف حکومتیں ہوں گی تو اس کے پاس صرف صوبہ سندھ رہ جائے گا اور اس کی حکومت پکے ہوئے آم کی طرح گر جائے گی۔ یاد رہے اس وقت بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اکبر بگٹی تھے جو بینظیر مخالفت میں میاں صاحب سے بھی دس قدم آگے تھے۔ یوں عین درمیان میں کانٹا بدل دیا گیا اور سارا زور

اس کام پر لگ گیا۔ سرحد کے ڈھیر سارے صوبائی ممبران لاہور آ کر ٹھہرے اور خوب خاطریں کروائیں مگر دو تین مہینے ضائع کرنے کے باوجود وہاں کام نہ بن سکا۔ اتنی زیادہ محنت اور وقت کے ضیاء کے بعد مرکز پر پھر کام شروع کر دیا گیا اور ایک ایسا مرحلہ آیا کہ بقول آصف وردگ کے ان کے پاس 132 ممبران قومی اسمبلی کی فائل لسٹ تیار ہو گئی اور اب اوپن ہونے کا وقت آ گیا۔ عین اس موقع پر میاں صاحب سے ایک فاش غلطی ہو گئی چاہئے تو یہ تھا کہ وہ کسی بہانے ان تمام ممبران کو ایک جگہ اکٹھا کرتے اور دکھاتے کہ ان کے پاس یہ 132 ممبران ہیں۔ 132 ممبران نیشنل اسمبلی کا صاب مطلب تھا کہ اب اکثریت COP کی ہے اور اسے حکومت بنانے کا حق حاصل ہے۔ اس کے بعد صدر مملکت بینظیر کو اعتماد کے ووٹ کا کہہ سکتے تھے اور یوں بینظیر استعفیٰ دیتیں یا ان کی حکومت عدم اعتماد سے گر جاتی۔ لیکن اس لائحہ عمل کی بجائے رازداری کی خاطر میاں صاحب نے ان ممبران کو لاہور، کوہ مری اور اوکاڑہ وغیرہ میں رکھا اور یوں تازہ دم ٹوٹ کر آنے والے ممبران کو یقین نہ ہو سکا کہ جتوئی کے ساتھ واقعی 119 سے زیادہ ممبران ہیں اگر انہیں یقین آ جاتا تو پھر وہ کبھی واپسی کا نہ سوچتے کیونکہ حکومت تو وہیں بنتی جہاں 119 یا اس سے زیادہ ممبران نے ہونا تھا۔ یہ بے یقینی تھی جس نے بعد میں میاں صاحب کی اس سکیم کو ناکام کیا۔

جب بینظیر نے دیکھا کہ اب ان کے خلاف گھیرا تنگ ہو رہا ہے تو ان کے طوطے اڑ گئے ان سے اور کچھ نہ ہو سکا تو اپنے تمام ایم این ایز سوات بھیج دیئے اور سارا کام اتنی جلد میں کیا کہ ایئر فورس کے جہاز اس کام کے لئے استعمال میں آ گئے۔ اب دونوں اطراف سے زور لگنے لگا اور جان کے لالے پڑ گئے۔ ہر طرف بے پر کی اڑ رہی تھی۔ افواہوں پر افواہیں چل رہی تھیں اور بینظیر نے ہر ایک سے نہایت ہی دلکش وعدے وعید کرنا شروع کر دیئے تھے۔ غلام مصطفیٰ کھر نے یکدم پینترا بدلا اور بینظیر سے جا ملے انہیں چونکہ مسلم لیگ اور COP کی تمام سکیم کا پتہ تھا اس لئے انہوں نے پیپلز پارٹی کے بہت سے بھگوڑے ممبران کو ورغلا لیا اور واپس لے گئے۔ مصطفیٰ کھر کی اس نقب اور دوسری بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب عدم اعتماد کا ووٹ ہوا تو COP کو 107 ووٹ ملے یوں 12 ووٹوں سے تحریک ناکام ہو گئی یعنی اگر صرف 6 ووٹ اور مل جاتے تو معاملہ برابر ہو جاتا۔ اس طرح بینظیر کی

حکومت بچ گئی مگر اب وہ ایک لنگڑی بطخ (Lame Duck) بن چکی تھی اور ساری قوم کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب کسی وقت بھی گر سکتی ہے مگر بینظیر بھٹو اپنی انتقامی کارروائیوں سے پھر بھی باز نہ آئیں اور اتفاق فیملی ہی نہیں بلکہ اپنے تمام مخالفوں کو پہلے سے بھی زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کشمکش میں میاں نواز شریف کا قد کاٹھ بہت بڑھ گیا وہ بینظیر کے مقابلہ میں زیادہ پاپولر ہو گئے۔ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے اقتدار میں بھی تھے اور عملی طور پر قائد حزب اختلاف بھی اور یوں انہیں ایک نہایت ہی منفرد مقام مل گیا تھا۔ پوری قوم اب میاں نواز شریف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی شہرت اچھی سے اچھی ہو رہی تھی جبکہ بینظیر اور ان کے خاوند آصف علی زرداری کی شہرت بہت داغدار ہو گئی تھی۔ ہر ایک آصف زرداری کی رشوت خوری کی بات کر کے اسے ٹین پرسنٹ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ اس کے بدلے پیپلز پارٹی والے میاں صاحب کے خلاف کچھ اسی قسم کا پروپیگنڈہ کر کے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر عوام پر اس کا الٹا اثر ہو رہا تھا۔ صرف وہ لوگ اس قسم کی باتوں پر یقین کرتے تھے جو ان کے سیاسی مخالفت تھے۔ اچھے سے اچھے چہرے بھی دھول سے گزر کر دھندلا ضرور جاتے ہیں ورنہ حقیقت کچھ نہیں تھی۔ میاں صاحب پھر اپنے پہلے ذوق وشوق سے تعمیر وطن کے کاموں میں جت گئے بلکہ ان کا کمال تھا کہ ترقیاتی کاموں اور لاء اینڈ آرڈر کی ہفتہ وار میٹنگیں اتنی زیادہ سیاسی مصروفیت کے باوجود کبھی نہ چھوڑتے چاہے انہیں وہ اجلاس رات کو کرنا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ اتنی سیاسی افراتفری کے باوجود صوبہ پنجاب میں ترقیاتی کام اور امن عامہ آئیڈیل رفتار سے بہتر ہو گئے۔

COP کے اس عدم اعتماد کی ناکامی کا ایک برا پہلو یہ نکلا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ تو وزیر اعظم بن رہے تھے آخری لمحات میں میاں نواز شریف نے خود ہی تحریک عدم اعتماد کو ناکام کروا دیا۔

یہ وہم کہیں تمہیں گنہگار نہ کر دے

یہ اصول فطرت ہے کہ ناکامیوں کا کوئی مائی باپ نہیں ہوتا اور طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک بہت ہی سمجھدار آدمی نے ہمیں ان دنوں بتایا کہ معاملہ اس طرح نہیں بلکہ یہ گڑبڑ نہایت ہی خاموشی سے صدر

غلام اسحاق نے کی تھی کیونکہ اگر وہ تحریک عدم اعتماد کامیاب ہو جاتی تو میاں نواز شریف کا سیاسی قد کاٹھ بہت بڑھ جاتا اور بقول غلام اسحاق خان (ہمارے دوست کے مطابق) میاں صاحب اپنی اوقات سے باہر نکل جاتے۔ میاں صاحب کو اوقات میں رکھنا ضروری سمجھا گیا۔

اب محترمہ بینظیر ناتواں تھیں، تنہا تھیں اور بدنام بھی جبکہ میاں نواز شریف ابھرتا ہوا سیاسی ستارہ۔ یہ بات پاکستان کی مستقل انتظامیہ یعنی اسٹیبلشمنٹ کو بہت پسند تھی۔ میاں نواز شریف ان کے خیال میں ان کے آدمی تھے۔ وہ ایک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی گود سے اٹھے تھے اور بینظیر ایک بغاوت کی بجھی چنگاری تھیں، لہٰذا وقت آ گیا تھا کہ چنگاری کو سیاست کی بجائے سرکار دار کے زور سے بجھا دیا جائے۔ اس کا بندوبست جنرل ضیاء الحق نے آٹھویں ترمیم سے کر رکھا تھا اور وہ اختیار جرنیلوں اور بیوروکریسی کے دھرم گرو غلام اسحاق خان کے ہاتھ میں تھا۔ اسے بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے 6 اگست 1998ء کو بینظیر حکومت برخواست کر دی۔ وہ بینظیر جو مارشل لاء سے مثالی لڑائی لڑتے ہوئے عوام کی آنکھ کا تارہ بن کر ابھری تھیں وہ اپنی ہی کوتاہیوں کی راکھ میں جل مریں اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر "وفاق کی زنجیر" تار تار ہو گئی۔ کوئی بھی ان کے لئے آنسو بہانے والا نہیں تھا اس سارے سودے میں سیاست کی ٹیڑھی پگڈنڈیوں پر چلنے والا سیدھا سادا نواز شریف ایک دفعہ پھر کامیاب ٹھہرا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی عبوری وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ غلام حیدر وائیں پنجاب اور جام صادق علی سندھ کے عبوری وزرائے اعلیٰ بنائے گئے۔ دوسرے صوبوں میں بھی بینظیر کے بدترین سیاسی مخالفوں کو آگے لایا گیا۔ بینظیر پر بددیانتی کے بدترین الزامات لگے جو بادی النظر میں ٹھوس تھے اور سپریم کورٹ نے بھی انہیں تسلیم کیا۔ جیسا کہ ہر معزول حکومت کے ساتھ ہوتا آیا ہے احتساب کے لئے زوردار آواز اٹھی اور روئیداد خان کی سربراہی میں یہ کام ہوا بلکہ 1977ء کی طرح انتخاب سے پہلے احتساب کا نعرہ لگا جو ہماری مستقل اسٹیبلشمنٹ والوں کا نہایت ہی پسندیدہ مشغلہ ہے کیونکہ اس طرح انہیں جمہوریت اور عوامی شمولیت سے کنارہ کشی کا بہانہ مل جاتا ہے اور وہ بلا شرکت غیرے حکمرانی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایوب خان سے لے کر اب تک احتساب کا نعرہ ہمیشہ مخصوص مفادات کی

خاطر ایک مخصوص ٹولہ لگاتا ہے اور اپنا کام نکالتا رہتا ہے۔ یہ ذہن مکمل طور پر جمہوریت دشمن اور مفاد پرست ہے۔ اسے عرف عام میں تانا شاہی اور بیوروکریسی بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ کرگس ہے جو صرف مردار پسند کرتی ہے۔ وہ تازگی کو پسند ہی نہیں کر سکتی حالانکہ احتساب کا تصور مکمل طور پر جمہوری اور عوامی ہے جو لوگ عوام کے سامنے جوابدہ ہونا پسند نہیں کرتے وہی سب سے زیادہ احتساب کا شور مچاتے ہیں۔ احتساب اور جمہوریت کا چولی دامن کا رشتہ ہے جمہوریت کے بغیر احتساب کا تصور ہی ممکن نہیں۔ احتساب کا تصور ہی عوام کے سامنے جوابدہ ہونا ہے، ان کے نمائندوں کی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہونا، مگر ہمارے ہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہم جمہوریت کشی اور غیر ذمہ دارانہ حکومتوں کے ذریعے احتساب کا مطالبہ کرتے ہیں جو ظلم اور بے انصافی کے علاوہ کچھ نہیں۔ بازیگر عجیب عجیب تماشے کرتے ہیں اور دیتے ہیں دھوکہ کھلا۔

1990ء کے اس احتساب میں بینظیر کے ساتھ ساتھ میاں نواز شریف کی بھی بے شمار انکوائریاں ہوئیں حالانکہ وہ اس زمانے میں تختہ مشق بنے رہے تھے مگر مطالبہ تھا کہ احتساب برابر اور یکساں ہونا ضروری ہے۔ اس دفعہ بھی میاں نواز شریف نے ان انکوائریوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور ان کے خلاف کچھ نہ نکلا۔ نکلتا کہاں سے وہ تو ایک محنتی مزدور کا بیٹا تھا جس کا گھرانہ حق حلال کی کمائی پر ایمان کامل رکھتا ہے یہ اور بات ہے کہ سیاست کے بھیڑوں نے اسے بدنام کر دیا تھا اس لئے کہتے ہیں کہ حنا رنگ لاتی ہے پس جانے کے بعد۔ نواز شریف کا بھی پسنا ضروری تھا، تاکہ وہ اس عمل سے گزر کے عوام کو اپنے صاف ہاتھ دکھا سکیں، لیکن ہمارے حکمرانوں کے کچھ اور ہی ارادے تھے وہ چاہتے تھے کہ آئندہ جتوئی صاحب وزیر اعظم بنیں۔ اللہ اور عوام کو کچھ اور ہی منظور تھا وگرنہ کم ہر دلعزیز بندہ اچھا رہتا ہے بیوروکریسی کے کھیلنے کے لئے آخر کوئی تو آدمی لانا تھا۔ پاپولر آدمی ہمیشہ پواڑہ ڈالتا ہے۔ بیوروکریسی اور جرنیل شاہی کی نگاہ میں بدترین شخص عوام میں پاپولر شخص ہی ہوتا ہے۔

بیوروکریٹک بزدلی

بیوروکریسی کبھی بھی کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ نوکر شاہی کی فطرت میں احتیاط اور بخل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اسے آپ بزدلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بیوروکریٹ قاعدے اور ضابطے کی زنجیر میں بندھا رہتا ہے اور بینظیر کی حکومت کی برخواستگی کے بعد پاکستان میں ایک اسی طرح کی حکومت موجود تھی۔ صدر غلام اسحاق تھے اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ مرزا، غلام مصطفیٰ جتوئی عبوری وزیر اعظم، جتوئی صاحب کی اس تکون میں ایک نہایت ہی کمزور حیثیت تھی تاہم فیصلے اسحاق اور مرزا کر رہے تھے۔

اس پس منظر میں عراق نے کویت پر 9 اگست 1990ء کو حملہ کر کے اسے ہڑپ کر لیا۔ سعودی عرب اور عرب امارات خوفزدہ ہو گئے۔ ان پر بھی عراق نے چڑھائی کا عندیہ دیدیا تھا۔ ترکی اور مصر بھی عراق کی زد میں تھے۔ ایران سے تو عراق کی پہلے ہی طویل جنگ ہو چکی تھی صورتحال یہ بنی کہ عراق ایک طرف تھا اور پوری اسلامی

دنیا دوسری طرف۔ ویسے بھی عراق میں بعث پارٹی کی حکومت تھی اور صدام حسین کھلم کھلا غیر اسلامی سیکولرازم کا دعویدار تھا۔ عملی طور پر آپ عراق کو ایک غیر اسلامی ملک قرار دے سکتے ہیں۔

اس صورتحال میں سعودی عرب اور عرب امارات نے اپنے تحفظ کے لئے پاکستان سے فوج مانگی، ہماری پانچ ہزار فوج پہلے ہی سعودی عرب میں موجود تھی مگر اس وقت کی بیوروکریٹک حکومت اس بات کا فیصلہ ہی نہ کر سکی کہ وہ کیا کرے حالانکہ بات بہت واضح تھی ایک تو ہمارا اخلاقی فرض تھا کہ ہم سعودی عرب کی مدد کو بھاگ اٹھیں۔ دوسرے اس میں ملک وملت کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ اس کے بعد ہمارے تمام بین الاقوامی قرضے ختم ہو سکتے تھے جن کی وجہ سے ہم آج تک اتنے ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ کویت اور سعودی عرب حق پر تھے اور عراق نے حملہ بھی ناحق کیا تھا مگر شومئی قسمت کہ ہمارے ہاں اس وقت ایک بہت ہی کم نظر اور بزدل حکومت موجود تھی جس کے فیصلہ غلام اسحاق خان کر رہے تھے جو صرف فائل ماسٹر تھے یہ چونکہ فوجی معاملہ تھا اس لئے جنرل اسلم بیگ مرزا کی آواز سب سے زیادہ بھاری بھر کم عمر تھی وہ نہایت ہی اوٹ پٹانگ تصور پیش کر کے عراق کے ساتھ مل کر امریکہ کی مزاحمت کی باتیں کر رہے تھے۔ سعودی عرب کا ساتھ چونکہ امریکہ دے رہا تھا تو جنرل بیگ امریکہ کی شکست کی بھی پیشن گوئیاں کر رہے تھے۔ تجوئی غیر نمائندہ اور نامزد وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے خاموش تھے اور اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس صورتحال میں میاں نواز شریف کی واحد آواز تھی جو بار بار سعودیہ کے حق میں اٹھ رہی تھی اور وہاں پاکستانی افواج بھجوانے کے لئے کہہ رہی تھی مگر ابھی تک نواز شریف کو قومی رہنما نہیں مانا جا رہا تھا۔ انہیں ابھی صوبائی لیڈر ہی گردانا جا رہا تھا لہٰذا ان کی آواز صدا بصحرا ٹھہری۔ بعد میں اس آفر (پیشکش) کا فائدہ مصر نے اٹھایا۔ اس نے اپنی 50 ہزار فوج سعودی عرب بھیج کر اپنے تمام قرضے معاف کروا لئے۔ پاکستان نے یہ سنہری موقع اپنے بیوروکریٹک حکمرانوں کی بیوقوفی اور بزدلی سے کھو دیا۔ یہ بزدلی پاکستان کی نہیں تھی اس بیوروکریٹک حکمران کی تھی جو ہم پر تھوپ دی گئی تھی۔ بعد میں عراق کو جب ذلت آمیز شکست ہوئی تو جنرل اسلم بیگ مرزا کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ قوم سے معافی مانگ کر مستعفی ہو جاتے کیونکہ انہیں نے اتنی بڑی غلطی کی تھی بلکہ اپنی اس حماقت پر وہ اترا تے ہی

رہے جیسے کہ ہمارے بہت سے احمق پہلے بھی 1971ء میں ایسا کرشمہ دکھا چکے تھے۔ مزے کی بات ہے 1990ء میں بھی ایک سکیورٹی کونسل موجود تھی اور 1971ء میں بھی موجود تھی مگر پاکستان کے لئے یہ کونسل کبھی کوئی مفید فیصلہ نہ کر سکی۔ اس پر مستزاد یہ کہ نیشنل سکیورٹی کونسل کی شان میں پھر بھی قصیدہ گوئی ہوتی رہتی ہے حالانکہ ان ہی ادوار میں پاکستان کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسلم بیگ کی قبیل کے لوگ کس ڈھٹائی سے نیشنل سکیورٹی کی افادیت بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اپنی ناک سے آگے تک نہیں دیکھ سکتے۔ بہرصورت پاکستان کو غیر نمائندہ حکومت کی وجہ سے جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہونا تھا وہ ہو گیا۔

بین الاقوامی سطح پر ہی بیوروکریٹک حماقتیں نہیں ہو رہی تھیں خود اندرون ملک سیاسی معاملات میں ایک عجیب وغریب صورتحال تھی۔ بینظیر کی حکومت کو غلام اسحاق خان اور اسلم بیگ نے ڈسمس تو کر دیا تاہم یہ خیال رکھا کہ نواز شریف کا سیاسی قد کاٹھ زیادہ ہی نہ بڑھ جائے مگر جب بے نظیر اپنے انتخابی دورہ پر باہر نکلیں تو ان کے بڑے بڑے جلوس دیکھ کر یہ لوگ ڈر گئے۔ جنرل رفاقت، اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خان الیکشنوں کی تخمینہ بازی پر بیٹھ گئے جس کی روشنی میں جنرل اسلم بیگ اور غلام اسحاق خان اتنے گھبرائے کہ ملک میں مارشل لاء لگنے کی باتیں ہونے لگیں بلکہ ہمارے دوست سراج منیر نے تو ایک ایسی سکیم لکھ کر سنا بھی دی۔ اس سوچ میں پیر پگاڑو، خواجہ خیر الدین اور عزیز الحق قریشی بھی شامل تھے جس کی مکمل تفصیل میری خودنوشت THE ULTIMATE CRIME میں موجود ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس خوفزدگی کے عالم میں اس فقیر کو بھی اسلام آباد طلب کیا گیا جہاں میں نے ایک ایک نشست کا تجزیہ کر کے بتایا کہ COP کی عظیم الشان کامیابی نوشتہ دیوار ہے۔ آپ لوگ کیوں مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔ دراصل بیوروکریسی اپنی محدود نگاہی سے باہر نکل ہی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ خوف وبیم کے درمیان لٹکی رہتی ہے۔ پاکستان کی بدحالی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہماری قسمت کے اکثر فیصلے یہ کوتاہ نگاہ بیوروکریٹ اور جرنیل ہی کرتے رہے ہیں جو دور کی کبھی سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کی بات بہت سمارٹ اور نقشہ باز ہوتی ہے مگر ان کے اندر گہرائی اور گیرائی کم ہی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی میاں نواز شریف ایک

واحد نمایاں لیڈر تھے جنہیں اپنی کامیابی کا یقین تھا ورنہ باقی لوگ بس یونہی ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

1990ء کے الیکشن میں COP کی جیت یقینی تھی۔ پیپلز پارٹی کا مخالف ووٹ اب میاں نواز شریف کی کوشش اور فراست کی وجہ سے یک جا ہو چکا تھا جو 1970ء میں مکمل طور پر تقسیم تھا اور 1988ء میں جزوی طور پر ورنہ تب بھی رزلٹ مختلف ہوتا لیکن اس وقت میاں نواز شریف کی بصیرت اور صبر کا کوئی سیاستدان موجود ہی نہیں تھا..... 1990ء میں بھی پیر پگاڑہ وغیرہ یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا کہ پی پی مخالف ووٹ یکجا ہو سکتا ہے۔ پیر صاحب اور بہت سے پرانے سیاستدان ایک ہی بات دہراتے کہ پارلیمانی بورڈ میں ٹکٹوں پر ہمیشہ جھگڑا ہو جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ہم سب جماعتوں کو ایسا کوٹہ مقرر کر کے مطمئن کر سکیں جو سب کے لئے قابل قبول ہو مگر میاں نواز شریف نے اس جدفعہ ایک نہایت ہی منفرد اور عملی فارمولا پیش کیا جس پر پہلے کبھی عمل نہیں ہوا تھا پہلے جماعتیں اپنا اپنا کوٹہ مانگتی تھی مگر میاں صاحب نے کہا کہ اس دفعہ ہر سیٹ کا فیصلہ کیا جائے کہ کون کہاں سے یقینی طور پر جیت سکتا ہے چاہے وہ امیدوار اے این پی کا ہو یا مسلم لیگ کا، این پی پی کا ہو یا جماعت اسلامی کا ہو۔ سیٹ اور امیدوار کے مطابق فیصلہ کیا جائے چنانچہ اس فارمولا پر کام شروع ہوا تو اتنی زیادہ جماعتوں کی پہلی ہی میٹنگ میں 200 میں سے 150 نشستوں کی امیدواری کا نہایت عمدگی اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو گیا۔ اگلی نشست میں باقی ماندہ 30 نشستوں کا فیصلہ ہو گیا اور آخر کار 17 ایسی نشستیں بچیں تھیں جنہیں اوپن چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح میاں نواز شریف کی سیاسی بصیرت کی وجہ سے اتنے بڑے گنجلک معاملے کا نہایت خوبصورتی سے فیصلہ ہو گیا جو پہلے وقتوں کے بڑے بڑے لوگ کبھی نہیں کر سکے تھے۔ یہ درست ہے کہ میاں نواز شریف نواز کو اس حوالے سے بہت اچھے اچھے مشورے مل رہے تھے اور انہیں کچھ سرکاری ذرائع تک بھی رسائی تھی مگر فیصلہ ہمیشہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ درحقیقت یہ سہولتیں غلام اسحاق خان اور اسلم بیگ کو بھی حاصل تھیں مگر سیاسی فیصلوں کے لئے سیاسی ذہن ہی اچھا رہتا ہے۔ اس اچھے متفقہ فیصلے کے بعد COP کا جیتنا کوئی محال امر نہیں تھا۔ لوگوں نے اس فیصلہ کو بہت پسند کیا اور ان کے لئے ون ٹو ون مقابلہ میں فیصلہ کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اس کے بعد دائیں بازو کی جیت بالکل یقینی تھی

اور پھر بھرپور انداز میں وہ جیت سامنے آئی۔ اس میں کوئی جادوگری، دھاندلی نہیں ہوئی تھی، صرف حکمت عملی درست ہوئی تھی۔

اس طرح 1990ء کے الیکشن میں COP کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ پی پی بری طرح ہار گئی صرف صوبہ پنجاب میں 115 قومی اسمبلی کی نشستوں میں سے COP کے حصہ میں 92 نشستیں آئیں۔ سندھ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی میں بٹ گیا مگر بہت سے لوگ صوبائی اسمبلی کے لئے آزاد بھی منتخب ہو گئے۔ سرحد اور بلوچستان کا پہلے جیسا ملا جلا رزلٹ آیا۔ یوں پنجاب نے میاں نواز شریف کو بھرپور مینڈیٹ دیا۔ صوبہ سندھ سے غلام مصطفیٰ جتوئی اور محمد خان جونیجو بھی الیکشن جیت کر قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ جونیجو صاحب کے لئے خاص طور پر نواز شریف نے ان کے حلقے کا دورہ کیا تب وہ جیت سکے۔ پنجاب میں مصطفیٰ کھر اور نوابزادہ نصر اللہ خان کی ٹھن گئی اور نوابزادہ اپنی سیٹ ہار گئے۔ میاں نواز شریف کی ہر دلعزیزی کی یہ صورت تھی کہ وہ جہاں بھی گئے وہ نشست COP جیت گئی۔ اس طرح میاں نواز شریف اس معرکہ میں ایک نمایاں لیڈر بن کر ابھرے اور اس کامیابی کا تمام تر سہرا ان کے سر تھا، وہ اپنی سیاسی راہ پر مضبوطی سے ڈٹے رہے وگرنہ جیسے پہلے بیان ہوا غلام اسحاق خان، اسلم بیگ اور کئی دوسرے جغادری راستے ہی میں دل ہار بیٹھے تھے اور مارشل لاء کا سوچ رہے تھے مگر سیاست کی ٹیڑھی راہوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہماری مستقل سرکار نے کوشش کی کہ کسی طرح جتوئی صاحب وزیر اعظم بن جائیں۔ ان کے حامی بڑے بڑے اور پرانے سیاستدان بھی تھے حالانکہ لوگوں نے مینڈیٹ نواز شریف کو دیا تھا۔ درحقیقت بیوروکریسی کبھی پاپولر لیڈر کو پسند نہیں کرتی۔ وہ ہمیشہ ایسے شخص کو ترجیح دیتی ہے جس کے اپنے سیاسی قدم کمزور ہوں تاکہ اسے حسب ضرورت توڑا مروڑا جا سکے۔ یہ ایک نازک وقت تھا اس موڑ پر آ کر جنرل اسلم بیگ اور غلام اسحاق خان دل ہی دل میں نواز شریف سے ناراض ہو گئے اور نواز شریف کو بادل نخواستہ وزیر اعظم بنانا پڑا۔ اس موقع پر جنرل حمید گل نے نواز شریف کے حق میں کافی رول ادا کیا۔ اس طرح 1990ء میں میاں نواز شریف بڑے بڑے بزرجمہروں کو پچھاڑ کر پاکستان کے وزیر اعظم بنے اور اپنے زندگی بھر کے خواب جو انہوں نے مادر وطن کی بہتری اور تعمیر کے لئے دیکھے تھے ان کی تعبیر میں جت گئے۔

وزیراعظم نواز شریف

میاں نواز شریف چونکہ اپنی محنت اور لگن سے بڑے بڑے سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے سینے پر مونگ دل کر ملک کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچے تھے، اس لئے انہیں اسلام آباد پہنچتے ہی ایک مخاصمانہ ماحول ملا۔ بیوروکریسی اپنے نئے وزیراعظم کی صلاحیتوں کو تول رہی تھی تو جنرل اسلم بیگ باقاعدہ ناراض تھے۔ عراق کے مسئلے پر سخت اختلاف تھا۔ غلام اسحاق خان کے دل میں میل تھی۔ مصطفیٰ جتوئی، مصطفیٰ کھر، نوابزادہ نصر اللہ خان، اکبر بگٹی اور کئی دوسرے بڑے بڑے سیاستدان نوجوان نواز شریف کے رقیب ہی نہیں حاسد بھی بن بیٹھے تھے۔ ظاہراً یہ لوگ نواز شریف کے ساتھ تھے مگر دل میں کڑھتے تھے حالانکہ نوجوان نواز شریف کا نام وزارت عظمیٰ کے منصب کے لئے محمد خان جونیجو نے تجویز کیا اور مصطفیٰ جتوئی نے تائید کی تاکہ سندھ کارڈ کا قضیہ ختم ہو مگر دل صاف نہیں تھا۔ اہل نظر نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ نوجوان وزیراعظم ان گرگان باراں دیدہ میں پھنس گیا ہے بلکہ ہمارے ایک دوست نے اصرار کیا کہ نوابزادہ نصر اللہ خان کو ضمنی انتخاب کے ذریعے اسمبلی میں لایا جائے وگرنہ باہر رہ کر وہ بہت زیادہ خطرناک ثابت ہونگے۔ وہ حکومتیں گرانے کے بعد ماہر ہیں مگر نواز شریف کے چاہنے کے باوجود یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ غلام حیدر وائیں نوابزادہ صاحب کو احراری ہونے کی وجہ سے سخت ناپسند کرتے تھے اور وائیں صاحب جو

پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے انہیں بھی نواز شریف ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

صوبہ سندھ کی سیاسی صورتحال عجیب وغریب تھی پورا صوبہ سیاسی طور پر پی پی اور ایم کیو ایم میں تقسیم تھا اور کافی تعداد میں آزاد ایم پی ایز بھی وہاں موجود تھے۔ پاکستان مسلم لیگ کی سیاسی حاضری وہاں نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا صوبہ سندھ کی حکومت سازی میں میاں نواز شریف کا سیاسی اختیار تقریباً صفر تھا۔ غلام اسحاق خان نے وہاں ایک نہایت ہی چالاک مگر بدنام سیاستدان جام صادق علی کو پیپلز پارٹی کو سبق سکھانے کے لئے آگے کر رکھا تھا جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند نہیں تھا اور میاں نواز شریف کی طبیعت کے بالکل الٹ تھا۔ میاں نواز شریف اس کے ہتھکنڈوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے مگر وہ پی پی کو بھی وہاں برسر اقتدار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ جام صادق علی نے بینظیر کے خاوند آصف علی زرداری کو مختلف الزامات میں جیل میں بند کر رکھا تھا اور کئی دوسرے مظالم کی کہانیاں بھی منظر عام پر آ رہی تھیں۔ صدر مملکت نے اپنے داماد کو وہاں کا ''پرائم منسٹر'' بنا رکھا تھا جو بہت ہی ظالم شخص ہے۔ نواز شریف یہ سب دیکھ کر بہت کڑھتے مگر اس معاملے میں بالکل بے اختیار تھے۔ وہ اکثر کہتے کہ میرا صوبہ سندھ کی انتظامیہ سے کوئی سروکار نہیں وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا گناہ غلام اسحاق خان کی گور گردن پر ہے۔ غلام اسحاق خان ظاہراً ایک اصول پسند اور ایماندار تجربہ کار بیوروکریٹ تھے مگر بہت زیادہ ہٹ دھرم اور ضدی بھی۔ ایک دفعہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ پی پی کو رگڑا لگانا ہے تو پھر وہ تمام حدود و قیود نہایت اصول پسندی اور یکسوئی کے ساتھ پھلانگتے گئے۔

صدر غلام اسحاق خان کا تعلق چونکہ صوبہ سرحد سے تھا اس لئے وہاں تو ان کے لئے اپنی مرضی کی حکومت بنانا زیادہ دشوار نہیں تھا لہٰذا میر افضل کی سربراہی میں انہوں نے اپنی حکومت بنوا ڈالی۔ میر افضل اگرچہ پاکستان مسلم لیگ میں ہی تھے اور پی پی میں سے ہو کر وہاں پہنچے تھے تاہم ان کی اصل وفاداری غلام اسحاق خان سے تھی۔ یہی صورتحال بلوچستان کی تھی جہاں اکثر حکومتیں ملی جلی قبائلی وفاداریوں اور تعلقات کی گود سے جنم لیتی ہیں۔ یوں غلام اسحاق خان پنجاب کے علاوہ باقی تینوں صوبوں کے اصل حاکم تھے۔ میاں نواز شریف محض نام کے وزیر اعظم

تھے اور اصل اختیار اور اقتدار صدر کے پاس تھا ویسے بھی آٹھویں دستوری ترمیم نے صدر کو بے انتہا اختیار دے رکھے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ غلام اسحاق خان نے اپنی سیاسی قوت بھی مجتمع کر لی تھی اگرچہ یہ تاثر کہ میاں نواز شریف اسٹیبلشمنٹ کے آدمی تھے بالکل غلط تھا درحقیقت وہ اصل آدمی یعنی بیورو کریسی کے بابا غلام اسحاق خان تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں میاں نواز شریف پہلی دفعہ وزیر اعظم بنے۔ میاں نواز شریف ایسے پہلوان تھے جس کے ہاتھ پاؤں باندھکر اسے اکھاڑہ میں چھوڑ دیا جائے اور مسائل کے عفریت کے ساتھ لڑنے کو کہا جائے۔

میاں نواز شریف کے لئے اس وقت سب سے پہلا مسئلہ مشرق وسطیٰ میں عراق کویت جنگ کا درپیش تھا جو عراق امریکہ جنگ کی شکل اختیار کر چکا تھا جیسے پہلے بیان ہوا عبوری حکومت اور خاص طور پر جنرل اسلم بیگ کی وجہ سے ہم امریکہ اور ساری اسلامی دنیا کو ناراض کر بیٹھے تھے۔ پریسلر ترمیم کی پابندیاں ہم پر عائد ہو چکی تھیں اور اپنے بین الاقوامی قرضے معاف کروانے کا موقع بھی کھو بیٹھے تھے۔ اس ناگفتہ بہ صورتحال سے نکلنے کے لئے میاں نواز شریف نے سعودی عرب اور عرب امارات وغیرہ کا دورہ کیا تاکہ بگڑی کو مزید بگڑنے سے بچا سکیں اور پچھلے نقصان کی تلافی کر سکیں۔ ان دوروں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہم مزید قومی نقصان سے بچ گئے مگر جنرل اسلم بیگ نے میاں صاحب کی اس حرکت کو بالکل پسند نہ کیا اور امریکہ عراق جنگ سے ابھیر جذباتیت کو میاں صاحب کے خلاف اور اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ 20 فروری 1991ء کو تو وہ کھل کر حکومت وقت کی اس پالیسی کے خلاف اخبارات میں بولے اور عراق میں امریکہ کی مکمل شکست کی پیشین گوئی کی مگر میاں صاحب اپنی راہ راست پر ڈٹے رہے۔ اس وقت اہل خبر کا یہ اندازہ تھا کہ اگر جلد ہی عراق کا بھرکس نہ نکل جاتا تو جنرل اسلم بیگ میاں نواز شریف کا تختہ الٹ دیتے مگر اللہ کا کرنا کہ ہمارے جنرل صاحب کے تمام اندازے اور خیالات نقش بر آب ثابت ہوئے اور انہیں شرمندگی اٹھانا پڑی۔ وہ لوگ جو نیشنل سکیورٹی کونسل کی افادیت ہر وقت رٹتے رہتے ہیں ان کے لئے اس واقعہ میں بھی سبق ہے کیونکہ ڈنڈا برداری اور معاملہ فہمی میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اسی لئے تو چرچل نے کہا تھا کہ جنگ ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے اسے محض جرنیلوں کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

بہر صورت میاں نواز شریف صدر غلام اسحاق خان اور چیف آف آرمی سٹاف کے شکنجے میں کسے رہنے کے باوجود ملک وملت کی بھلائی کی راہ پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے سعودی عرب اور امارات سے تعلقات سنوار کر تیل کا بندوبست کیا تاکہ ہماری معیشت کا پہیہ چلتا رہے۔

صدر غلام اسحاق خان اور اسلم بیگ نے ہمارے نیوکلیئر پروگرام پر امریکی دباؤ کی وجہ سے بریک لگا دی تھی، میاں صاحب نے نہایت خاموشی سے یہ پاؤں اٹھوایا اور اسے آہستہ آہستہ چلتے رہنے کا اشارہ دیا۔

اس کے بعد نہایت خاموشی کے ساتھ ملک کے چاروں صوبوں کی منتخب قیادت کو اکٹھا کیا اور ملک کے سب سے اہم مسئلہ، دریاؤں کے پانی کی تقسیم کو حل کرنے کے لئے اقدامات کئے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے بہت زیادہ صوبائی خلفشار تھا اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہت عرصہ بعد چونکہ صوبہ پنجاب سے ایک صاحب نظر قیادت ابھری تھی اس لئے اس نے پنجاب کے حقوق میں سے چھ فیصدی کی قربانی دیکر یہ نوے سالہ پرانا مسئلہ حل کر دیا تاکہ قومی یکجہتی بڑھ سکے۔ اگرچہ پنجاب سے کچھ لوگوں نے اس پر احتجاج بھی کیا مگر میاں صاحب نے اعلیٰ قومی مفاد کی خاطر اس کی پرواہ نہ کی اس واٹر اکارڈ کی وجہ سے پہلی دفعہ تمام صوبوں کی مرضی سے آبی ذخائر کی خاطر مختلف ڈیم بنانے کی راہ نکلی جن میں کالا باغ ڈیم بھی شامل تھا۔ وہ کام جو جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء نہیں کر سکا تھا وہ میاں نواز شریف کی بردباری اور بصیرت نے کر دکھایا۔ انہوں نے آئندہ کے جھگڑے ختم کرنے کے لئے ایک باقاعدہ واٹر ریگولیٹری اتھارٹی بھی بنا دی تاکہ یہ گنجلک مسائل ساتھ ساتھ سلجھتے رہیں۔ میاں صاحب جو بھی کام کرتے ہیں اس کے پریکٹیکل پہلو پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں لہٰذا انہوں نے پانی کی تقسیم کا ایک قابل قبول اور قابل عمل حل نکال کر سب کو حیران کر دیا۔

اس کے بعد انہوں نے یہی معجزہ مرکز اور صوبوں کے درمیان مالی وسائل کی تقسیم میں کر دکھایا اور نہایت ہی قابل قبول اور قابل عمل فنانس ایوارڈ دیا جس میں تمام صوبوں کی رضامندی شامل تھی۔ ایسا میکنزم تیار کیا جو خود بخود عمل پذیر ہو اور صوبوں کے درمیان کسی قسم کی غلط فہمی اور تناؤ پیدا نہ ہو سکے۔ اس طرح تمام صوبوں کو واضح طور پر علم

ہو گیا کہ مالی وسائل میں سے ان کے حصے میں کیا کیا آئے گا تا کہ وہ اپنے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ اس ایوارڈ سے قبل صوبوں کے درمیان ایک مسلسل سرد جنگ رہتی تھی جسے مرکز اپنے رعب دبدبے یا مارشل لائی ڈنڈے سے کنٹرول کرتا تھا مگر اس ایوارڈ کے بعد اس قسم کی بے ہودگی کی کوئی ضرورت نہ رہی اسے کہتے ہیں سیاسی فراست جو ہم نے میاں نواز شریف کے اندر بدرجہ اتم دیکھی۔

پانی اور مالی وسائل کی تقسیم کے علاوہ پن بجلی کی ترسیل اور رائلٹی پر بھی مختلف صوبوں میں بہت زیادہ اختلاف رائے تھا۔ خاص طور پر صوبہ سرحد کا اس پر بہت زیادہ اصرار تھا۔ اس کا صحیح اور منصفانہ فیصلہ بھی نواز شریف ہی کی بلیغ نگاہ کا محتاج تھا اور وہ تسلی بخش انداز سے طے پا گیا جبکہ ہماری اتنی زیادہ بیوروکریٹک اور مارشل لائی ماہروں سے بھری حکومتیں حل نہیں کر سکیں تھیں۔ درحقیقت ایسے معاملات سیاسی نگاہ ہی حل کر سکتی ہے۔ بیوروکریسی تو ہمیشہ ایک محدود دائرے میں گھومتی ہے۔ وہ مسائل کو الجھاتی خوب ہے سلجھاتی نہیں۔ مسائل کی گہرائی میں جھانکنے کی بجائے صرف اوپر سے ٹیپ ٹاپ کرتی رہتی ہے۔

اسی طرح نواز شریف کی نگاہ صوبہ بلوچستان کے آبی وسائل بہتر کرنے پر پڑی اور وہاں چھوٹے چھوٹے آبی ذخائر بنانے کے علاوہ ٹیوب ویل لگانے کی وسیع سکیمیں شروع کروائیں جن سے وہاں کی زراعت کو ایک زبردست مہمیز لگی۔ آج کل آپ بلوچستان سے جس پھل فروٹ اور پیاز کی بھرمار دیکھتے ہیں میاں نواز شریف کی دوررس نگاہوں ہی کا کرشمہ ہے مگر ہمارے اہل خرد نے اس وقت اسے قومی وسائل کا ضیاع قرار دیا تھا۔ پن بجلی کے علاوہ سورج اور ہوا سے بجلی پیدا کرنے کی بہت سی سکیمیں بھی تیار ہوئیں جو ایک لمبا کام ہے۔ اس پر ابھی تک کام ہو رہا ہے مگر بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ یہ کام بھی نواز شریف ہی نے شروع کیا تھا۔

صوبہ سندھ کا ایک بہت ہی پرانا معاشرتی مسئلہ بے زمین ہاریوں کا تھا جو وڈیروں کی صوابدید پر زمینوں میں ہل چلاتے اور زندہ رہ سکتے تھے۔ اس سے بہت زیادہ سماجی مسائل بشمول جرائم وڈاکہ زنی کا کلچر پنپ رہا تھا اور سماجی بے انصافی کی انتہا تھی۔ وہاں ابھی تک ایک قسم کی غلامی جاری وساری تھی۔ میاں نواز شریف نے اس

مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈالا اور بے زمین ہاریوں کو مالکانہ حقوق اور فصل اگانے کے لئے قرضوں کی سہولتوں کا اہتمام کیا۔ اس سے ظاہر ہے وہاں کے وڈیروں کے مفادات پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے اس کی بہت زیادہ مخالفت شروع کر دی۔ مزے کی بات ہے کہ وہاں صوبائی حکومت کا سربراہ بھی ایک بہت ہی ظالم اور سفاک وڈیرہ جام صادق علی تھا اور اسے صدر غلام اسحاق خان کی آشیر باد بھی حاصل تھی۔ اس بیوروکریسی اور وڈیرہ شاہی کے اس زبردست گٹھ جوڑ کے باوجود ہاہمت اور پرعزم نواز شریف نے ہاریوں میں سرکاری زمین تقسیم کرنے کا کام کر دکھایا۔ ہمارے معروف ''سمجھدار'' لوگ اس وقت بھی کہہ رہے تھے کہ اس ''گناہ'' کی وجہ سے یہ مفاد پرست ٹولہ نواز شریف کو زندہ نہیں چھوڑے گا مگر دھن کے پکے نواز شریف نے اپنا قدم پیچھے نہ ہٹایا اور جام صادق علی جیسے انسان کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہی رہے۔ اس کے لئے بے چارے نواز شریف کو پتہ نہیں کیا کیا فنکاری کرنی پڑی۔ کبھی ترغیب، کبھی تحریص اور کبھی خفگی تمام تیر ہی چلانے پڑے۔ یوں ایک خاموش انقلاب کی طرف قدم بڑھتے گئے۔

میاں نواز شریف نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں جو سب سے بنیادی اور بڑا کام کیا وہ بڑی بڑی صنعتوں کی نج کاری کا عمل تھا۔ ان کا اپنا پس منظر صنعتی تھا اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سرکاری سیکٹر میں صنعتیں چلنے سے کتنی بدنظمی اور بداعمالی ہوتی ہے۔ سرکاری افسروں کے غلط رویوں کی وجہ سے پیداواری عمل نہایت سست رہتا ہے۔ مزدور من مانی کرتے ہیں اور افسران رشوت خوری، کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اس طرح ملکی معیشت تباہ ہو چکی تھی لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ بتدریج بڑی بڑی سرکاری صنعتوں کو پرائیویٹائز کر دیا جائے۔ بہت سی صنعتوں کو ذوالفقار علی بھٹو نے نیشنلائز کیا تھا تاکہ حکومت کا اثر و رسوخ اور گرفت اس شعبے میں بھی بڑھ جائے اور وہ اپنی مرضی کے منیجر اور افسران لگا کر اپنے سیاسی مخالفوں کو کرش کرنے کی استطاعت بڑھا سکیں اور دوستوں کو نواز سکیں۔ یہ اصل میں سیاسی رشوت اور خریداری کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔ نواز شریف جب وزیراعظم بن گئے تو وہ بھی اپنے اختیارات اور اثرات بڑھانے کے لئے اس کام کو جاری کر سکتے تھے مگر اس مرد قلندر نے اس

طرح کی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ملک کی تباہ حال معیشت کو دوبارہ زندہ توانا کرنے کو ترجیح دی۔ وہ سیاسی کھیل تماشے کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ جب انہوں نے یہ کام شروع کیا تو ایک ہاہا کار مچ گئی۔ مفاد پرست ٹولہ جسے اپنی بڑی بڑی نوکریاں اور رشوتیں جاتی نظر آئیں تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ نواز شریف تو اس عمل سے اقربا پروری اور دوست نوازی کر رہے ہیں حالانکہ اس میں ذرہ بھر سچ نہیں تھا۔ وہ بہت محتاط تھے لیکن مفاد پرستوں کو اس سے کیا۔ وہ تو شور مچا کر اس عمل کی رفتار سست کرنا چاہتے تھے چونکہ اس تبدیلی سے بیوروکریسی کے "رزق" پر لات پڑتی تھی اس لئے اس نے شور کے علاوہ اس عمل میں روڑے اٹکانے شروع کر دیئے اور یوں کہا گیا، کہا گیا کہ ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا مگر نواز شریف مصمم ارادوں کے انسان ہیں وہ پیچھے نہ ہٹے اور وہی بیوروکریسی آہستہ آہستہ نج کاری کا راستہ بنانے لگی۔

اس حوالہ سے چودھری شجاعت حسین وزیر داخلہ نے ہمیں ایک بڑی ہی دلچسپ بات بتائی۔ کہتے ہیں اے جی این قاضی جو بہت ہی آزمودہ و تجربہ کار سول سرونٹ ہیں انہوں نے بھٹو کے کہنے پر نیشنلائزیشن کی سکیم تیار کی تھی اور اب نواز شریف کے اصرار پر وہ نج کاری کی سکیم بنا رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے کچھ اڑی کی اور تیار نہ ہوتے جب دیکھا کہ وزیر اعظم مصر ہیں تو اگلی دفعہ ایک زبردست جامع اور عملی سکیم بنا کر لے آئے..... میں نے قاضی صاحب سے پوچھا جناب آپ اگلے دن نج کاری کے خلاف اتنی زبردست دلیلیں دے رہے تھے اور اب اسی زور سے آپ نج کاری کے حق میں بول رہے ہیں۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ بھئی ہم تو حکمرانوں کے ہاتھ میں ہتھیار ہیں جس طرف چاہیں آپ اسے چلا لیں مگر ہتھیار اچھا ہی ہو تو بہتر ہے۔

میاں نواز شریف نے اس کار خیر کی انجام دہی میں پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ان کے راستے میں بہت رکاوٹیں آئیں مگر وہ نہایت ہمت سے انہیں عبور کرتے گئے۔ لوگوں نے انہیں بدنام کرنے کی بھی کوشش کی بلکہ بہت سی بدنامی خواہ مخواہ ان کے کھاتے میں آئی مگر وہ جو کچھ اپنی قوم کے حق میں بہتر سمجھتے تھے وہ کرتے گئے۔ اس زمانے میں میں نے بڑے بڑے سی ایس پی افسران کو نواز شریف کے خلاف صرف اس لئے باتیں کرتے سنا کہ وہ اس

طرح ان کے اختیارات کم کر رہے تھے۔ انہیں ملکی معیشت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تعلق تھا تو صرف اپنے اختیارات سے۔ اسی لئے بیوروکریسی کی سوچ کبھی قومی نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات یا کلاس کے اردگرد گھومتی ہے اور اس گھٹیا سوچ کی وجہ سے آکاس بیل کی طرح اسی درخت کو چاٹتی رہتی ہے جس پر وہ سوار ہو کر اونچا اٹھتی ہے۔

بیوروکریسی کے ہاتھ میں سب سے بڑی وقت وہ قاعدے قانون ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنی صوابدید سے توڑ مروڑ کر لوگوں کو تنگ کر سکتے ہیں اور اپنی مطلب براری اور رشوت خوری کی راہیں نکالتے ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ جتنے زیادہ قاعدے قانون اتنی ہی زیادہ رشوت۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے صدر ریگن نے کہا تھا کہ ''بہترین حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکمرانی کرے THE LESAT GOVERNMENT IS THE BEST GOVERNMEN حکومت جتنی زیادہ دخیل ہوگی اتنی ہی زیادہ عوام کی کم بختی آئے گی۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ حرام خور کو لہریں گننے پر لگا دیں وہ وہاں بھی پیسے بنانے سے باز نہیں آئے گا۔ سنا ہے پچھلے زمانہ میں ایک بادشاہ اپنے ایک رشوت خور نوکر سے اتنا تنگ آیا کہ اسے سمندر کی لہریں گننے پر لگا دیا کہ یہاں تو پیسے نہیں بنا سکے گا۔ اس نے تمام گزرتے جہازوں کا راستہ روک دیا کیونکہ اس سے لہروں کو گننے میں گڑبڑ ہو جاتی تھی، جہاز کے مالک اسے رشوت دیتے تب انہیں گزرنے دیتا۔ ظاہر ہے جہازوں کے تاجران بڑے امیر لوگ تھے وہ رشوت بھی کثیر دینے لگے اور وہ شخص بہت زیادہ مالدار ہو گیا۔ یہی حال ہماری بیوروکریسی کا ہے آپ بچوں کی مزدوری پر قدغن لگائیں، ظاہراً یہ کتنا اچھا قانون ہے مگر لیبر انسپکٹر کی موج بن جاتی ہے اور اس کے نفاذ و عدم نفاذ یا جزوی نفاذ سے بھی پیسے بنا لیتا ہے۔ اس لئے اہل حکمت نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ قاعدے قانون کے تمام مضمرات کو دیکھے بھالے بغیر بہت سے قوانین کا بوجھ عوام پر نہیں لادنا چاہئے۔ اس صحت مند فکر کے تحت نواز شریف نے پاکستان میں پہلی دفعہ گرین چینل کا آغاز کیا تاکہ جو مسافر باہر سے آتے ہیں خاص طور پر وہ محنت کش پاکستانی جو اپنے بال بچوں سے دور رہ کر اتنی مشکل سے مادر وطن کے لئے قیمتی زرمبادلہ کماتے ہیں ان کی کسٹمز کے ہاتھوں توہین و تذلیل نہ ہو۔ اگر ان کے پاس کوئی قابل ڈیوٹی چیز نہ ہو تو وہ بلا روک ٹوک وہاں سے گزر جائیں اور کسٹمز والے ان

کی چیکنگ نہ کریں۔ اس ایک بات پر کسٹمز کے عملے میں اتنا غم وغصہ پھیلا کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ بذریعہ رشوت کما رہے تھے اب کیا کریں بس پھر کیا تھا اخباروں میں شور مچ گیا کہ نواز شریف سمگلنگ کی سرپرستی کر رہا ہے۔ اس طرح سمگلنگ نہیں رشوت ختم ہو رہی تھی۔ تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ رشوت سخت سزاؤں سے کم نہیں ہوتی عقل کے طور پر طریقوں سے کم ہوتی ہے۔ سمگلنگ کے تدارک کے لئے نواز شریف نے کسٹمز ڈیوٹیوں میں اس طرح کی بیشی کی کہ سمگلنگ کا مارجن کم سے کم ہو جائے اگر سمگلنگ میں خطیر منافع ہی نہ ہو تو سمگلر کا دماغ خراب ہے کہ وہ اتنا زیادہ خطرہ مول لے لہٰذا نواز شریف نے نہایت خاموشی سے سمگلنگ کی جڑ خشک کرنا شروع کر دی۔

اب کسٹمز والے کیا کریں؟ انہوں نے شور مچا دیا کہ گرین چینل کے ذریعے ملک میں بہت جدید اور خطرناک اسلحہ سمگل ہو رہا ہے۔ ان دنوں کلاشنکوف وغیرہ کی وجہ سے امن عامہ بھی مخدوش ہو رہا تھا۔ اس کی اصل وجہ تو افغانستان کی جنگ تھی مگر یار لوگوں نے اسے گرین چینل کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ملک کی تمام انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئیں۔ اس شور پر نواز شریف نے ایک نمائندہ میٹنگ بلائی۔ میں اس وقت پنجاب کا آئی جی پولیس تھا اور اس معاملے سے براہ راست متعلق تھا۔ سب نے یہی کہا کہ تباہی آ گئی ہے ملک میں بہت زیادہ اسلحہ ہے اور یہ سب گرین چینل کی وجہ سے ہے۔ جب میری باری آئی تو میں نے اعداد وشمار کے ذریعے ثابت کر دیا کہ یہ مفروضہ مکمل طور پر ہوائی ہے کیونکہ افغانستان اور قبائلی علاقہ کی وجہ سے اندرون ملک اسلحہ باہر کے ملکوں سے کئی گنا سستا ہے آسانی سے ہر جگہ دستیاب ہے سمگلر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ گھاٹے کا سودا کرے۔ جب میں نے ایک ذمہ دار پولیس افسر کی حیثیت سے یہ بات کہی تو جس نگاہ سے مجھے اس محفل کے حاضرین نے دیکھا وہ قابل دید تھا۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ مجھے کچا چبا جاتے۔ اسے کہتے ہیں بیوروکریسی کی بھول بھلیاں اور اہل خیر کے لئے الٹی بدنامیاں۔ اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کسٹمز کے محصولات میں اس طرح کی زمینی یا ہوائی اڈوں کی چیکنگ سے صرف ایک فیصد آمدنی ہوتی ہے اور مزے کی بات ہے کہ گرین چینل کھلنے کے چار مہینے بعد وہ آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اب لوگ رضاکارانہ طور پر ڈیوٹی ادا کر رہے تھے ایک تو آنے والے کی عزت میں اضافہ ہو گیا تھا اور دوسرے نواز شریف نے ریٹ بھی معقول کر دیئے تھے۔

اسی طرح نواز شریف کی حکومت نے انکم ٹیکس کی مد میں بھی کئی انقلابی اصلاحات کیں اور خود کار تشخیص کا طریقہ متعارف کر کے محکمہ انکم ٹیکس محکمہ کے عمال کے صوابدیدی اختیارات کم کر دیئے جو ٹیکس دہندہ بیس فیصد آمدنی کا اضافہ ظاہر کرتا اس کے گوشواروں کی پڑتال نہ ہو پاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاجر کلاس میں خوشی کی ایک زبردست لہر پھیل گئی اور ٹیکس دینے کی طرف زیادہ راغب ہو گئے۔ انہیں ٹیکس دینے میں عذر نہیں تھا۔ انہیں ٹیکس کے اکٹھا کرنے کے طریقہ کار پر اعتراض تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف معیشت میں جان پڑنا شروع ہو گئی بلکہ سرکار کا ریونیو بھی بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس اقدام سے انکم ٹیکس اور کسٹمز کے دفتروں کی پرانی رونقیں ختم ہو گئیں اور ان کے کارندوں کی ''آمدنی'' کم ہو گئی۔

ان اقدامات کے خلاف بدعنوان بیوروکریسی کیا بات کرے؟ آخر نہایت ہی منظم طریقے سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ چونکہ نواز شریف کا تعلق بزنس کلاس سے ہے گا اس لئے یہ انہیں نواز رہا ہے اور خود پیسہ بنا رہا ہے۔ بڑی بڑی فیکٹریاں اونے پونے بیچ کر دوستوں کے نام لگوا کر خود ہی خرید رہا ہے۔ اصل بات یہ نہیں تھی اصل بات نواز شریف کا وہ سائنٹفک طریقہ تھا جس کے ذریعے وہ حرام خور اہلکاروں کی حرام کمائی کے راستے روک رہے تھے مگر انہیں بدنام کرنا شروع کر دیا گیا۔ اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ یہاں ڈانٹنے کی صورت بدنام کرنا نکلی اور یہ بات کہنا آسان ہو گئی کیونکہ ایک تو میاں نواز شریف بدقسمتی سے امیر تاجر خاندان سے تھے اور دوسرے وہ سیاست میں آ گھسے تھے، اور مصیبت یہ کہ وہ ایک خاموش انقلابی پروگرام رکھتے تھے۔ تبدیلی بیوروکریسی کے لئے زہر قاتل ہے۔ انقلاب آسان چیز نہیں ہے اس کے نقیب کو سب کچھ تیاگ دینا پڑتا ہے گوتم بدھ تو تخت تک چھوڑ دیتا ہے مگر نواز شریف ماؤزے تنگ تھے اور نہ ہی گوتم بدھ۔ وہ قائداعظم کے پیروکار تھے۔ اندر باہر سے ایک، امیر ہیں تو امیر ہیں، وہ گاندھی جی کی طرح لنگوٹی نہیں پہن سکتے تھے۔ بیوروکریسی یہ کچھ کیسے برداشت کر سکتی تھی اس پر مستزاد یہ کہ نواز شریف نے غیر ضروری سرکاری محکموں کو کم کرنے کا حکم صادر فرما دیا تاکہ خزانے پر غیر ضروری بوجھ کم ہو سکے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنا سیکرٹریٹ ہلکا کیا۔ اس طرح بیوروکریسی میں ایک سراسیمگی

پھیل گئی۔ دراصل ہماری مختلف حکومتوں نے وقتاً فوقتاً اپنے چہیتوں کو سرکاری نوکریاں دینے کے لئے یا تو بہت سے غیر ضروری محکمے کھول دیئے تھے یا پھر موجود محکموں میں بلاوجہ اضافہ کر دیا تھا۔ پہلی فیز میں خود نواز شریف بھی اس گناہ میں شامل رہے تھے مگر اب انہیں زبردست احساس ہوا کہ اس غیر ذمہ داری سے ملک کی معیشت بحال نہیں ہو سکتی لہٰذا نواز شریف نے یہ سخت اور تلخ فیصلہ کر لیا کہ حکومت کا سائز کم کیا جائے اور وسائل کا ضیاع روکا جائے۔ نج کاری سے قرضے واپس ہوں اور اس عمل سے اندرون ملک بچت ہو مگر مفت خور سرکاری ملازموں میں اس کا بہت ہی بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے یہ ان کے رزق کا مسئلہ تھا۔ اس لئے یہ لوگ اس "انقلابی" نواز شریف کے سخت مخالف ہو گئے اور اتنا شور مچایا کہ انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا مگر انہوں نے آئندہ کی بھرتی بند کر دی جس سے نوجوانوں کی بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ بیروزگاری کا علاج انہوں نے خود روزگار سکیموں میں ڈھونڈا اور نچلے طبقے کے چھوٹے کاروباری لوگوں کے لئے چھوٹے قرضوں کی سکیم شروع کی۔ یلو کیب سکیم کو فروغ دیا یہ اقدامات بہت اچھے تھے مگر ہمارے ہاں ابھی تک سیلف ایمپلائمنٹ کا کلچر نہیں تھا۔ انگریز کی غلامی نے ہمیں بابو گیری ہی کے لئے تیار کیا تھا اور ہم اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ میاں نواز شریف ہی کی دوررس نگاہ نے فیصلہ کیا کہ غلامی کے اس کلچر کو بدل کر نوجوانوں کو ان کے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی ترغیب دی جائے۔ اس اقدام کی اتنی زیادہ مخالفت ہوئی کہ بابائے بیوروکریسی نے انہیں پڑھے لکھے نوجوانوں کو ڈرائیور بنا کر ان کی تضحیک کرنے کے مطابق ٹھہرایا حالانکہ اس سکیم کے ذریعہ بہت سے نوجوانوں کو اپنے ہی گھروں میں نہ صرف روزگار مل گیا بلکہ عوام کی سہولت کیلئے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا مگر ذہن اور کلچر بدلنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ درمیانی عرصہ ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تبدیلی لانے والے کے لئے بھی اور جن کی خاطر تبدیلی لائی جا رہی ہے ان کے لئے بھی مگر نواز شریف بہت کم وقت میں بہت زیادہ تبدیلیاں لا رہے تھے اور وہ پرانے لوگوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھیں جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے جدید اور قدیم کا ٹکراؤ اب صاف نظر آ رہا تھا۔

اسپ عمل

میاں نواز شریف چونکہ عمل کی دنیا کے آدمی تھے، اس لئے وہ غیر ضروری کاموں میں الجھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ محترمہ بینظیر اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جو مقدمات غلام اسحاق خان نے بنوائے تھے اس میں انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی اور انہیں جوں کا توں فطری قانونی رفتار پر چلنے دیا۔ دراصل وہ سیاست میں اچھی صحت مند روایات قائم کرنے کے حق میں تھے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنا پورا غم وغصہ نواز شریف اور ان کے خاندان پر نکالا تھا اور انہیں مالی طور پر تباہ کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی مگر نواز شریف نے شرافت کی سیاست کے جذبہ کے تحت اس طرف زیادہ دھیان دینا زیادہ پسند نہ کیا اور حزب اختلاف سے قومی امور خاص طور پر قومی تعمیر نو کے امور میں تعاون طلب کیا مگر بے نظیر کا رویہ کوئی حوصلہ افزاء نہیں تھا۔ وہ نواز شریف کو کسی طرح بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھیں اور مزے کی بات ہے کہ اس شرافت کے سفر میں میاں نواز شریف صدر غلام اسحاق خان کو بھی

ناراض کر بیٹھے۔ انہیں شک ہو گیا کہ نواز شریف اور بے نظیر مل کر آٹھویں دستوری ترمیم ختم کر کے ان کے اختیارات کم کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر بے نظیر کا اصرار تھا کہ وہ آٹھویں ترمیم ختم کرنے میں نواز شریف کا ساتھ اسی صورت میں دیں گی اگر نواز شریف ان کے اور آصف زرداری کے خلاف دائر کردہ کرپشن ریفرنسز واپس لے لیں۔ یہ نواز شریف کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ایک تو اس طرح وہ کرپشن کے مددگار نظر آتے، دوسرے وہ صدر کو بہت زیادہ ناراض کر لیتے۔ شیخ انور زاہد پرنسپل سیکرٹری نے انہیں ریفرنس واپس لینے کا مشورہ بھی دیا مگر نواز شریف نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف اپنی دلچسپی کم کر دی مگر غلام اسحاق خان نے پھر بھی نواز شریف کے اس ناکردہ ''گناہ'' کو کبھی نہیں بخشا۔ حالانکہ بے نظیر کے انتقام کا تختہ مشق نواز شریف بنے رہے تھے۔ غلام اسحاق خان نے تو آخر میں ان کی حکومت ہی ڈس مس کر دی۔ برخاستگی سے پہلے غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو مختلف موضوعات پر نہایت سخت خطوط لکھنے شروع کر دیئے تھے کہ آئندہ بوقت ضرورت کام آئیں گے۔ ریکارڈ بنانا بیوروکریٹس کا من بھاتا مشغلہ ہوتا ہے۔ ان خطوط کے موضوعات میں زیادہ تر وہ معاملات تھے جو نواز شریف معاشیات کو دقیانوسی اور بے محل، بے کار قواعد سے آزاد کرنے کے لئے کر رہے تھے تاکہ ہماری بوسیدہ اور مری ہوئی معیشت میں جان پڑ جائے۔ ان امور پر بھی صدر اسحاق کی پرانی سوچ کو اعتراض تھا لیکن اصل معاملہ بے نظیر کے خلاف نواز شریف کے انتقامی اقدامات سے گریز کا تھا۔ بنیادی طور پر یہ دو سوچوں اور مزاجوں کا ٹکراؤ تھا۔ بیوروکریٹک ذہن میں فیاضی اور رواداری کم ہوتی ہے۔ وہ تعزیر پسند ہوتا ہے اور ریاستدان کام و نتیجہ پسند۔ خیر یہ ابھی شروعات تھی۔

میاں نواز شریف نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کی بجائے اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے تعمیر و ترقی کے بڑے بڑے منصوبوں پر کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے سڑکوں کے متعلق اپنی زندگی کے خوابوں کو عملی تعبیر دینے کے لئے قدم بڑھایا اور بین الاقوامی شہرت کی کمپنیوں سے موٹروے کی تعمیر کے لئے رابطے کئے تاکہ سرمایہ بھی لگا سکیں اور تعمیر بھی کر سکیں اور تعمیر کے بعد ٹول ٹیکس کے ذریعے اپنا پیسہ واپس نکال سکیں۔ اس طرح پاکستان کو ان شاہراہوں کے لئے صرف زمین دینا تھی۔ بقیہ اخراجات کمپنیاں خود کرتیں۔ میاں نواز شریف

کا پس منظر چونکہ کاروباری تھا اس لئے انہیں سمجھ تھی کہ کم سے کم پیسہ لگا کر کس طرح زیادہ سے زیادہ کام کرایا جا سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے یہ کام پہلی دفعہ پاکستان میں کر دکھایا ورنہ نوکر شاہی کا دماغ ایسی باتوں کو سمجھنے اور کرنے سے قاصر ہی رہتا ہے۔ اسے کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، مگر یار لوگوں نے اس پر بھی طرح طرح کی باتیں بنانا شروع کر دیں کہ نواز شریف یہ کام بڑی بڑی رشوتیں لینے کے لئے کر رہے ہیں۔ ذرا نہ سوچا کہ اس کام میں پاکستان کا پیسہ تو کم سے کم لگ رہا ہے اور وہ بھی زمین حاصل کرنے پر۔ باقی پیسہ تو متعلقہ فرم خود لگائے گی تو پھر بیچ میں رشوت کہاں سے آ گئی، لیکن سیاسی مخالفین کو اس سے کیا غرض۔ انہیں تو بات کرنے کی گنجائش چاہئے اور انہوں نے اس طرح کی سکیموں پر بھی نواز شریف کی کردار کشی شروع کر دی، لیکن نواز شریف نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور بہت ہی زیادہ سرعت کے ساتھ کام شروع کروا دیا۔ شاید وہ سوچ رہے ہوں گے کہ بھونکنے سے فقیروں کا رزق کم نہیں ہوتا۔ بہر صورت بھونکنے والے بھونکتے رہے اور صاحب عمل عمل کرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاہور، اسلام آباد موٹروے پر باقاعدہ کام شروع ہو گیا۔ نواز شریف وزیر اعظم پاکستان بلا ناغہ ہر ہفتے اس کام کا معائنہ کرتے رہے۔ انہیں کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا، وہ کام کا دورانیہ مقرر کرتے اور بتائی ہوئی تاریخ پر خود وہاں موجود ہوتے۔ پھر بھلا مدت معینہ پر کام مکمل کیسے نہ ہوتا۔

میاں نواز شریف نے اس نہج پر اسلام آباد، پشاور اور پھر پشاور سے نوڈیرہ، گوادر تک موٹرویز پر بنیادی کام شروع کروا دیا تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ یہ کام اتنی برق رفتاری سے ہو رہا تھا کہ لوگ حیران تھے اور اکثر کہتے یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ میاں نواز شریف کہتے کہ بھئی یہ پیسہ آنے والی فرمیں خود لگائیں گی اور خود ہی اگلے تیس سال میں ٹول ٹیکس کے ذریعے کما سکیں گی۔ میاں صاحب ان سڑکوں کے ذریعے پاکستان کو وسطی ایشیا کی نئی نئی آزاد ہونے والی اسلامی مملکتوں سے ملا کر اسلامی معیشت کا ایک طاقتور بلاک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ اسلامی دنیا میں ہمیں بھارت سے بڑھ کر وسعت مل سکے۔ ایک اجلاس میں، میں نے کہا کہ اس سڑک کا نام موٹر وے وغیرہ کی بجائے شاہراہ اسلام رکھ دیں تو انہوں نے میری طرف عجیب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر

بولے۔

"یہ کام غیروں کو پہلے ہی پسند نہیں، آپ کا کیا خیال ہے کہ پھر اس نام کے بعد ہمیں وہ یہ کام کرنے دینگے۔ بس خاموشی ہی بہتر ہے۔"

میں یکدم چپ ہوگیا، میں نے سوچا کہ میاں صاحب معاملات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ دراصل میاں نواز شریف ایک خاموش اور باعمل شخص ہیں وہ اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ پاکستان دشمن مقتدر طاقتوں کو بلاوجہ ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اندر سے وہ ایک نہایت ہی فہم وحکیم انسان ہیں۔

میاں صاحب نے صرف شاہرات پر ہی زور نہیں دیا دیگر ذرائع مواصلات میں بھی ترقی کی بنیادیں رکھیں۔ انہوں نے جاپان کی فرموں سے بات کر کے پاکستان کے اندر تیز رفتار بلٹ ٹرینیں چلانے کا بھی منصوبہ تیار کیا تاکہ پاکستان اکیسویں صدی میں ایک ترقی یافتہ ملک کے طور پر داخل ہو سکے۔ اس کام کے لئے بھی سرمایہ موٹر ویز کی طرز پر اکٹھا ہونا تھا جو طویل المیعاد پٹے کے ذریعے فرموں نے خود ٹرینیں چلا کر نکالنا تھا، پھر اس مقررہ مدت کے بعد وہ سب کچھ پاکستان کا بن جاتا۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے واٹر ویز (Water ways) کی طرف دھیان دیا تاکہ پاکستان کے اندر باربرداری کا ایک نہایت ہی سستا اور تیز رفتار نظام شروع کیا جا سکے۔ پاکستان کے اندر چونکہ دریاؤں اور بڑی بڑی نہروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، اس لئے ان قدرتی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت تھی جن کی طرف پہلے کسی بھی حکمران نے دھیان نہیں دیا تھا، لہٰذا یورپ اور جاپان کی بہت سی فرموں نے اس میں دلچسپی کا اظہار کیا اور باقاعدہ سروے شروع ہو گئے۔ پاکستان کے دریاؤں پر چونکہ بہت سے بیراج اور پل تعمیر ہو چکے ہیں اس لئے یہاں کچھ دشواری آ رہی تھی جس کا علاج پلوں اور بیراجوں کے ساتھ بائی ویز (By ways) بنانے سے نکالا گیا۔ اس سستی دریائی ٹرانسپورٹ کا خرچہ بھی موٹر ویز والے فارمولے کے ذریعے متعلقہ فرموں کے ذمے تھا۔

اسی نہج پر اور بھی بہت سے مفید منصوبے نواز شریف کے ذرخیز ذہن سے نکل نکل کر میدان عمل کی زینت

بننے کے لئے تیار تھے مگر مخالف قوتیں، جو معاملات کو جوں کا توں دیکھنا چاہتی تھیں، جموں کے اندر رہ کر ہی جن کا مقام و مرتبہ بنتا تھا، ان کے سینے پر مونگ دلی جا رہی تھی۔ ان کی نگاہ میں نواز شریف کفر کی حد تک مار کر رہے تھے۔ مگر دھن کا پکا نواز شریف کہاں سانس لینے والا تھا۔ انہوں نے بھٹو کے زمانے سے سرکاری تحویل میں لئے جانے والے بینکوں کو بھی پرائیویٹ ہاتھوں میں دینے کا فیصلہ کر لیا مگر ان کی حالت بہت خراب تھی۔ دو عشروں کی سرکاری تحویل نے انہیں بنکوں سے سرکاری محکمے بنا ڈالا تھا اور بنکوں کے ملازمین اور کارندوں نے ان کا بہت سا سرمایہ اللوں تللوں میں اڑا دیا تھا۔ بنکوں کے سرکاری بن جانے کی وجہ سے بڑے بڑے قرضوں کے ذریعے بدعنوانی اور کرپشن کا ایک بازار گرم تھا۔ بڑے بڑے سیاستدان قرضوں کی سفارشیں کر کے اپنا کمیشن بٹورتے، صنعتکار اور تاجر غلط تخمینے بنا کر لاکھوں کروڑوں ہضم کرتے اور خود بنک کے ملازمین اس بہتی گنگا میں نہاتے اور موج میلہ کرتے۔ چوروں کا کپڑا اور لاٹھیوں کے گز والی بات بنی ہوئی تھی اور سارا معاشرہ غلیظ ہو رہا تھا۔ اس قباحت کو ختم کرنے کے لئے نواز شریف نے فیصلہ کیا کہ گند کو جڑ سے نکالنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان بنکوں کی نج کاری کر دی جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مگر یہ بنک اندر سے بالکل کھوکھلے ہو چکے تھے اور انہیں خریدنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ ان کی کچھ اصلاح کی جائے تاکہ وہ قابل فروخت ہو سکیں مگر اس نیک کوشش پر نواز شریف کے سیاسی مخالفین اور بنک ملازمین نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ کر دی جس میں ایک الزام یہ بھی شامل تھا کہ وہ خود یہ بنک خریدنا چاہتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں نیکی برباد اور گناہ لازم۔

ان سب مشکلات کے باوجود دھن کا پکا پر عزم نواز شریف اپنے ایجنڈے پر ڈٹا رہا تاکہ پاکستان کی مردہ معیشت میں ایک دفعہ پھر جان ڈالی جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینوں کے اندر اندر ہماری معیشت روبصحت ہونا شروع ہو گئی اور اس کی صحت مندی کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے۔ ہر طرف کاروبار کی ریل پیل ہو گئی اور تاجروں کا زبردست اعتماد بحال ہو گیا۔ پاکستان کی برآمدات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور خوشحالی کی وجہ سے درآمدات میں بھی۔ اس بڑھتی ہوئی تجارت کی QUALITY کے لئے ضروری تھا کہ زرمبادلہ کے پرانے دقیانوسی نظام میں

تبدیلی لائی جائے تاکہ یہ کاروبار آسانی اور سرعت کے ساتھ ہو سکے۔ اس مقصد کے تحت نواز شریف نے زرمبادلہ کے لین دین کے کام کو سٹیٹ بنک سے آزاد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ اتنا بڑا بنیادی کام تھا کہ اس وقت کے فنانس منسٹر سرتاج عزیز بھی گھبرا گئے اور اس کی سخت مخالفت کی۔ معاملہ کابینہ کے سامنے پیش ہوا، وہاں بھی اختلاف رائے تھا لیکن نواز شریف کا تجارتی تجربہ کہہ رہا تھا کہ زرمبادلہ کو کھلا چھوڑے بغیر معاشی پہیہ پوری سپیڈ کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ ان کا خیال تھا کہ بیرون ملک زرمبادلہ کمانے والے ہمارے بھائی ہیں ان کو بھی مارکیٹ کے مطابق ریٹ ملے گا تو وہ بھی زیادہ پیسہ ملک کے اندر بھیجیں گے اور کاروباری لوگ زیادہ سے زیادہ برآمدات کر کے خزانہ بھر سکیں گے۔ مگر تنگ سوچ بیوروکریٹ یہاں تک کیسے دیکھ سکتے تھے۔ آخر کار نواز شریف نے یہ فیصلہ نہایت جرات اور استقلال کے ساتھ کر ہی ڈالا اور مزے کی بات ہے کہ اس ایک فیصلے نے ہماری معیشت کو چار چاند لگا دیئے۔ چند ہی مہینوں میں ہمارے زرمبادلہ کا ذخیرہ اربوں ڈالر میں چلا گیا اور مخالفت کرنے والے سب لوگ منہ میں انگلیاں چبانے لگے۔ اس بات کو اب ایک عشرہ گزر چکا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ اس سہولت کا آغاز نواز شریف نے پاکستان میں کیا تھا۔ اس سے قبل مریضوں، طلبہ اور حج کرنے والوں کو بھی زرمبادلہ حاصل کرنے کے لئے سٹیٹ بنک کے سو سو چکر لگانا پڑتے تھے۔ کاروباری حضرات کے لئے تو یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور اس مشکل کی وجہ سے سٹیٹ بنک میں بے انتہا رشوت چلتی تھی۔ لوگ بیرون ملک اپنا سرمایہ جمع کرتے رہتے تاکہ بوقت ضرورت ان کے کام آئے، لیکن نواز شریف کے حقیقت پسند تخیل نے یہ سب عقدے یکمشت کھول دیئے، بڑے آدمی ہی بڑے فیصلے کرتے ہیں اور نواز شریف اس لحاظ سے ایک بڑے آدمی تھے لیکن وہ اوروں کی طرح بڑ نہیں مارتے تھے۔ حیرت کی بات ہے یار لوگوں نے اس معاملہ کو بھی ان کے ذاتی مفادات کا حصہ قرار دے دیا کیونکہ بہت سے لوگوں کو تبدیلی اور ترقی آسانی سے ہضم نہیں ہوتی۔ ویسے نواز شریف کو خود بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا کام کر رہے ہیں۔ ان کی سوچ کے سانچے میں ان کاموں کو چونکہ ایسے ہی ہونا چاہئے تھا اس لئے انہوں نے ویسے ہی سرانجام دیئے۔ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا کہ مجھ سے پہلے صاحب اقتدار لوگوں نے اتنی بڑی نالائقی کیوں روا رکھی تھی۔ اپنی طرف سے وہ

صرف صحیح کر رہے تھے اور معاملات کو ان کی فطرت کے مطابق ڈھال رہے تھے، کسی پر احسان نہیں کر رہے تھے۔ بس ایک احساس فرض تھا جسے وہ نبھا رہے تھے مگر جس کلاس کو اس کا فائدہ ہو رہا تھا وہ بھی اس پر شکر گزار نہیں تھی۔ وہ بھی یہی سمجھتی تھی کہ ان معاملات کی چونکہ یہی فطری صورتحال ہے اس لئے ایسے ہو گیا تو بس اچھا ہو گیا۔ چند ہفتوں میں ان تمام سہولیات کو ان کے موجد سمیت بھول گئے اور ھل من مزید کی رٹ لگانے لگے۔

ان بڑے بڑے کاموں کے علاوہ نواز شریف کی نگاہ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں پر لگی رہتی تھی۔ کیا لوگ بھول گئے ہیں کہ یہ نواز شریف ہی تھا جس نے گاؤں گاؤں پختہ سڑکیں بنوائیں۔ گاؤں گاؤں پختہ گلیاں بنوائیں، بجلی پہنچائی اور ٹیلیفون تک پہنچا دیئے۔ نواز شریف کی آمد سے پہلے پاکستان میں سب سے زیادہ مشکل کام ٹیلیفون لگوانا ہوا کرتا تھا اور پھر نواز شریف کے ذہن ہی کی وجہ سے اب یہ آسان ترین کام بن چکا ہے مگر بہت سے لوگ بھول چکے ہیں کہ یہ اتنا بڑا انقلاب کون لے کر آیا۔ وہی نواز شریف جسے بدلے میں سوائے الزامات کی بوچھاڑ کے اور کچھ نہ ملا، اس لئے کہ وہ سیاست کی ٹیڑھی راہوں کا سیدھا سادا مسافر تھا جو سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کیا ہمیں یاد ہے کہ نواز شریف کے دور سے پہلے ہمیں کمپیوٹر کی قسم کے جانور سے کوئی آشنائی بھی تھی؟ مجھے تو یاد ہے کہ کمپیوٹر اور فیکس کا سب سے پہلا استعمال اگر کسی سرکاری محکمہ میں ہوا تو وہ 1987ء میں سپیشل برانچ پنجاب میں نواز شریف کے طفیل شروع ہوا۔ اس وقت تک فیکس مشین کا استعمال خلاف قانون تھا۔ اس کی منظوری نواز شریف نے وفاقی حکومت سے ذاتی سطح پر لی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ گھر گھر فیکس مشینیں موجود ہیں اب تو انٹرنیٹ اور پتہ نہیں کیا کیا پاکستان میں آ چکا ہے مگر یہ تمام ترقی صرف ایک شخص کے ذرخیز دماغ کی پیداوار ہے اور قوم کے اس محسن کا نام نواز شریف ہے۔ یہاں میرا مقصد نواز شریف کا قصیدہ پڑھنا نہیں۔ میں صرف صداقت سے کام لے کر یاددہانی کروا رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میاں محمد نواز شریف پچھلے چھ سال سے مجھ سے کچھ خفا خفا سے ہیں۔ کیوں اور کب؟ وہ میں ذرا آگے چل کر عرض کر دوں گا، لیکن اس کے باوجود میں حقیقت بیانی سے باز نہیں رہ سکتا کہ میں

بہت سے معاملات کا چشم دید گواہ ہوں اور میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں ان تمام معاملات کو سچائی اور ایمانداری سے قارئین تک پہنچاؤں۔ ویسے بھی اب میں ایک ریٹائرڈ آدمی ہوں اور مجھے کسی سے کوئی نوکری نہیں لینی ہے۔ نواز شریف ایک ایسے متحرک اور فعال آدمی ہیں کہ جدھر ان کی نگاہ اٹھتی ادھر ہی وہ زبردست کام شروع کروا دیتے۔ انہوں نے بہت کام کروائے۔ نہروں کی بھل صفائی کا کام عوامی شرکت سے کس نے شروع کرایا؟..... نواز شریف نے، نواز شریف سے پہلے یہ کام کبھی نہیں ہوا تھا اور سالہا سال سے ہماری نہریں بھل سے اٹی پڑی تھیں۔ سرقہ آب اور تقسیم آب کے بارے میں بے انصافی کی بہت زیادہ شکایتیں ہوتی تھیں۔ ایک دن ایک سادہ سے دیہاتی نے نواز شریف سے شکایت کی کہ وہ نہری پانی نہ ملنے کی وجہ سے بالکل اجڑ گیا ہے۔..... کیوں؟ اس لئے کہ بھل کی وجہ سے نہریں اٹی پڑی تھیں اور اس کے کھیتوں تک پانی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ بس پھر کیا تھا نواز شریف نے لنگوٹ کس لیا اور عوامی شمولیت سے ہر سال بھل صفائی شروع کروا دی۔ عمال محکمہ نہر کے بھی کان کھینچے وگرنہ وہ ہر سال لاکھوں روپیہ بغیر صفائی کئے بھل صفائی کے نام پر کھا رہے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نواز شریف سے پہلے آنے والے حکمرانوں کا تعلق یا تو فوج سے تھا یا زمیندار طبقہ سے، مگر انہیں کبھی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس طرح کا کام کر سکیں۔ اب تو فوج کے جرنیل بھی بڑے بڑے زمیندار بن چکے تھے۔ یہ کام آخر کار ایک غیر زمیندار کے ہاتھوں ہوا، اس لئے کہ اسے اس کا احساس تھا۔ اس کے باوجود ان پر زمیندار کلاس نے تواتر سے یہ الزام لگایا کہ وہ زمینداروں کے خلاف ہیں جو محض ایک گندی سیاست تھی۔

میاں نواز شریف کو محض ترقیاتی کاموں ہی کا شوق نہیں تھا۔ وہ نظام عدل وانصاف اور امن وامان کے معاملات میں بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ میں خود ان کے پہلے دور اقتدار میں صوبہ پنجاب کا آئی جی پولیس تھا اور یہ معاملہ میں نے بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ انہیں تساہل قطعاً پسند نہیں۔ وہ انصاف میں تاخیر پر بہت کڑھتے تھے۔ اسی لئے وہ فوری سماعت کی عدالتوں کے نہایت شدومد سے حامی تھے انہوں نے وہ عدالتیں قائم کیں تاکہ جرائم پیشہ افراد کو قرار واقعی سزائیں مل سکیں۔ انہوں نے ان عدالتوں کا کبھی سیاسی استعمال نہیں کیا۔ ان کے اس دور میں

ایک بھی ایسا کیس ان عدالتوں کو نہیں بھیجا گیا جس سے کوئی سیاسی بو آتی ہو۔ میں خود ان کے ساتھ پورے دو سال پنجاب کا آئی جی پولیس رہا ہوں۔ (سال 1991ء، 1992ء اور 1993ء) میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میاں نواز شریف نے سیاسی یا ذاتی حوالے سے کبھی کسی ایک مقدمہ میں بھی دخل اندازی نہیں کی۔ میرے آئی جی کے دور میں کیا کچھ ہوا، یہاں اس کا ذکر کرنا مقصود نہیں۔ اس کا کچھ احوال میں نے اپنی یادداشتوں The Ultimate Crime میں دے رکھا ہے۔ یہاں میں صرف اس پر اکتفا کروں گا کہ جب میں پنجاب کا آئی جی بنا تو میں نے میاں صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنی پارٹی کی میٹنگ بلا کر سمجھائیں اور کہیں کہ ارکان پولیس کے انتظامی امور میں دخل اندازی سے گریز کریں۔ ہاں تفتیش اور مقدمات کے معاملہ میں جہاں وہ سمجھیں کہ بے انصافی ہو رہی ہے تو ضرور بتائیں تاکہ میں اور میری پولیس راستی اور انصاف کی راہوں سے بھٹکنے نہ پائے۔ میاں صاحب نے اپنی پارٹی کی میٹنگ بلائی اور پوری بحث و تمحیص کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا کہ انتظامی معاملات از قسم تقرر و تبادلہ اور جزا سزا کے سلسلہ میں کوئی دخل اندازی نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد جب تک میں آئی جی رہا کبھی دخل اندازی نہیں ہوئی بلکہ کوئی مثبت سفارش بھی نہیں آئی۔ میاں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان نے اس دوران مجھے صرف ایک سفارش کی اور وہ سفارش تھی امتیاز بھلی انسپکٹر پولیس کی، جو ان کو پائلٹ کرتا تھا اور سمارٹ سیلوٹ کرتا تھا کہ میں اسے ترقی دے دوں۔ جب ریکارڈ چیک کیا گیا تو وہ 900 انسپکٹروں سے جونیئر تھا۔ میں نے واپس یہ بات میاں نواز شریف کو بتائی اور کہا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ فرمانے لگے بس ٹھیک ہے اسے ذرا بلا کر پیار سے سمجھا دیں۔ میں نے سمجھا دیا اور بات وہیں ختم ہوگئی۔ یہ وہ دور تھا جب میں نے بہت سے پولیس شہداء اور غازیان کو ان کی جرات پر محکمانہ مقاصد اور مورال کی خاطر آؤٹ آف ٹرن ترقی دی اور ان کے بیٹوں بھائیوں کو پولیس میں ان کی قربانی کے صلہ میں بھرتی بھی کیا مگر ایک بھی آدمی میاں نواز شریف کی سفارش پر بھرتی نہیں ہوا۔ جو لوگ اس طرح بھرتی ہوئے وہ صرف اور صرف بے نظیر بھٹو کے ساتھ جب زندگی اور موت کی کشمکش چل رہی تھی، مجبوری میں ہوئے، اس کے علاوہ ان کے مکمل دور حکومت میں اس طرح کی کوئی حرکت نہیں ہوئی بلکہ جب میاں صاحب وزیر اعظم پاکستان بنے تو انہوں نے بہت عرصہ سے

چلی آتی پلاٹ پرمٹ کی سیاست ہی ختم کردی۔ ہم سب لوگ بھول چکے ہیں، یہ اچھا کام بھی ان ہی کے ہاتھوں ہوا۔ جب بے نظیر دوبارہ وزیراعظم بنیں تو تو انہوں نے یہ قباحت پھر شروع کی اور میاں صاحب نے دوبارہ آکر پھر ختم کر دی۔ میرے آئی جی کے زمانے میں ایک سفارش میاں شہباز شریف نے بھی کی۔ جب میں نے بتایا کہ وہ کچھ غلط قسم کا آدمی ہے تو کہا کہ "ٹھیک ہے میرے ان کے بھائی سے پرانے مراسم ہیں، میں انہیں آپ کے پاس بھیجوں گا۔ یہ بات آپ انہیں بتادیں، کام بے شک نہ ہو، مگر ان کی عزت افزائی کر دینا۔" میں نے اس افسر کے بھائی کو بلایا اور ساری بات تفصیل سے سمجھائی تو پھر اس نے اصرار نہیں کیا۔ میں نے یہ باتیں اس لئے لکھ دی ہیں کہ معمولی سے واقعات ہیں مگر ان سے ان کی سوچ جھلکتی ہے۔ یہ مروت میں منے کسی دوسرے حکمران میں آج تک نہیں دیکھی اور میرا تجربہ بہت وسیع ہے۔ میں نے جنرل ایوب خان سے لے کر نواز شریف تک تمام حکمرانوں کے ساتھ بہت قریب سے کام کیا، مگر جتنا درست اور صحیح رویہ میاں نواز شریف کا دیکھا، کسی اور کا نہیں دیکھا۔ مشرقی پاکستان کے بعد میری سب سے پہلی تقرری ہی جنرل ایوب کے شہر ایبٹ آباد میں ہوئی اور بھٹو کے دیس سے ہوتے ہوئے جنرل یحییٰ خان اور ٹکا خان کے سٹاف پر بھی کام کیا۔ بادشاہوں کے ٹھاٹھ مت پوچھئے۔ بادشاہ تو بادشاہ ان کے رشتہ داروں اور ملازموں کا مت پوچھئے۔ ایسی ایسی رعونت کہ اللہ کی پناہ اور میاں نواز شریف کے خاندان کی عاجزی دیکھئے۔ میں میاں نواز شریف وزیراعلیٰ پنجاب کا بحیثیت ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ آنکھ اور کان تھا اور دن رات ان کے ساتھ تھا، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کا سالا شادمان میں فرنیچر کی ایک معمولی سی دکان چلا رہا ہے۔ مجھے تین سال بعد تب پتہ چلا جب ہمارے دوائے ایس پی صاحبان عابد قادری اور سہیل خان، جو اب سینئر ایس پی پولیس ہیں، میں نے مجھے اقبال ٹکا کے گھر بتایا کہ وہ غلطی سے چیف منسٹر کے سالے کے گھر اور دکان (جو بالکل ملحقہ تھی) پر ریڈ کر بیٹھے ہیں اور ان کی خواتین کی بے عزتی بھی کر بیٹھے ہیں۔ آپ ہمیں میاں صاحب سے معافی دلوادیں۔ وہ کچھ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے پوچھا مجھے اصل بات بتاؤ، اگر ان کا سالا کسی غلط بات میں Involve ہے تو میں میاں صاحب کو صاف صاف بتادونگا۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے بلکہ اپنے سالے کو جیل بھجوادیں گے کیونکہ انہوں نے میری ایک

رپورٹ پر اپنے ایک عزیز سہیل ضیاء بٹ کو باقاعدہ جیل بھجوا دیا تھا اور اپنے سگے ماموں کے متعلق ہدایات جاری کر دی تھیں کہ ان کے کہنے پر کوئی افسر غلط کام نہ کرے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس طرح کا ایک غلط کام کروا لیا تھا اور مزے کی بات ہے کہ پھر ماموں بھانجے کی بول چال بند رہی۔ مجھے چونکہ میاں صاحب کی انصاف پسندی پر اعتماد تھا اس لئے میں نے بلا دھڑک اے ایس پی صاحبان کو اصل بات بتانے کا کہہ دیا۔ ان اے ایس پی صاحبان نے کہا نہیں ایسی بات نہیں۔ اصل میں ہم نے ساتھ والے گھر پر ریڈ کرنا تھا مگر غلط نشاندہی پر ادھر کر بیٹھے۔ میں نے جا کر میاں صاحب کو یہ سب بتا دیا۔ کہتے ہیں مجھے ان افسروں کو معاف کرنے میں کوئی عذر نہیں مگر انہوں نے گھریلو خواتین کی اس طرح بے عزتی کیوں کی۔ یہ تو میری رشتہ دار ہیں۔ دوسروں کے ساتھ یہ لوگ کیا کرتے ہونگے۔ بہر صورت انہوں نے اس قصہ کو اس لئے رفع دفع کرایا کہ اس میں ذاتیات کا پہلو آنے سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔ یہ تھا ان کا ظرف، جو میں نے کسی دوسرے حکمران میں نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں ان کے ساتھ گھر میں کیا بیتی ہوگی۔ آپ ذرا سوچئے کہ کہیں کسی تھانے دار کا سالا ہو تو پورے شہر کو معلوم ہوتا ہے جبکہ یہاں چیف منسٹر کا سالا تھا اور انٹیلی جنس چیف کو اس کا پتہ تک نہیں تھا وہ ایک معمولی سی فرنیچر کی دکان چلا رہا تھا۔

اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جو میں بتا سکتا ہوں مگر غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لئے میں یہی کہوں گا کہ میاں صاحب کی شخصیت میں میں نے جتنا صبر، تحمل اور RECTITUDE دیکھا ہے وہ میں نے کسی اور حکمران میں نہیں دیکھا۔ میں ان کا آئی جی پولیس تھا اور اس سے پہلے ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ، ان پورے سات سالوں میں مجھے انہوں نے کبھی کسی ذاتی یا سیاسی بناء پر کوئی مقدمہ بنانے یا بے انصافی کرنے کو نہیں کہا۔ اگر یہ کام وہ مجھے نہ کہتے تو اور کس کو کہتے۔ مجھے پورا پنجاب جانتا ہے اور خاص طور پر پنجاب پولیس جانتی ہے میں پورے وثوق اور دعوے کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ مجھے میاں نواز شریف نے کبھی کوئی غلط کام کرنے کو نہیں کہا اور اگر کوئی غلط کام ہوا ہے تو وہ میرا یا میرے کسی ماتحت کا قصور ہے اور اس طرح کے بہت سے کام ضرور ہوئے ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غلط کام نہیں ہوئے، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ میاں صاحب نے کبھی غلط کام کرنے کو نہیں کہا، ورنہ ہماری اپنی بہت زیادہ

کوتاہیاں ہیں۔ پی پی کے ساتھ میاں صاحب کی بہت زیادہ ٹھنتی تھی اور وہ خود بے نظیر بھٹو کے سخت زخم خوردہ تھے مگر مجھے تو انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ ان کے ساتھ بے انصافی کرو۔ یہی وجہ ہے کہ چودھری الطاف حسین مرحوم (سابق گورنر پنجاب) جہانگیر بدر، ناظم شاہ، اقبال ٹکا اور دوسرے پی پی کے لیڈران بلا دھڑک میرے دفتر میں آتے تھے، حالانکہ کئی افسر اس قسم کی حرکات سے بتقاضائے احتیاط کنی کتراتے، مگر میاں صاحب کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ نہیں تھا۔ اب لوگ جو چاہے باتیں بنائیں لیکن میاں صاحب ماورائے عدالت ہلاکتوں کے بھی خلاف تھے۔ میرے پورے دور میں ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم بیوروکریٹ لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اپنی خامیوں، اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی کے لئے قربانی کے بکرے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ انتظامی ناکامیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس کی ذمہ داری ہم خود اپنے اوپر لیں ہم نہایت آسانی سے یہ الزام حکمرانوں اور سیاسی لوگوں پر تھوپ دیتے ہیں تاکہ ہمارے اوپر حرف نہ آئے۔ کبھی ہم کہتے ہیں کہ ایم این اے، ایم پی اے دخل اندازی کرتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں کہ کیا کریں اوپر سے احکامات ہی ایسے آتے رہتے ہیں۔ اصل میں یہ رویہ درست نہیں۔ گو بعض حکمران ایسا کرتے بھی رہے مگر میاں نواز شریف نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ لاء اینڈ آرڈر خود ہم سے درست نہیں ہوتا اور جب اوپر سے پرسش ہوتی ہے تو آئی جی صاحب نہایت معصومیت سے کہہ دیتے ہیں کہ جناب ہم کیا کریں یہ ایم پی اے اور ایم این اے کام نہیں کرنے دیتے یا پھر ساری ذمہ داری ماتحتوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اصل میں یہ ساری ہماری اپنی اندر کی کمزوری اور اخلاقی باختگی ہے وگرنہ سیاسی لوگ اتنے برے نہیں ہوتے۔ میرا بھرپور تجربہ ہے کہ جب انہیں سچی بات بتائی جائے تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ کئی دفعہ تو وہ ان لوگوں کی بے عزتی کر دیتے ہیں جو غلط سفارش کے لئے آتے ہیں۔ وہ تو پبلک کے لوگ ہیں، انہیں سفارش کرنا ہی ہوتی ہے۔ یہ افسروں کا کام ہے کہ وہ انہیں اصل بات بتائیں مگر چونکہ اکثر سرکاری ملازمین بے ایمان اور رشوت خور ہوتے ہیں اس لئے وہ سہارا کسی عوامی نمائندہ کا لیتے ہیں اور اندر کھاتے خود پیسے بنا رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے ہیں کہ "ہم کیا کریں ان لوگوں نے تو جرائم پیشہ لوگ پولیس میں بھرتی کروا رکھے ہیں۔" حالانکہ بات سو فیصد غلط اور بے بنیاد ہے

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک بڑے ہی "نیک نام" آئی جی صاحب نے اے ایس آئی کی بھرتیوں پر خوب پیسے بنائے۔ ہوا یوں کہ میاں صاحب کے پاس جن جن لوگوں کی سفارش آئی ان کی لسٹ بنا کر انہوں نے ان آئی جی صاحب کو بھجوادی اور کہا کہ ان میں سے جو جو فٹ ہے اسے آپ بھرتی کر لیں۔ ان میں سے جن جن نے پیسے دیئے وہ فٹ نکلے اور باقی ان فٹ۔ بدنامی میاں محمد نواز شریف کی ہوئی اور پیسہ ان صاحب کا بن گیا۔ خراب بیوروکریٹس (ویسے نیک بیوروکریٹس بھی ہوتے ہیں، ان سے معذرت کے ساتھ) کے متعلق میں اکثر ایک کہانی سنایا کرتا ہوں کہ ایک شخص نے آٹا پیسنے کی چکی لگا رکھی تھی اور محتانہ کے طور پر وہ گندم پسوانے والوں سے کچھ آٹا لے لیا کرتا تھا۔ جب شام کو وہ تھک ہار کر اپنی چکی بند کرتا تو اپنے حصے کا آٹا وہیں پڑا رہنے دیتا۔ ایک ایک بندر کو اس سٹور کا پتہ چل گیا۔ وہ چپکے سے رات کو آتا اور خوب آٹا کھا لیتا اور جاتے وقت کچھ آٹا وہ مالک کے کتے کے منہ پر مل جاتا تا کہ صبح جب مالک اٹھے تو سمجھے کہ کتا آٹا کھا گیا اور یوں اس کی مرمت ہو جاتی۔ آصا اصل میں بندر کھاتا تھا اور مار کتے کو پڑتی تھی۔ یہی صورتحال ہمارے کبھی کبھار افق پر ابھرنے والے عوامی نمائندوں کی ہے کہ زیادہ تر آٹا تو بیوروکریسی کا بندر کھا جاتا ہے اور مار ان "کتوں" کو پڑتی ہے۔ اگر حقیقت یہی ہے اور ساری خرابی کی جڑ یہی ہے تو پھر ہمارے ہاں اتنے مارشل لاء لگے ہیں جن میں بیوروکریسی بلاشرکت غیرے حکمرانی کرتی رہی اتنے جرنیل اور سی ایس پی افسران اس وقت حالات کیوں درست نہیں کر لیتے؟ ہو جاتے، بے چارے عوام مایوس ہو کر ایک دفعہ پھر ان کے خلاف نعرے لگاتے ہیں اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو ہماری ہی وجہ سے وہ ان سیاستدان کے خلاف نعرے لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ خرابی ضرور کسی اور جگہ ہے اور وہ جگہ ہے افسران کے صوابدیدی اختیارات کی جنہیں کنٹرول کرنے کے لئے سب سے زیادہ کام میاں نواز شریف نے کیا اور یوں انہیں اپنا مستقل دشمن بنا لیا جبکہ امر واقع یہ تھا کہ نواز شریف محض شاخ تراش نہیں رہے تھے وہ مسئلہ کی اصل جڑ پکڑ رہے تھے۔

سازش شاہی

پاکستان کے پرانے گھاگ سیاستدانوں نے جب دیکھا کہ نوجوان نواز شریف بہت بنیادی قسم کے کام کر رہے ہیں اور بہت کامیاب بھی جا رہے ہیں تو وہ ان کے جانی دشمن بن گئے۔ جاگیردار برانڈ کے سیاستدان جن کے خون میں سازش اور طاقت کے بے حساب استعمال کی خواہش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، وہ اپنا اپنا منہ تکتے رہ گئے اور کامیابی نے نواز شریف کے قدم چوم لئے۔ نواز شریف جھوٹے فوجداری مقدمات کا سہارا نہیں لے رہے تھے۔ وہ کسی ایئر مارشل کی سیاست پر اس کے خلاف ڈاکوزنی کا پرچہ نہیں کٹوا رہے تھے، نہ ہی وہ کسی ظہور الٰہی پر بھینس چوری کے مقدمات قائم کروا رہے تھے، وہ تو بدنام زمانہ دفعہ 144 کا بھی استعمال نہیں کر رہے تھے۔ پولیس پریس مکمل طور پر آزاد تھا۔ ملیحہ لودھی ایڈیٹر ''دی نیوز'' پر مقدمہ قائم ہوتا بھی ہے تو فوراً ختم کر دیا جاتا ہے۔ معیشت کامیاب اور جاندار ہو رہی ہے۔ زرمبادلہ کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بیوروکریسی درست جا رہی ہے۔ امن عامہ بہتر ہو رہا ہے۔ جلوس ہے نہ کوئی بڑا جلسہ، لاٹھی چارج نہ آنسو گیس کہ یہی حکومتوں کی رونقیں ہوتی تھیں یہ سب کچھ دیکھ کر اولڈ گارڈ سازشوں پر اتر آئے۔ انسانی رشتوں میں بیوروکریسی اپنے دکھوں کی وجہ سے شامل ہو گئی۔ چیف آف آرمی سٹاف آصف نواز اپنے دکھ لئے بیٹھے تھے کہ انہیں وہ اہمیت نہیں مل رہی تھی جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے

تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جنرل ایوب خان کے زمانے کے بعد پہلی دفعہ میاں نواز شریف کے زمانے میں وزارت دفاع کو اپنے اکاؤنٹس پارلیمنٹ کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لئے کہا گیا جسے انہوں نے فوج کی توہین سمجھا حالانکہ دنیا کے تمام جمہوری ملکوں میں اس طرح کا کڑا احساب کتاب ضرور ہوتا ہے بلکہ جنرل ایوب خان کے مارشل لاء سے قبل انگریز کے زمانے سے یہ حساب کتاب یہاں ہوتا چلا آیا تھا مگر آپ جب بھی منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کی کوشش کریں گے وہ دولتی مارنے کی ضرور کوشش کرے گا اور آصف نواز یہی کچھ کر رہے تھے، بے قابو سول بیوروکریسی کو لگام دینے کے لئے اور بدعنوانی کچلنے کیلئے نواز شریف نے اجلال حیدر زیدی جیسے شاہ زور سی ایس پی پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ وہ روئیداد خان سابق سیکرٹری داخلہ صدر غلام اسحاق خان کے دیرینہ دوست اور نہایت قریبی ساتھی تھے۔ جنہوں نے ان کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ وہ نواز شریف کے خلاف پہلے ہی زہر کھائے بیٹھے تھے کہ وہ نئے نئے کام کر رہا ہے اور انہیں پوچھتا تک نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اولڈ آرڈر کا کسٹوڈین سمجھتے تھے اور نوجوان نواز شریف ایک نئی دنیا آباد کر رہا تھا۔ قدیم اور جدید کا جھگڑا تو ازل سے چلا آ رہا ہے لیکن دو حضرات نے "سونے پہ سہاگے" کا کام کر دیا اور آہستہ آہستہ پرانے ناراض سیاستدانوں اور صدر کے درمیان ان حضرات کی وجہ سے گٹھ جوڑ شروع ہو گئے۔ پرانے سیاستدانوں کو اور کیا چاہئے۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات تھی۔ نوابزادہ نصر اللہ خان، غلام مصطفیٰ جتوئی اور مصطفیٰ کھر جیسے جاگیرداروں کے تو نصیب جاگ اٹھے اور پھر پرانا کام شروع ہو گیا۔

اسی زمانے میں جنرل آصف نواز اور بے نظیر بھٹو کے درمیان ملیحہ لودھی کے ذریعے رابطہ قائم ہو گیا۔ بے نظیر آصف نواز سے ناراض تھیں کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ ان کے خلاف عدم اعتماد کے وقت ایم کیو ایم کو آصف نواز کور کمانڈر کراچی ہی نے بھڑکایا اور استعمال کروایا تھا۔ اب وہ کوئی عملی ثبوت چاہتی تھی کہ آصف نواز اس کی کوئی تلافی کریں اس کے بعد وہ نواز شریف کے خلاف ان کا ساتھ دیں گی۔ جنرل آصف نواز کو یہ موقع خود نواز شریف نے دے دیا جب ڈاکوؤں کے خلاف اندرون سندھ فوجی آپریشن شروع کروایا گیا۔ اس دوران ٹنڈو بہاول کا وہ واقعہ

پیش آ گیا جس میں ایک فوجی میجر نے اپنی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے 9 معصوم شہریوں کو ڈاکو اور انڈین ایجنٹ ظاہر کر کے مار ڈالا تھا، اس پر بہت شور مچ گیا اور ایک واویلا شروع ہو گیا۔ اس قضیہ سے توجہ ہٹانے کے لئے آصف نواز نے حکومت وقت کی اجازت کے بغیر اور ایم کیو ایم سے اپنا پرانا حساب کتاب چکانے کے لئے کراچی شہر کو بھی اس آپریشن کا حصہ بنا لیا۔ آثار دیکھ کر ایم کیو ایم کا قائد الطاف حسین تو لندن بھاگ گیا مگر باقی ماندہ پارٹی کی شامت آ گئی اور ان کے خلاف طرح طرح کی کہانیاں منظر عام پر آنا شروع ہو گئیں۔ اس طرح جنرل آصف نواز نے بے نظیر کو خوش بھی کر لیا اور نواز شریف کو مشکلات سے دوچار بھی کر دیا۔ ایم کیو ایم تو حکومت کی حلیف جماعت تھی اور باقاعدہ حکومت میں شامل تھی۔ ایک طرف طاقتور جرنیل اور دوسری طرف ایم کیو ایم نواز شریف کے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی بات بن گئی۔ اس وقت تک صدر مملکت بھی نواز شریف کے خلاف ہو چکے تھے۔ اب فوج کا معاملہ بھی گڑبڑ ہو گیا۔ ایم کیو ایم کوئی نیک جماعت بھی نہیں تھی۔ اس کا دفاع بھی مشکل تھا۔ سندھ میں اس وقت حکومت بھی صدر غلام اسحٰق کے چہیتے جام صادق علی کی تھی اور نواز شریف کے ساتھ اس کی ان بن تھی۔ خاص طور پر دینا حیات کیس کے بعد جسے غلام اسحاق خان کے داماد اور سندھ کے وزیر داخلہ عرفان اللہ مروت کے کہنے پر ریپ کیا گیا تھا یا کم از کم عوامی نگاہ میں الزام یہی تھا، نواز شریف کی شرافت ایسے معاملات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس واقعہ پر نواز شریف اتنا سٹپٹائے کہ استعفیٰ دینے تک پہنچ گئے مگر شیخ انور زاہد نے انہیں بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ نواز شریف اسحاق خان سے ناراض ہو کر لاہور آ گئے اور واپس نہیں جا رہے تھے۔ انور زاہد نے مجھ سے بات کی اور مجھے نواز شریف سے بات کرنے کو کہا میں نے بات کی تو کہتے ہیں مجھے وزیر اعظم رہنے کا کوئی شوق نہیں۔ میرے زمانے میں اس طرح کے شرمناک واقعات ہوں اور میں حکومت سے چمٹا رہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ غلام اسحاق خان اور جنرل آصف نواز پر سخت غصے میں تھے۔ وہ عرفان اللہ مروت کی برخواستگی ہی نہیں ان کی گرفتاری اور سزایابی کے بھی خواہاں تھے۔ بہت باتیں ہوئیں ان کا ذکر یہاں مناسب نہیں، جب میں نے کہا کہ آپ اور آپ کی جماعت کا تو سندھ میں وجود ہی نہیں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟ صرف وزیر اعظم کے طور پر

کچھ تو اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے معاملات کو درست کر سکتے ہیں۔ اگر چھوڑ بیٹھیں گے تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے، جب ذرا سوچنے لگے تو میں نے اپنا ترپ کا پتہ چلا دیا۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ جناب والا آپ تو کبھی شکست خوردہ نہیں تھے۔ اب کیوں شکست خوردگی کا شکار ہو گئے۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ ارادہ بدل دیا اور کہنے لگے کہ پھر میں کیا کروں؟ بس اسلام آباد جائیں اور اپنا کام کریں۔ وہ کام کریں جو آپ کر سکتے ہیں اور جہاں تک کر سکتے ہیں صدر سے بات کریں اگر وہ نہ مانیں تو گناہ انہیں کی گور گردن پر ہوگا۔ آصف نواز سے بھی حکمت کے تحت نبھائیں۔ ایم کیو ایم کوئی فرشتوں کی جماعت ہے یوں نواز شریف ہم لوگوں کی وجہ سے کچھ مصلحت کا شکار ہو گئے وگرنہ اس وقت اخلاقی احتجاج سے بھرے پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پھٹ پڑیں گے مگر پھر اپنا غصہ پی گئے۔ ایم کیو ایم کے معاملے میں خاموش بھی ہو گئے اور صدر مملکت سے اچھے تعلقات کا بھرم بھی رکھا۔ مگر دل میں کڑھتے رہے۔ آصف نواز کے کہنے پر پھر ایم کیو ایم کے بہت سے خطرناک بھگوڑوں کو جنہیں ہم نے پنجاب میں گرفتار کر لیا تھا ہم سے چھڑوا بھی لیا اور کراچی واپس کر دیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو بعد میں جنرل آصف نواز کی آشیرباد سے ایم کیو ایم حقیقی کہلوائے اور الطاف حسین ایجنسیاں ایجنسیاں پکارتا پھرا۔

اب نواز شریف اولڈ گارڈ، بیوروکریسی، جنرل آصف نواز اور بے نظیر کی زد میں تھے اس لئے کہ وہ پاکستان یک تقدیر بدلنے کی تدبیریں کر رہے تھے جو اگر کامیاب ہو جاتیں تو پرانے لوگ ختم ہو جاتے ان کا دور کبھی واپس نہ آسکتا۔ یہ تھا پس منظر جس میں یکدم محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان لوگوں کی پشت پناہی سے نومبر 1992ء میں لانگ مارچ کا اعلان کر دیا کہ وہ اسلام آباد پر چڑھائی کر کے نواز شریف کی حکومت کو گرائیں گی۔

ظاہر ہے لانگ مارچ کی دھمکی کے بعد حکومت کی طرف سے جوابی اقدامات بھی ہونا تھا اس کے متعلق لاہور میں نواز شریف کی زیر صدارت ایک انتظامی میٹنگ ہوئی۔ جنرل جاوید ناصر اور بریگیڈیئر امتیاز نے اس بریفنگ میں ایک نہایت ہی خوفناک منظر پیش کیا جس کے مطابق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دشمن کی طرف سے اسلام آباد پر حملہ ہونے والا ہے۔ اب مجھے معلوم تھا کہ فوجی ذہن ایسے ہی کام کرتا ہے وہ ہمیشہ مخالف فریق کے متعلق

ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کی تربیت ہوتی ہے مگر یہاں تو معاملہ سراسر سیاسی تھا۔ فوجی ذہن مارشل لاء لگا کر سختی تو کر سکتا ہے مگر سیاسی نزاکتوں کو کم ہی سمجھتا ہے۔ میں پنجاب کا آئی جی پولیس تھا اور اس معاملہ سے نپٹنے کے لئے میری انتظامی ذمہ داری سب سے زیادہ تھی۔ میں نے دخل اندازی کی اور کہا کہ اس معاملہ کو اس نگاہ سے نہ دیکھا جائے تو بہتر ہے۔ لانگ مارچ تو ایک نام ہے اصل میں تو یہ ایک جلسہ اور جلوس ہے اور وہ بھی خالص سیاسی ہے۔ اسے سیاسی طور پر ڈیل کیا جائے۔ جمہوریت کا زمانہ ہے جلسے جلوس کی مخالفت نہیں کی جا سکتی انہیں یہ کھیل کھیلنے دیں۔ اگر کوئی گڑبڑ کریں گے تو ہم انہیں قانون کے مطابق سنبھال لیں گے۔ غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ پنجاب، چیف سیکرٹری پنجاب پرویز مسعود نے بھی میری تائید کی لہٰذا نواز شریف نے فیصلہ کیا کہ معاملے کو اسی طرح سنبھالا جائے اور غیر ضروری ریاستی قوت کے استعمال سے گریز کیا جائے۔ دو دن بعد ایک میٹنگ اسلام آباد میں ہوئی تو اس فیصلہ کو بدل ڈالا گیا حتیٰ کہ سردار عبدالقیوم جیسے دانا سیاستدان نے بھی قوتی فیصلے ہی کا ساتھ دیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ معلوم ہوا کہ صدر غلام اسحاق خان پی پی کے ساتھ سختی سے نپٹنے کے حق میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب میں ڈیرہ اسماعیل خان کا اسسٹنٹ کمشنر تھا تو وہاں میں چڑیا کو بھی پر نہیں مارنے دیتا تھا۔ خان عبدالقیوم سے بھابڑا میں فائرنگ بھی میں نے ہی کروائی تھی جس کے بعد کبھی نیپ سر نہ اٹھا سکی۔ ہم حیران تھے کہ بابا جی کب کی بات کر رہے ہیں۔ مزے کی بات ہے کہ جنرل آصف نواز حکومت کی ہر طرح سے مدد کے لئے تیار تھے اور مجھے ان کے بے نظیر کے گٹھ جوڑ کا پوری طرح علم تھا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ میں نے غلام حیدر وائیں سے بات کی کہ اس طرح کی باتوں میں کوئی خیر نہیں بلکہ مجھے تو اس کے پیچھے کوئی سازش محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے سازش کی تھیوری سے تو اتفاق نہ کیا، لیکن سیاسی اصول کے طور پر بلاوجہ سختی کو رد کر دیا۔

میرے لئے یہ کافی تھا کیونکہ وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور میں ان کی پالیسی کا پابند تھا اور میری عقل سلیم بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن میں نے اصرار کیا کہ وہ وزیر اعظم سے ان بڑھتے ہوئے سازشی سایوں کا ذکر ضرور کریں۔ پنجاب کی حد تک ہم نے فیصلہ کر لیا کہ بے نظیر کو جلسے جلوس کی کھلی چھٹی دینگے۔ مگر اسلام آباد صدر اور وزیر اعظم کی ذمہ

داری تھی اور جب بے نظیر باہر نکلیں تو اسلام آباد میں نہایت ہی بے ہودہ سختی کی کوشش کی گئی پھر بھی وہ راولپنڈی شہر کی طرف نکل آئیں جہاں سے ہم نے انہیں نہایت ہی حکمت سے کھسکا کر کراچی پہنچا دیا۔ بعد میں انہوں نے کراچی سے اسلام آباد تک ٹرین مارچ کا اعلان کر دیا۔ پنجاب کی حد تک ہم نے بالکل دخل نہ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عوامی تماشا، جو اکثر پولیس کی زیادتیوں سے ترتیب پاتا ہے، نہ بن سکا۔ نواز شریف کی اچھی حکمرانی کی وجہ سے عوام میں کوئی خاص ہیجان موجود نہیں تھا۔ یہ تو اونچی سطح کی ایک سازشی کڑی تھی جس سے عوام لاتعلق رہے اور سازشیوں کی ہزار کوشش کے باوجود متوقع ہنگامہ نہ ہو سکا اور جنرل آصف نواز کی "مدد" کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ بعد میں بے نظیر نے روڈ مارچ کا شوشہ چھوڑا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا اور وہ مایوس ہو کر بیٹھ گئیں اور سازشیوں کے ہاں صف ماتم بچھ گئی۔ اس لانگ یا شارٹ مارچ میں غلام مصطفیٰ جتوئی، فاروق لغاری، نوابزادہ نصر اللہ اور خورشید قصوری سب لوگ شامل تھے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ سب ہاتھ ملتے رہ گئے۔

غلام اسحاق خان اپنے زخم چاٹ رہے تھے تو آصف نواز ورزش سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ اور جتوئی اپنے سیاسی اور سازشی ترکش میں سے نئے نئے تیر نکالنے کی سوچ رہے تھے جبکہ تھک ہار کر بے نظیر نے نواز شریف کی طرف دست تعاون بڑھا دیا تاکہ آصف زرداری کی ضمانت ہو سکے۔ سازشوں اور لانگ مارچ کے زمانے میں بھی نواز شریف نے اپنی شائستگی قائم رکھی تھی اور آصف علی زرداری کو باوجود غلام اسحاق خان اور جام صادق علی کی مخالفت کے بحیثیت منتخب ایم این اے اسلام آباد لا کر راول ڈیم ریسٹ ہاؤس میں رکھا تھا۔ اس بات پر اسحاق خان بہت ناراض تھے۔ ایک دفعہ تو چودھری نثار علی کو کہہ دیا "تم کب سے ہنی مون انچارج بن گئے ہو، جو بے نظیر اور اس کے خاوند کے ملاپ کے اتنے اچھے بندوبست کرتے ہو"۔ دراصل بیوروکریسی اور تانا شاہی اس قسم کی سیاسی COTRIE کو سمجھتی ہی نہیں۔ وہ تو سیاسی مخالفت کو ذاتی اور قومی دشمنی سمجھتے ہوئے تذلیل و تعزیر کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ مگر نواز شریف ذرا مختلف قسم کے انسان تھے۔ دشمنوں کا سلوک بے نظیر نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ غلام اسحاق کے ساتھ نہیں مگر نہایت ہی شریف نواز شریف زرداری کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کر

رہے تھے جس پر غلام اسحاق خان چیں بجبیں تھے۔ بہرصورت کچھ عرصہ بعد حزب اختلاف کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی خاطر نواز شریف نے محترمہ بے نظیر کو پارلیمنٹ میں خارجہ کمیٹی کی چیئر پرسن منتخب کروا دیا۔ زرداری کی ضمانت ہوگئی اور بے نظیر اپنا تیسرا بچہ پیدا کرنے کے لئے سرکاری خرچ پر لندن چلی گئیں۔ اس بات پر تو غلام اسحاق خان کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے اسے اپنے خلاف ایک گہری سازش سمجھا اور سوچا کہ یہ دونوں مل کر اب ان کے وہ اختیارات، جو انہیں آٹھویں دستوری ترمیم کے تحت حاصل ہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد غلام اسحاق خان نواز شریف کے دشمن بن گئے کہ ہیں میری بلی اور مجھے ہی میاؤں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے نواز شریف پر احسان کیا ہوا ہے اور انہیں بے نظیر سے چھڑوایا ہی نہیں اسے وزیراعظم بھی بنوایا ہے حالانکہ نواز شریف تو غلام اسحاق خان کے بغیر اپنی سیاسی قوت سے وزیراعظم بنے تھے۔ انہیں سیاسی قوت حاصل نہ ہوتی تو وہ کبھی یہ مقام حاصل نہ کر سکتے۔ حالانکہ اسلم بیگ اور غلام اسحاق خان صاحب نے تو جتوئی کو وزیراعظم بنانے کی کوشش کی تھی۔ اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خان پہلے ہی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر نواز شریف کے خلاف اپنا عمر بھر کا تجربہ صرف کر رہے تھے۔ جدید اور قدیم کی ویسے ہی جنگ زوروں پر تھی اور غلام اسحاق خان اپنے آپ کو اولڈ آرڈر کا گرڈ فادر سمجھتے تھے، لہٰذا اس پس منظر میں جناب صدر نے مصطفیٰ جتوئی، کھر اور نوابزادہ نصر اللہ وغیرہ کو اشارہ دیدیا کہ اگر آپ کوئی گٹھ جوڑ کر لیں تو وہ نواز شریف کی حکومت کو ڈسمس کرنے کے لئے تیار ہیں۔ دریں اثناء غلام اسحاق خان نے لندن بیٹھی بے نظیر سے بھی رابطہ قائم کر لیا کہ انہیں نواز شریف کے خلاف استعمال کر سکیں۔ بے نظیر کو پتہ تھا کہ صدر تو محض ایک بااختیار عہدہ۔ اصل سیاسی قوت نواز شریف ہے اور اس سے اس کا آئندہ مقابلہ رہے گا۔ لہٰذا کیوں نہ بابا کو نواز شریف کے خلاف استعمال کر کے اسے ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ چند ماہ قبل "گو بابا گو" کے نعرے لگانے والی بے نظیر نہایت آرام سے اس بابا سے سازشوں کی پینگیں بڑھا رہی تھی اور سیدھا سادھا نواز شریف تعمیر وطن کے منصوبوں کے معائنے کر رہا تھا۔ وہ سمجھتے رہے کہ لانگ مارچ کو اپنی شائستگی سے شکست دینے سے اب انہیں حزب اختلاف سے کوئی خطرہ نہیں، مگر اب

ایوان صدر ان کی مخالفت کا سب سے بڑا گڑھ بن چکا تھا۔ جہاں سے اولڈ آرڈر اور پی پی کے قرب کا بندوبست ہو رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب بابا بہت زیادہ غصے میں تھے اور کہہ رہے تھے کہ نواز شریف دھوکے باز نکلے اور میری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بے نظیر سے مل گئے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ نواز شریف یہ کام بابے کے اختیارات ختم کرنے کے لئے نہیں کر رہے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی اصل سیاسی حریف بے نظیر ہیں مگر صدر کو کچھ انور ہی وہم ہو گیا اور اب وہ نواز شریف کے دشمن بن کر ہر کسی کو ان کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ نواز شریف کا مقصد سیاسی تھا اور غلام اسحاق کا ذاتی، کیونکہ اب ان کا عرصہ صدارت بھی ختم ہونے کو تھا اور دوبارہ الیکشن ہونے والے تھے۔ ان کا اعتماد نواز شریف سے اٹھ گیا تھا اور نہایت ہی برے طریقے سے وہ بے نظیر کو ساتھ ملا کر دوبارہ صدر بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس ذاتی مقصد کے حصول کے لئے وہ تمام حدیں عبور کر کے ایک سازشی بن گئے تھے۔ ادھر نواز شریف کا خیال تھا کہ بابا اور بے نظیر کا ملنا بعد المشرقین ہے اور وہ اس طرح اکٹھے نہیں ہونگے مگر مجھے ملک محمد علی وائس چیئرمین سینٹ نے آ کر صاف صاف بتا دیا تھا کہ بابا اب کچھ کرنے والے ہیں۔ ملک صاحب کے ساتھ خان صاحب کے بہت قریبی تعلقات تھے اور انہوں نے ملک صاحب کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ نواز شریف کو سبق سکھانے کے لئے وہ بے نظیر سے ملنے پر بھی آمادہ ہیں۔ میں نے یہ بات نواز شریف کو بتائی تو انہیں یقین ہی نہ آیا اور نہایت معصومیت سے کہتے ہیں "میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں، ہمارے آئندہ صدر غلام اسحاق خان ہی ہوں گے۔ ہم بے نظیر کے ساتھ کیسے مل سکتے ہیں، اسے تو میں صرف سیاسی Courtsy دکھا رہا تھا تاکہ پاکستان میں سیاست کی اچھی روایات پروان چڑھیں۔" مگر بیوروکریٹک اور سازشی ذہن سوچ کے اپنے ہی سانچے رکھتا تھا جس میں وہ ہر چیز میں سازش ہی سازش پڑھ رہا تھا۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھی جائے کہ لوگ شائستگی کو سازش کہنے لگے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ قدیم اور جدید کا تھا۔ اصل مسئلہ انقلاب کا راستہ روکنا تھا۔ وہ خاموش معاشرتی اور معاشی انقلاب جسے نواز شریف لا رہا تھا۔

نواز شریف کے خلاف اولڈ گارڈ کی سازش کے پلاٹ کو اس وقت کی دو اموات نے مزید گہرا کر دیا۔ ایک

موت تھی پاکستان مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو کی، جو کینسر کے جان لیوا مرض سے جانبر نہ آسکے اور دوسری موت تھی چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز کی، جو اپنے گھر سائیکل پر ورزش کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے اگلے جہاں سدھار گئے۔ ان دونوں موتوں کو بھی نواز شریف کے خلاف استعمال کیا..... جب لوگ سازش پر اتر آئیں تو وہ ہر چیز کو اپنے حق میں استعمال کر لیتے ہیں۔

محمد خان جونیجو کی موت امریکہ میں ہوئی تھی اور لاش آنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس دوران نواز شریف نے پاکستان مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ بلائی اور اپنے آپ کو صدارت کا امیدوار ظاہر کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اس غیر ضروری عجلت کا برا منایا اور کہا کہ کچھ وقت ذرا اور انتظار کیا ہوتا۔ نواز شریف صدر تو منتخب ہو گئے مگر کچھ شکر رنجی پیدا ہو گئی جس کا غلام اسحاق خان نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مخالفین کو طریقے طریقے سے نواز شریف کے خلاف اکسایا۔ اصل مسئلہ مسلم لیگ کی صدارت کا نہیں تھا۔ مسلم لیگ کی صدارت کے لئے نواز شریف سے بہتر اس وقت کوئی اور نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور بن سکتا تھا۔ اکثریت ان کے ساتھ تھی مگر ان کے مخالفین نے اس بات سے فائدہ اٹھانا تھا اور اٹھا لیا اور مسلم لیگ کے اندر بھی زبردست پھوٹ ڈال لی۔ حامد ناصر چٹھہ جو پہلی دفعہ کی جونیجو، نواز شریف خلفشار میں بھی نواز شریف کے خلاف سب سے آگے آگے تھے، نے کھل کر نواز شریف کی مخالفت شروع کر دی اور مسلم لیگ میں اپنا ایک الگ گروہ بنانا شروع کر دیا۔ اندھا مانگے دو آنکھیں کی مانند غلام اسحاق نے مسلم لیگ کی اس پھوٹ سے پورا پورا استفادہ کیا اور مسلم لیگ کے اندر سے ایک زبردست گروہ نواز شریف کے خلاف کھڑا ہو گیا حالانکہ غلام اسحاق خان خود بھی مسلم لیگ کے ممبر تھے اور پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ اپنے ہی صدر کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ اس دوران غلام اسحاق خان نے مسلم لیگ کے ناراض ممبران اسمبلی سے استعفے اکٹھے کرنا شروع کر دیئے تاکہ وقت آنے پر وہ انہیں نواز شریف کے خلاف دباؤ کے طور پر یا حکومت ڈسمس کرنے کے لئے استعمال کر سکیں۔

جنرل آصف نواز کی موت کو بھی غلام اسحاق خان نے نواز شریف کے خلاف نہایت بے اصولی اور بے

وردی کے ساتھ استعمال کیا۔ جنرل آصف نواز کی بیوہ سے رابطہ کر کے اس بے چاری کی ذہنی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواز شریف کے خلاف پریس کانفرنس کروائی اور الزام لگوایا کہ اس کے خاوند کو ایک سازش کے تحت زہر دلوایا گیا ہے اور اس کے ملزمان چودھری نثار علی، میاں شہباز شریف اور بریگیڈیئر امتیاز ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو ہیں، حالانکہ یہ بات بنتی نہیں تھی۔ جنرل آصف نواز اپنے گھر میں ورزش کر رہے تھے کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہوں فوری طور پر فوجی ہسپتال لے جایا گیا۔ آرمی ڈاکٹروں نے فوری طبی امداد دی مگر وہ دل کے ناکارہ ہونے سے فوت ہو گئے۔ وہاں سب انتظام فوج کا تھا۔ چیف آف دی آرمی سٹاف کی سکیورٹی بھی فوج ہی کرتی ہے اور شاید ہمارے ملک میں اس عہدے سے بڑھ کر کسی اور کی سکیورٹی نہیں کی جاتی۔ سویلین کا تو وہاں سایہ تک نہیں پڑ سکتا، مگر یار لوگوں کو اس سے کیا۔ بابا غلام اسحاق ضد میں آ گئے اور پھر تمام حدود و قیود پار کر گئے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی لاش کو بھی اپنے مخالف کے خلاف استعمال کر لیا۔ دراصل ہمارے زمینداروں، وڈیروں، خانوں، جرنیلوں اور بیورو کریٹس کی صدیوں سے یہی ذہنیت چلی آ رہی ہے کہ دشمن کے خلاف سب تیر چلائے جا سکتے ہیں اور غلام اسحاق خان کی شخصیت میں یہ تمام خصوصیات اکٹھی ہو گئی تھیں۔ وہ "وڈیرے" بھی تھے اور خان بھی بیوروکریٹ بھی اور جرنیلوں کے سپر جرنیل بھی۔ ایک عرصہ دراز سے جرنیلوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے تھے، لہٰذا اولڈ آرڈر اسٹیبلشمنٹ کے کشتہ کامل نے جنرل آصف نواز کی نعش کو پوری طرح Exploit کیا تاکہ آرمی میں نواز شریف کیخلاف نفرت ابھر سکے۔ سازشی واقعی شرمناک حد تک ظالم ہو سکتے ہیں۔ بے چارے مرحوم جرنیل کی نعش کو قبر سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے مراحل سے گزارا گیا اور پورے پاکستان میں پروپیگنڈہ کا اودھم مچا دیا۔

نواز شریف کے ہاتھ اس معاملہ میں چونکہ بالکل صاف تھے، اس لئے انہوں نے سپریم کورٹ کے ایک سینئر جج کی سربراہی میں تین جج صاحبان پر مشتمل ایک جوڈیشل کمیشن قائم کر دیا تاکہ وہ اس معاملہ کی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ تحقیق کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے۔ اس اعلیٰ اختیاراتی کمیشن نے پوری چھان بین کے بعد اسے دل فیل ہونے سے فطری موت قرار دیا۔ اس طرح نواز شریف کی اس الزام سے جان تو چھوٹ گئی مگر

بہت دھول اڑنے کے بعد، لیکن مخالفوں کے دل پھر بھی ٹھنڈے نہ ہوئے، وہ تو اس معاشرتی حقیقی تبدیلی کے محرم کو بالکل جڑ سے ختم کر دینا چاہتے تھے۔ نواز شریف طرح طرح کی جدیدیت لا کر ان کے خوابوں اور خیالوں کی دنیا کو یکسر بدل کر تباہ کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسی دنیا پیدا کر رہے تھے جس میں ان لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی تھی۔ اب تو اقتدار بھی اس کا اور زمانہ بھی اس کا بننے والا تھا، لہٰذا سازش دیگر صورتوں میں جاری رہی۔ حزب اختلاف نے اپنا تمام وزن جناب صدر کے پلڑے میں ڈال دیا اور بے نظیر کھل کر غلام اسحاق خان کے ساتھ مل گئیں۔ مصطفیٰ جتوئی اور نصر اللہ خان وغیرہ تقریباً ہر روز صدر سے ملاقات کر رہے تھے۔ حامد ناصر چٹھہ کا مسلم لیگی گروپ بھی کھل کر صدر کے ساتھ تھا اور صدر کے پاس قابل ذکر تعداد میں استعفے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

اس دوران نواز شریف پاکستان میں زیادہ سے زیادہ بیرونی سرمایہ کاری کی خاطر کبھی جرمنی جا رہے تھے تو کبھی سوئٹزر لینڈ، کبھی سعودی عرب اور کبھی عرب امارات، تاکہ ان کا ملک خوشحال ہو کر ترقی کر سکے۔ کبھی ایک پراجیکٹ کی انسپکشن، کبھی دوسرے کی، دن رات ایک کر دیا، لیکن سازشی ٹولہ اپنے کام پر لگا ہوا تھا۔ جب نواز شریف نے دیکھا کہ یہ لوگ برائی پر بری طرح سے تلے ہوئے ہیں تو ایک مدبر اور شریف انسان کے طور پر وہ صدر صاحب سے جا کر ملے اور تمام اختلافات بھلا دینے کو کہا، اپنی تابعداری بھی جتلائی اور آئندہ کی صدارت کا بھی غلام اسحاق خان سے وعدہ کیا تاکہ تعمیر وطن اور ترقی کے کاموں میں خواہ مخواہ خلل نہ پڑے۔ نواز شریف کی اس نیک نیتی کو غلام اسحاق خان نے ان کی کمزوری جانا اور اس آفر کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا۔ نواز شریف خواہ مخواہ اپنا وقت اور انرجی ان فضول باتوں پر ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے صلح کا ہاتھ بڑھا رہے تھے مگر بزرگوں نے ایک نہ مانی۔ بہت سے جید علماء اور معززین نے کوشش کی کہ صلح ہو جائے مگر بے سود۔ وہ نواز شریف کی طرف سے صدارت پر دوبارہ انتخاب کو بھی محض ایک خیال، بلکہ سودے بازی کی کوشش قرار دے رہے تھے۔ دراصل خان صاحب کا مقصد تو اس نواز شریف کو سرے سے ہی ختم کرنا تھا جو جاگیرداری اور بیوروکریسی کی پرانی پرسکون دنیا تباہ کر رہا تھا۔ موبائل، ٹیلیفون اور کمپیوٹر جیسی شیطانی ایجادات پاکستان کے اندر داخل کر رہا تھا۔ چنانچہ نواز شریف کی

اپنی پارٹی کے اندر سے استعفے شروع ہو گئے۔ فاٹا کے کچھ ممبران نے بھی نواز شریف سے لاتعلقی ظاہر کر دی اور چند وزراء بھی استعفے کے لئے تیار ہو گئے۔ نواز شریف نے جب دیکھا کہ بابا انتہائی اقدام پر تلا ہوا ہے تو وہ آخری قدم کے طور پر عوام کے پاس چلے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا اور صدر کی مختلف چالوں کا پردہ چاک کر ڈالا۔ نواز شریف نے صاف صاف کہا کہ ایوان صدر، جسے وفاق کے اتفاق کی علامت ہونا چاہئے تھا، وہ نفاق کی آماجگاہ بن چکا ہے اور طرح طرح کی تازشیں وہاں جنم لے رہی ہیں۔ نواز شریف کی یہ تقریر 17 اپریل 1993ء کی شام کو ہوئی اور اگلے دن صدر نے آٹھویں دستوری ترمیم کے اختیارات کا سہارا لے کر قومی اسمبلی ختم کر کے نواز شریف کی حکومت برخواست کر دی اور تمام گورنر بدل دیئے۔

عالم برزخ

18 اپریل 1993ء کی شام نواز شریف کی حکومت ختم کر دی گئی، حالانکہ انہیں اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل تھی۔ یہ ضیاء الحق کی لائی ہوئی آٹھویں دستوری ترمیم کا کمال تھا کہ جب بھی صدر پاکستان کا دل چاہے وہ پاکستان میں جمہوری عمل کا تیا پانچا کر دے۔ جیسے پہلے بیان ہوا ہے۔ صدر غلام اسحاق خان نے پہلے دن ہی سے نواز شریف کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف ہر قدم ان کی اجازت سے اٹھائیں۔ اس لئے وہ ہر روز ہدایاتی چٹھیاں داغتے۔ آٹھویں ترمیم کی تلوار کو لٹکائے ہی نہیں چمکائے بھی رکھتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پنجاب کے سوا دیگر تمام صوبوں میں اپنی طفیلی حکومتیں بنا رکھی تھی۔ اس طرح معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا سیاسی بندوبست بھی کر رکھا تھا تا کہ تیزی سے تبدیلیاں لانے والا فعال و متحرک نواز شریف بیوروکریسی کے مزاج کے خلاف نہ چل سکے۔ اس موقع پر جب مسلم لیگ میں بوجوہ پھوٹ پڑ چکی تھی اور نواز شریف کی حکومت برخواست ہو چکی تھی، صدر پاکستان نے پنجاب اسمبلی کے سپیکر میاں منظور احمد وٹو کو شہ دی کہ وہ نواز شریف سے بغاوت کر جائیں۔ میاں نواز شریف اور میاں منظور وٹو تحریک استقلال میں ساتھ رہے تھے۔ میاں صاحب ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اور انہیں اپنا خاص آدمی سمجھتے تھے۔ ان کے اس خاص آدمی نے پنجاب کے بہت سے ایم پی اے

اپنے اتھ ملا رکھے تھے اور نواز شریف حکومت کی برخواستگی پر یہ موقف اختیار کیا کہ میاں نواز شریف نے اپنی عجلت پسندی اور RASHNESS سے اپنی اسمبلی توڑ ڈالی ہے۔ کیوں نہ ہم پنجاب کی حد تک اپنی اسمبلی بچالیں اور ظاہر کریں کہ ہم صدر صاحب کے تابعدار ہیں۔ مناسب وقت آنے پر ہم دوبارہ میاں نواز شریف کے ساتھ مل جائیں گے۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تا کہ وہ ممبران جو اس لمحہ کنفیوژ تھے اور نواز شریف کے وفادار بھی، انہیں وٹو کا ساتھ دینے میں کوئی زیادہ حجاب یا ذہنی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ کام انہوں نے نہایت ہوشیاری سے کیا اور بہت سے اراکین اسمبلی کو نہایت آرام سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اندر سے وہ خود وزیر اعلیٰ بننے کے لئے مکمل طور پر صدر سے ملے ہوئے تھے ظاہراً انہوں نے یہی کیا کہ وہ ایک وقتی حکمت اور مصلحت سے کام لے کر نواز شریف کا بھلا کر رہے ہیں۔ یہ وہ فریب تھا جس میں بہت سے ایم پی اے آگئے اور نواز شریف کا ساتھ چھوڑ گئے اور اپنی اسمبلی بچالی۔ میاں منظور وٹو پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ اس طرح صدر غلام اسحاق خان نے آٹھویں ترمیم کے اختیارات کے ساتھ ساتھ ایک ایسا سیاسی کھیل کھیلا کہ تمام صوبوں پر ان کا مکمل قبضہ ہو گیا اور نواز شریف کو اقتدار سے ایسے باہر نکال دیا گیا جیسے مکھن میں سے بال نکال دیا جاتا ہے۔

اس لمحہ نواز شریف کے "وفادار" سرکاری ملازموں کو بھی ادھر ادھر کیا گیا۔ میرا شمار نواز شریف کے قریب ترین افسروں میں ہوتا تھا اور میں ہر لحاظ سے انکا "وفادار" تھا بھی۔ ان تبادلوں میں میرا تبادلہ بھی شامل تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ لوگ مجھے آئی جی پنجاب نہیں رہنے دیں گے، لہٰذا میں نے سیاسی تبدیلی کے پہلے دن ہی اپنا دفتری کام مکمل کر لیا اور تمام زیر التواء فائلیں نبٹا دیں اور تبادلے کے لئے تیار بیٹھ گیا مگر جب تبادلوں کا ریلا آیا تو میرا نام اس میں شامل نہیں تھا، میں حیران ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ "باخبر" ایجنسیوں نے صدر صاحب کو خبر دی ہے کہ چودھری سردار اپنی پولیس میں بہت پاپولر کمانڈر ہے۔ پولیس والے اس پر جان چھڑکتے ہیں اس لئے اس کے تبادلے میں ذرا احتیاط سے کام لیا جائے کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ یہ میری نہیں اہل بست وکشاد کی سوچ یا اطلاع تھی۔ مجھے معلوم ہوا تو سچی بات ہے میں بہت خوش ہوا کہ چلو کچھ اہم لوگ میرے متعلق اتنی خوش فہمی کا شکار

ہیں۔ یہ خوش ہیں تو میرا کیا نقصان ہے۔ ویسے میں ہی نہیں کسی بھی سرکاری اہلکار کی اتنی سی ذہنی اڑان ہوتی ہے۔ میں کوئی سیاسی کارکن تو تھا نہیں میں نے اسپر چپ سادھ لی اور سوچا کہ وقت آنے پر سچائی سامنے آجائے گی اور میاں نواز شریف جو میرے اتنے مہربان تھے اور میں نے سات سال ان کے ساتھ دن رات کام کیا تھا، معاملے کو سمجھ لیں گے۔ مجھے یہ خدشہ ضرور تھا کہ ان کے دل میں کوئی غلط فہمی نہ بیٹھ جائے کیونکہ میرے ساتھ ہمیشہ بہت زیادہ شفقت کرتے تھے اور مشکل وقتوں میں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا، لیکن میں خاموش رہ کر سوچتا رہا۔ میاں نواز شریف نے ان سات برسوں میں مجھے کبھی کوئی ناجائز یا غیر قانونی کام نہیں کہا تھا اور نہ میں نے کوئی ایسی حرکت کی تھی۔ وہ میری بڑی ہی عزت کرتے تھے تو میں بھی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ پہلے سوچا میں خود ہی چھٹی لے لوں بلکہ ایک دفعہ سوچا کہ ہسپتال داخل ہو جاؤں مگر مصلحت کیشی میری فطرت نہیں۔ میں نے یہ کام عمر بھر نہیں کیا تھا۔ بڑے سے بڑے لوگوں کے سامنے حتیٰ المقدور صاف بات کہنے کا عادی تھا جس کی وقتاً فوقتاً مجھے سزا بھی ملتی رہی۔ میں بہت دفعہ افسر بکار خاص یا یوں کہئے افسر بیکار رہا۔ کئی دفعہ معطل بھی ہوا، مگر اپنی خو نہیں بدلی۔ اب ہسپتال داخل ہونا مجھے کسر شان محسوس ہوا۔ میاں نواز شریف جیسے نفیس انسان سے غلط فہمی بھی مجھ پر گراں گزر رہی تھی اور یقین کیجئے آج تک گزر رہی ہے۔ دنیا لاکھ کہے لیکن جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ بہت ہی پیارا اور نیک انسان ہے اور رہے گا۔ میں نے اتنا صاف گو اور صاحب کردار پاکستان میں کوئی حکمران نہیں دیکھا..... اور میں نے سب کو ہی دیکھا ہے۔

اس مشکل لمحہ میں میاں نواز شریف سے پہلے میری ملاقات میاں منظور وٹو سے ہوگئی کیونکہ میاں نواز شریف ابھی تک اسلام آباد ہی میں تھے۔ میاں منظور وٹو بھی اپنی طرز کے ایک نہایت ہی دانا اور چتر انسان ہیں۔ میاں نواز شریف چالاک نہیں، عقلمند ہیں مگر منظور وٹو ساتھ ساتھ نہایت چالاک ہیں وہ دلیل وہ اپنے ایم پی ایز کو دے رہے تھے اس کا اثر میرے ذہن پر بھی ہوگیا اور میں نے سمجھا کہ یہ جو بھی کر رہے ہیں وہ واقعی میاں نواز شریف کے بھلے میں کر رہے ہیں، اس لئے میری ذہنی خلش ذرا کم ہوگئی اور اس رات میں چین کی نیند یہ سوچ کر

سویا کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔ اگلے روز میری ملاقات جناب حسن پیرزادہ سے ہوئی۔ وہ سرو قلندر میاں نواز شریف کے بہت قریب تھا۔ سمجھئے میاں نواز شریف کا نفس ناطقہ تھا۔ بہت ہی بھلا اور نیک انسان۔ فرماتے ہیں "آپ ٹھیک کر رہے ہیں، آپ فکر نہ کریں، میں میاں صاحب کو سب سمجھا دوں گا۔ آپ میاں نواز شریف سے ملیں بھی مت، وگرنہ معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا اور جو اچھا کام آپ کر رہے ہیں وہ نہیں کر سکیں گے اور یہ خبیث لوگ آپ کو بدل دیں گے۔" پیر صاحب کی اس بالت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور میں اپنے منصب پر کام کرتا رہا۔ اس واقعہ نے میاں نواز شریف کے دل میں میرے خلاف رنجش پیدا کر دی۔ شاید حسن پیرزادہ میاں صاحب سے وضاحت نہ کر سکے ہوں اور اگر کی بھی ہو تو اپنے دکھ میں میاں صاحب نے نہ مانی ہو، لیکن میں نے خود کوئی وضاحت پیش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگرچہ تھوڑی ہی دیر بعد جب میاں صاحب سپریم کورٹ سے بحال ہو کر دوبارہ پرائم منسٹر بن گئے تو منظور وٹو وغیرہ نے مجھے آئی جی پنجاب کے عہدہ سے فوراً فارغ کر دیا اور مجھے افسر بکار خاص لگا کر کھڈے لائن ڈال دیا اور وہیں سے میں 60 سال کی عمر کو پہنچ کر ریٹائر ہو گیا۔ قاری کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میاں صاحب دوبارہ وزیر اعظم بن کر ایک دفعہ پھر اقتدار سے باہر ہیں، بلکہ اس وقت تو وہ جیل میں ہیں اور میرے ساتھ ان کی وہ رنجش یا گلہ ابھی تک قائم ہے۔ شاید ان کی رنجش جائز ہے مگر میں نہیں مانتا کیونکہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ حالات کا ایک جبر تھا یا دھوکہ تھا، مگر وہ حالات بدل گئے۔ میں سوچتا ہوں کہ میاں صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں ان سے بھی زیادہ غصہ کرتا۔ انہوں نے اتنا زیادہ غصہ نہیں کیا جتنا انہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ ان کے ذہن کے مطابق میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے کہ غلط یا صحیح بداعتمادی پیدا ہو جائے تو اکثر لوگ ظلم کی حدیں پار کر جاتے ہیں۔ کل کے بہترین دوست بدترین دشمن بن کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے تک پہنچ جاتے ہیں، مگر میاں نواز شریف میں شرافت اور شائستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھ سے منہ پھیر لیا مگر دوبارہ اقتدار میں آ کر بھی کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی، بلکہ جب میرے والد صاحب فوت ہوئے تو بحیثیت وزیر اعظم باقاعدہ تعزیت کے لئے تشریف لائے اور تالیف قلب کی۔ یہ سیاست کی ٹیڑھی راہوں کا

سیدھا راہی ایک بہت ہی بھلا انسان ہے۔ اسے سیاست نے بدنام اور خوار کیا مگر اس کی سیاست نے ملک کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی بردباری اور تحمل نے ایک مارشل لاء زدہ معاشرہ میں مرہم کا کام کیا اور قوم کی کشتی کو آگے ہی آگے چلاتا گیا۔ میاں نواز شریف کی میرے خلاف تمام تر ناراضی کے باوجود میں یہ سطور اپنی سوچ اور مشاہدہ کے مطابق نہایت دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ ایک قومی فریضہ سمجھ کر لکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد میاں نواز شریف کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تھا کہ وہ خاموش بیٹھ جائیں اور دوسرا راستہ سیاسی جدوجہد کا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک امیر زادے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کی گود سے اٹھے ہیں، اس لئے اب وہ خاموش بیٹھ جائیں گے اور اپنے خاندان کے وسیع کاروبار میں جت جائیں گے، لیکن سیاست چیز ہی ایسی ہے بقول شخصے چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اگر وہ عام سے سیاستدان ہوتے جو محض اپنے مفادات کی خاطر سیاست میں آتے ہیں تو وہ ضرور ایسا ہی کرتے۔ وہ تو ایک انقلابی نوجوان ہیں جو بہت سی چیزوں کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کا ایک پروگرام تھا وہ پاکستان کو ایک جدید مملکت دیکھنے کے خواب دیکھتے رہے، لہٰذا وہ نیچے کیسے بیٹھتے۔ انہوں نے دستور اور عوام کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پسند کیا اور راولپنڈی سے ٹرین پر سوار ہو گئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کا لیڈر نواز شریف ٹرین سے لاہور جا رہا ہے تو راولپنڈی سے لاہور تک عوام ہی عوام تھے۔ ہر ریلوے سٹیشن پر ان کا ایسا پرتپاک استقبال ہوا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی اور میاں محمد نواز شریف جسے اسٹیبلشمنٹ کا بندہ کہا جاتا تھا وہ اسٹیبلشمنٹ کے باوجود عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر ابھرا اور قومی لیڈر بن گیا۔ لوگوں نے ان کے بے لوث کام کا صلہ دیا اور بیوروکریسی تکتی رہ گئی۔

میاں محمد نواز شریف نے عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دستوری درخواست اسمبلی اور حکومت کی بحالی کے لئے دی کہ ان کی حکومت بلاوجہ ڈسمس کر دی گئی ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح رواج ہے کہ ہر حکومت کی رخصتی پر یہ الزام ضرور لگایا جاتا ہے کہ جانے والی حکومت بہت زیادہ بددیانت تھی۔ وہ الزام اس دفعہ بھی نہ صرف پیہم لگایا گیا بلکہ اس کی تشہیر کے لئے میاں زاہد سرفراز وزیر داخلہ کو روزانہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر لایا گیا۔ طرح طرح

کے الزامات ہوا میں بکھیرے جاتے تا کہ عوامی رائے نواز شریف کے خلاف ابھاری جائے مگر جوں جوں ان بے بنیاد الزامات کی تشہیر کی جاتی توں توں میاں نواز شریف کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا جاتا کہ زیادہ تر الزامات نہایت ہی مضحکہ خیز اور بے معنی تھے۔ یوں جو ہتھیار ان کے خلاف چلایا جا رہا تھا وہ ان کے حق میں ثابت ہوا۔ عامتہ الناس کو حقیقت حال کا احساس تھا، وہ سمجھتے تھے کہ لڑائی کسی اور بات پر ہے۔ دراصل یہ لڑائی قدیم اور جدید کی تھی مگر کرپشن کو بہانہ بنایا جا رہا تھا۔ یہ عدالت عظمیٰ کو متاثر کرنے کی کوشش تھی۔ عدالت عظمیٰ بھی سمجھتی تھی کہ یہ سب چالبازی تھی۔ کیونکہ پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے جج صاحبان نہایت ہی ذہین وفطین لوگ تھے مگر نواز شریف کو ہٹانے کا جو ایک بڑا مقصد تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے ہٹتے ہی تعمیر وطن کے تمام کام ٹھپ ہو کر رہ گئے۔ پلوں، شاہراہوں، ریلویز، واٹر ویز، مواصلات، انٹر چینج حتیٰ کہ معمولی معمولی درستی و مرمت کے کام بھی بند ہو گئے کیونکہ غلام اسحاق خان اور سردار یٰخ شیر مزاری (عبوری وزیر اعظم اور بہت بڑے زمیندار) کی سوچ میں ایسے فلاحی کام لوگوں کو خراب کرنے کے مترادف تھے۔ ییلو کیب سکیم پر تو باقاعدہ غلام اسحاق خان نے اپنی تقریر میں نواز شریف پر تنقید بھی کی کہ اس طرح انہوں نے پڑھے لکھے لوگوں کو ڈرائیور بنا دیا۔ شاید وہ انہیں انگریزی روایت کے تسلسل میں کلرک بابو ہی دیکھ سکتے تھے۔ سندھ کے وہ ہاری جن میں نواز شریف نے زمینیں تقسیم کی تھیں ان کی تو شامت آ گئی۔ انہیں گاؤں چھوڑ کر شہروں میں پناہ لینی پڑی۔ وڈیروں کو غصہ تھا کہ یہ کمینے لوگ کس طرح صاحب اراضی بن گئے اور ان کی صدیوں پرانی غلامی سے آزاد ہو گئے۔

عدالت عظمیٰ نے اس دستوری مقدمہ کی ایک طویل سماعت کی اور اس معاملہ کو ہر پہلو سے جانچا، تولا، پاکستان کی دستوری تاریخ کو کھنگالا۔ جسٹس منیر اور ان کے جانشینوں کے فیصلے زیر بحث آئے۔ کامیاب انقلاب اور نظریہ ضرورت کے حسن وقبح کے تجزیے ہوئے۔ پاکستان کے بڑے بڑے قانون دانوں اور وکلاء نے سر جوڑے، ہر طرف سے دلائل کی بھرمار ہوئی۔ کرپشن کے عذر لنگ کا ذکر ہوا، مارشل لاؤں کی برکات سے پاکستان کی تباہی اور ٹوٹنے کے قصے ایک بار پھر تازہ ہوئے، دستور کشی اور قانون کی راہوں سے ہٹ کر ہم نے

معاشرتی اخلاق باختگی کی جو فصلیں بوئی اور کاٹیں ان کے تذکرے ہوئے۔ اس کے بعد عدالت عظمیٰ اس فیصلہ پر پہنچی کہ پاکستان کی سب سے بڑی بدقسمتی دستوری راہوں سے دوری اور جمہوری روش سے مفارقت رہی ہے، معاشروں کی جان، نظم وضبط اور ترقی صرف اور صرف دستوری پگڈنڈیوں پر چلنے ہی سے ہے۔ سیاسی عمل سے افراد غلط فائدے اٹھا سکتے ہیں مگر آخر کار سیاسی عمل کا خودکار اور صحیح طریقہ ہی معاشرے کو بہتر بنانے کا بہترین ذریعہ بنتا ہے اور موجودہ صورت میں اسمبلیوں اور حکومت نے وہ قصور نہیں کیا تھا جس کا الزام لگا کر جناب صدر نے دستور کی دفعہ 58B(1) کا سہارا لیتے ہوئے انہیں چلتا کیا۔ نہ اس فرد واحد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اتنی آسانی سے عوام کے فیصلے کو حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ لہٰذا نواز شریف کی حکومت اور اسمبلی بحال کر دی گئی اور وہ یہ مقدمہ جیت کر ایک بار پھر وزیر اعظم بن گئے۔ صدر غلام اسحاق کی آمریت کو شکست ہوئی اور جمہوری آواز کو وزن ملا۔ اس موقع پر ملک کے خیر خواہوں نے دونوں شخصیات کے درمیان ایک دفعہ پھر صلح کروانے کی کوشش کی مگر وہ صلح ہونی تھی نہ ہو سکی۔ اب طرفین کا غم وغصہ، دو آتشہ تھا۔ وزیر اعظم اپنا مقدمہ جیت کر نہایت دلربائی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتھ صدر کے پاس جا سکتے تھے اور ملکی مفاد میں مل جل کر کام کرنے کی آفر کر سکتے تھے، مگر انہیں اس حسین اقدام کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ ملک کے وسیع تر مفاد میں ذاتی جھگڑے پس پشت ڈال سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کر گزرتے تو ان کا مقام عوامی نگاہ میں بہت زیادہ بلند ہوتا، مگر انہوں نے یہ موقع ضائع کر دیا۔ شاید جوانی اور جوش نے ان کے ہاں شکوے کی بہت زیادہ جگہ بنائی تھی، مگر جب خدا مقام بلند کر دے تو پھر اس کی خاطر ایسی باتوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ بحال شدہ اسمبلی نے نواز شریف کے حق میں مکمل اعتماد کا ووٹ دیا۔ اس کے بعد اگرچہ میاں صاحب کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی لیکن صدر اور وزیر اعظم کے درمیان سرد جنگ مزید تیز ہو گئی۔

صدر غلام اسحاق خان بھی اپنی ضد پر اڑے رہے اور زندگی بھر کے تجربے کو جمہوری عمل کی تباہی پر لگا دیا۔ تمام صوبوں میں ان کے ہم نواؤں کی حکومت تھی۔ منظور وٹو نے نواز شریف سے بغاوت کر کے پنجاب میں بھی اپنی حکومت مستحکم کر لی تھی اور پنجاب کے گورنر چودھری الطاف حسین، غلام اسحاق کے دست راست اور سازشوں کے

بادشاہ تھے۔ نواز شریف کی حکومت بحال ہوتے ہی ان لوگوں کی سیاسی پوزیشن کمزور ہونے لگی، بہت سے صوبائی ممبران نواز شریف کی طرف مراجعت کر رہے تھے اور منظور وٹو کی اکثریت مشکوک ہو گئی تھی۔ اس موقعہ پر ایک طرف سے عدم اعتماد کی تحریک ہوئی تو دوسری طرف موجود حکومت کی جانب سے اسمبلی تحلیل کرنے کی سفارش ہوئی، چونکہ گورنر، وزیر اعلیٰ اور صدر ایک ہی کشتی کے سوار تھے، اس لئے اس حیثیت نے پنجاب اسمبلی کو تحلیل قرار دیدیا، یعنی جب قومی اسمبلی بحال ہو گئی تو پنجاب اسمبلی فنا ہو گئی۔ یوں کاروبار حکومت ایک دفعہ پھر سیاسی فتنہ وفساد کا شکار کر دیا گیا۔ پنجاب اسمبلی کی تحلیل قومی اسمبلی کی برخواستگی سے مختلف انداز میں ہوتی تھی۔ یہاں یہ کام وزیر اعلیٰ کے مشورہ پر کیا گیا۔ اس طریقہ کا دستور میں واضح ذکر ہے مگر نیشنل اسمبلی کو صدر نے ڈسمس کیا تھا۔ اب سوال اٹھا کہ وزیر اعلیٰ نے کس وقت مشورہ دیا اور حزب اختلاف نے کس وقت عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ مشورہ گورنر کے پاس جاتا ہے اور عدم اعتماد اسمبلی سیکرٹری کے پاس۔ اس جھگڑے میں صحیح وقت کے تعین کی بہت زیادہ اہمیت بن گئی کیونکہ اسی سے فیصلہ ہو سکتا تھا کہ اگر عدم اعتماد پہلے داخل ہوا ہے تو پھر وزیر اعلیٰ تحلیل نہیں کر سکتا اور اگر اسمبلی توڑنے کا مشورہ پہلے جا چکا ہے تو قرارداد عدم اعتماد بیکار ہے۔ چونکہ گورنر اور وزیر اعلیٰ کی ملی بھگت تھی اس لئے انہوں نے وقت کا اندراج اپنی مرضی سے کر لیا۔ اب سیکرٹری اسمبلی کی شہادت بہت زیادہ Ciucial بن گئی اور سیکرٹری اسمبلی منظر سے یکدم غائب ہو گیا۔ اس گمشدگی نے معاملہ کو اور بھی گھمبیر بنا دیا۔ منظور وٹو وغیرہ نے فوراً سیکرٹری کے اغوا کا پرچہ اپنے سیاسی مخالفوں، یعنی میاں نواز شریف اینڈ کو پر کروا دیا اور دوسری پارٹی ہائیکورٹ چلی گئی۔ پرچہ چونکہ پولیس نے کیا تھا اور پولیس صوبائی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے، اس لئے اب پولیس بھی دباؤ میں آ گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب منظور وٹو وغیرہ راقم پر (جو اس وقت آئی جی پنجاب تھا) پوری طرح بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ راقم محض سیاسی بناء پر میاں نواز شریف تو کیا کسی پر بھی بلاوجہ ہاتھ نہیں ڈالے گا بلکہ راقم کی موجودگی میں پوری پولیس اس قسم کی غلط کارروائی نہیں کرے گی۔ پولیس وہی کرے گی جو اسے سچائی کی بنیاد پر کرنا چاہئے۔ اللہ کے فضل سے اس فقیر نے اپنے دور میں پولیس اور معاشرے میں ہزار گراوٹ کے باوجود یہ کام کافی حد تک کر دکھایا تھا اور

منظور وٹو کو اس کا اچھی طرح علم تھا، لہٰذا اب مجھے اس منظر سے ہٹنا ہی ہٹنا تھا اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جب مجھے اس جگہ سے ہٹایا گیا تو یکدم پنجاب پولیس نے کام بند کر دیا اور ایک عجیب وغریب قسم کی خاموشی اختیار کر لی گئی۔ منظور وٹو، جس کسی کو بھی ڈی آئی جی، ایس پی، ڈی ایس پی تعینات کرنا چاہ رہے تھے وہ انکار کر رہا تھا۔ اگلے دن جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو نظم وضبط کے پابند سرکاری ملازم کے طور پر راقم نے بہت سے پولیس افسران کی فرداً فرداً منت سماجت کی کہ نہیں ہم یہ نہیں کر سکتے۔ ہم پاکستانی قوم کے ملازم ہیں۔ کسی فرد واحد کے نہیں۔ ہمیں افراد کی نہیں حق اور سچ کی بنیاد پر قائداعظم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے سٹیٹ اور قوم کی خدمت کرنا ہے۔ تب جا کر یہ قضیہ ختم ہوا اور نہایت خاموشی سے ختم ہوا۔ اس وقت نصر اللہ دریشک اور خدا بخش ٹوانہ منظور وٹو کے قریب ترین ساتھی وزراء اس بات تک پہنچ گئے تھے کہ راقم بے شک آئی جی پولیس ہی رہے مگر اس فتنہ وآزمائش سے انہیں نکالے۔ میں نے کہا آپ کے لئے نہیں میں ملک کے لئے کام کروں گا اور نہایت خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ پنجاب پولیس کے بہت سے سینئر افسران اس وقت بھی بہت اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں جنہوں نے اس وقت میرے تبادلے پر صوبائی حکومت کی سرتابی کی مگر میں ان کے نام لکھنے سے گریز کر رہا ہوں کہ ایسی باتیں لکھی نہیں جاتیں۔ ہماری زندگی میں یہ وقت بھی آیا کہ ہم ان لوگوں کو بے بس کر دیتے مگر ہم اسے ملک وملت کے فائدے میں نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے اس وقت بحال شدہ وزیراعظم میاں نواز شریف بھی روک سکتے تھے۔ سعید مہدی گواہ ہیں کہ جب میاں نواز شریف کو اس ساری صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے سیاسی فائدہ اٹھانے سے گریز کیا اور سرکاری محکمانہ ڈسپلن کو ترجیح دی۔ اپنی سیاسی جنگ سیاسی طریقوں سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور سب کچھ ہائی کورٹ پر چھوڑ دیا۔ ان حقائق کو آج تک میں نے اپنے سینے میں چھپائے رکھا تھا۔ ان واقعات کی روشنی میں، جن کا میں چشم دید گواہ ہوں، میرے دل میں میاں نواز شریف کے لئے احترام ہی احترام ہو سکتا تھا۔ ہم نے بہت حکمران دیکھے ہیں جو اپنے معمولی فائدے کے لئے پتہ نہیں کیا کچھ کر گزرتے ہیں اور تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں، مگر نواز شریف ایسے انسان ہیں جو اپنے مشکل ترین لمحہ میں بھی چند بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کرتے۔ وہ میرے ساتھ آج تک

ناراض ہیں مگر انہوں نے مجھے اس نازک لمحہ بھی استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں انہوں ہوں کہ انہوں نے ایسے نہیں کیا۔ میں کمزور سا انسان ہوں، ہوسکتا ہے میں استعمال ہو جاتا اور پھر ساری عمر پچھتا تا رہتا۔

قصہ کوتاہ ہائیکورٹ نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی بحال کر دی، مگر گورنر پنجاب نے بحالی کے 7 منٹ کے اندر اندر اسمبلی کو ایک دفعہ پھر تحلیل کر کے میاں منظور وٹو کو عبوری وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اب ایک زبردست سیاسی کشمکش شروع ہوگئی۔ میاں نواز شریف نے منظور وٹو، گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین اور صدر غلام اسحاق کا گٹھ جوڑ توڑنے کے لئے قومی اسمبلی اور سینٹ کا مشترکہ اجلاس بلا کر دو تہائی اکثریت سے قرارداد منظور کروائی جس کے مطابق گورنر کی جگہ ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ پیدا کیا اور پنجاب حکومت تحلیل کر کے تمام اختیارات ایڈمنسٹریٹر کو دے دیئے۔ ساتھ ہی پرویز مسعود کو چیف سیکرٹری پنجاب اور نثار چیمہ کو آئی جی پنجاب تعینات کر دیا مگر ان کی مخالف تثلیث نے ان تمام عہدیداروں کو بہروپیا گردان کر ان کی گرفتاری کا اہتمام کیا اور وہ ہائیکورٹ سے ضمانت قبل از گرفتاری کرواتے پھرے۔ اس موقع پر میاں نواز شریف نے پارلیمنٹ کی قرارداد کو دستخط کے لئے صدر کے پاس بوجوہ نہ بھیجا اور اس کے بغیر ہی مندرجہ بالا احکامات جاری کر دیئے، حالانکہ بے نظیر بھٹو، جتوئی، نصر اللہ وغیرہ کے کہنے کے باوجود جناب صدر نے کہا تھا کہ اگر وہ قرارداد ان کے پاس آئی تو وہ ضرور دستخط کر دیں گے کیونکہ انکے مطابق پارلیمنٹ کی اکثریت ملک کی مقتدر ترین باڈی تھی اور وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ غلام اسحاق خان کو ان کے رفقائے کار مذاق سے ''اہل کتاب'' کہتے تھے کیونکہ وہ زندگی بھر قاعدے قانون کی کتاب سے نہیں ہٹتے تھے چاہے وہ اسے کسی بھی انداز میں کیوں نہ لیں لیکن قاعدے قانون کی طرح ضرور ہونی چاہئے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ سیاسی بناء پر دستخط نہیں کریں گے۔ یہ میاں صاحب کی غلطی تھی اور اس غلطی کا نوٹس جی ایچ کیو میں بھی لیا گیا۔ اب فوج اس بے قاعدگی کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھی اور میاں صاحب مشکل میں پھنس گئے تھے۔ ان کی طبیعت میں عجلت پسندی ان کی کمزوری بن گئی۔ اس وقت میاں شہباز شریف نے مجھ سے رابطہ قائم کیا کہ وہ مجھے پنجاب کا آئی جی لگا رہے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں میرا ایسا مقام اور احترام تھا کہ پنجاب پولیس میرا حکم فوراً

مان لے گی اور پنجاب حکومت پر میاں محمد اظہر ایڈمنسٹریٹر کا قبضہ ہو سکے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جی ایچ کیو کی سوچ اس وقت تک آپ کے ساتھ نہیں ہوگی جب تک آپ اس قرارداد اور دستاویز پر صدر سے دستخط نہیں کروا لیتے۔ آپ یہ کام کریں اور مجھے آئی۔ جی۔ پی پنجاب لگانے کے احکام جاری نہ کریں، آپ کا فائدہ اسی میں ہے اور مجھے معلوم ہے کہ صدر اسحاق خان دستخط کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میاں شہباز شریف فوراً اسلام آباد روانہ ہو گئے اور پھر ایک تماشا ہوا۔ پتہ نہیں انہوں نے وہاں جا کر کیا کچھ کیا مگر خبر آ گئی کہ محترمہ بے نظیر ایک دفعہ پھر اسلام آباد پر لانگ مارچ کر رہی ہیں تا کہ میاں نواز شریف کو عوامی قوت سے گرایا جا سکے۔ معلوم ہوا اس کام میں انہیں صدر مملکت، میاں منظور وٹو اور دوسرے سیاستدانوں کی ہلاشیری حاصل تھی۔ اس وقت سنا گیا کہ میاں منظور وٹو نے کروڑوں روپے کا انتظام کیا۔ اس سارے معاملے کے مہتمم فاروق لغاری تھے۔ بندوں کا انتظام بے نظیر بھٹو نے کیا۔ اس طرح اسلام آباد پر زبردست چڑھائی کے انتظامات کئے گئے۔ ادھر نواز شریف نے بھی اسلام آباد کے دفاع کی خاطر حتی المقدور پولیس کا بندوبست کر لیا۔ آزاد کشمیر پولیس بھی مستعار لی گئی اور فرنٹیئر کانسٹیبلری کو بھی بلایا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ پس منظر تھا جب میاں نواز شریف نے فیصلہ کیا کہ وہ اس فساد کو بڑھانے کی بجائے پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ عوام سے کروانا پسند کریں گے۔ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کا سوچنے لگے کیونکہ جب وہ حکومت سے باہر تھے تو وہ عوامی موڈ دیکھ چکے تھے کہ لوگ کتنے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ دوبارہ جیت کر آ جائیں گے مگر وہ چاہتے تھے کہ اس صورت میں صدر غلام اسحاق خان بھی مستعفی ہوں تا کہ شرارت کی جڑ ختم ہو اور اس کے لئے انہوں نے جنرل وحید کاکڑ چیف آف آرمی سٹاف سے بات کی کہ وہ درمیان میں آ کر یہ سب کچھ کروائیں، کیونکہ اب بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ ملک میں امن قائم کرنے کے لئے کسی مقتدر ہی کو دخل انداز ہونا تھا۔ لہٰذا پھر جہاز دوڑے، بینظیر کو راولپنڈی لایا گیا اور فیصلہ ہوا کہ اگر نئے انتخابات کرا دیئے جائیں تو وہ اپنا لانگ مارچ ملتوی کر دیں گی۔ بے نظیر تو چاہتی یہی تھیں کیونکہ اس طرح ان کے دونوں دشمن باہر ہو جاتے۔ وہ

فوراً مان گئیں اور لانگ مارچ ملتوی کر دیا۔ اس کے بعد غلام اسحاق خان کے تمام کارڈ ختم ہو گئے۔ زعماء پاکستان کا ایک جرگہ غلام اسحاق خان کے پاس بھیجا گیا جس میں مولانا سمیع الحق بھی تھے۔ باتوں باتوں میں خود غلام اسحاق خان نے کہا کہ اگر نواز شریف استعفیٰ دیدیں تو وہ بھی مستعفی ہو جائیں گے۔ اب کیا تھا؟ نواز شریف تو پہلے ہی اس بات کا فیصلہ کر چکے تھے، لہٰذا نواز شریف کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ نواز شریف نے کہا بابا کے تو صرف اڑھائی مہینے باقی رہتے ہیں، انہیں استعفے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کیوں اپنے اڑھائی سال قربان کروں وغیرہ وغیرہ۔ اب جب غلام اسحاق خان اپنی بات پر اچھی طرح پکے ہو گئے تو یکدم نواز شریف نے بھی رضامندی کا اظہار کر دیا اور یوں وہ تاریخی فیصلہ ہوا جس کے مطابق صدر اور وزیر اعظم دونوں بیک وقت مستعفی ہو گئے۔ سینٹ کے چیئرمین حسب دستور صدر بنے اور بالکل غیر جانبدار وزیر اعظم اور صوبوں میں وزرائے اعلیٰ اور گورنروں کا تعین ہو گیا۔ جناب معین قریشی پر عبوری وزیر اعظم کے لئے متفقہ نگاہ ٹھہری جو ساری عمر آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک میں ملازمت کرتے رہے تھے اور بہت ہی مشہور معاشی ماہر مانے جاتے تھے۔ پنجاب کی حد تک ایک بہت ہی نیک نام ریٹائرڈ سول سرونٹ شیخ منظور الٰہی کو وزیر اعلیٰ نامزد کیا گیا اور جنرل اقبال کو گورنر پنجاب لگایا گیا۔ اس طرح نئے عام انتخابات کی تیاری شروع ہوئی۔ بہت عرصہ بعد میاں نواز شریف مکمل طور پر اقتدار سے باہر تھے اور ایک غیر جانبدار حکومت برسر اقتدار تھی۔ یوں یہ تاثر کہ نواز شریف ہمیشہ اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے اقتدار میں آئے، اس الیکشن میں ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر ایسا نہ ہوا اور ایک پروپیگنڈہ شروع ہو گیا کہ یہ سب بہانہ بازی اور شعبدہ بازی ہے اور بیوروکریسی اسی طرح نواز شریف کی پشت پر ہے۔ حالانکہ یہ بات حقائق سے بہت دور تھی۔ تبدیلی کا پیامبر نواز شریف تو ان کی آنکھ کا کانٹا تھا اور اسی لئے اسے نکالا گیا تھا۔ چونکہ جی ایچ کیو کا رول بہت ہی اہم ہو گیا تھا اور وہ اس پروپیگنڈہ سے بری طرح متاثر ہو رہے تھے، لہٰذا وہ کسی طرح بھی طرفداری کا تاثر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے دو انتہائی غیر ضروری کام کئے اور شاید یہی نواز شریف مخالف لابی کی خواہش تھی اور ہمارے مقتدرین اس فریب میں آ گئے۔

ایک کام تھا لوکل باڈیز کی تحلیل، حالانکہ سال بھر پہلے ان کے الیکشن ہوئے تھے۔ سمجھایا جا رہا تھا کہ یہ لوگ مسلم لیگ کے پٹھو ہیں اور اس کی سیاسی طاقت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں ختم کرنا ضروری ہے اور وہ ختم کر دیئے گئے اور ان کے فنڈز منجمد کر دیئے گئے۔ دوسرا کام سرکاری ملازموں کے تھوک کے حساب سے تبادلے تھے۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ یہ سب لوگ میاں نواز شریف کے پسندیدہ ہیں اور الیکشنوں میں مسلم لیگ کی مدد کریں گے۔ لہٰذا چھوٹے سے چھوٹے ملازموں تک کے تبادلے ان کے بال بچوں سے بہت زیادہ دور کر دیئے گئے، جس میں سپاہی اور سکول ماسٹر بھی شامل تھے اس سے سرکاری ملازموں میں بہت زیادہ بے چینی پھیلی اور طرح طرح کی باتیں نکلنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس طرح کے کاموں سے مسلم لیگ میں ایک غم و غصہ کی باقاعدہ لہر دوڑ گئی اور معین قریشی حکومت (بشمول جی ایچ کیو) اور مسلم لیگ کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس طرح ایک نیوٹرل حکومت مسلم لیگ مخالف حکومت بن گئی جس کا ظاہر ہے محترمہ بے نظیر بھٹو اور دوسرے نواز شریف مخالفین نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایک وقت ایسا آیا کہ مسلم لیگ اور معین قریشی حکومت ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اس کام کے لئے ہمارے مستقل کاریگر لوگوں نے خوب کام کیا اور پختہ فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف دوبارہ حکومت میں نہ آسکیں۔ یہی اسٹیبلشمنٹ کی خواہش تھی۔

ایک تو سیاسی دینی جماعتوں کو اکٹھا کر کے ایک تیسری قوت کے طور پر پیش کیا گیا اس کے لئے (ریٹائرڈ) جنرل حمید گل صاحب نے بہت کام کیا اور قاضی حسین احمد نے عوامی روپ دھارنے کے لئے گلی گلی کوچے کوچے جمالو پر رقص بھی کروائے تاکہ نواز شریف کے ساتھ جو دائیں بازو کا مذہبی ووٹ ہے وہ ان سے کٹ کر رہ جائے۔ انہیں ساتھ ملا کر ہی تو نواز شریف نے پچھلی دفعہ سیاسی معجزہ کیا تھا۔ اب کیوں نہ وہی نسخہ ان کے خلاف استعمال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف پنجاب کی حد تک اس اسلامی محاذ کی وجہ سے مسلم لیگ نے 19 سیٹیں براہ راست ہاریں اور بہت سی بلاواسطہ بھی۔

دوسرا کام ایم کیو ایم کو الیکشن سے باہر رکھنے کا تھا۔ لہٰذا کراچی وغیرہ میں ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ ایم

کیو ایم الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا اور اس نے کر دیا۔ مزے کی بات ہے کہ اسی ایم کیو ایم نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں بھرپور حصہ بھی لیا۔ اس طرح مسلم لیگ نے صاف طور پر جنرل وحید کاکڑ پر انگلیاں اٹھائیں، کیونکہ ایم کیو ایم مسلم لیگ کی حلیف جماعت تھی۔ لوگوں نے صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ سب کچھ نواز شریف کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لئے کیا جا رہا ہے اور بے نظیر کو واپس لانے کی تیاری ہے۔ وحید کاکڑ اور نواز شریف میں فاصلے تو بڑھنے ہی تھے اور وہ بڑھتے گئے۔ کیونکہ کھیل کچھ زیادہ ہی واضح نظر آنے لگا تھا، اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ الیکشن کے انتخابات GHQ کی کلیئرنس کے بغیر ریڈیو، ٹیلی ویژن پر اناؤنس نہیں ہو سکتے تھے۔ نتائج کی رات جب رزلٹ آنے لگے تو مسلم لیگ کی جیت واضح تھی اور ایک کے بعد دوسری سیٹ مسلم لیگ کو مل رہی تھی۔ طرح طرح کے اندازے ہو رہے تھے کہ یکم رزلٹ آنا بند ہو گئے۔ مجھے حاجی اکرم نے سعودی عرب سے فون پر پوچھا کہ سنا ہے میاں نواز شریف قومی اسمبلی کی 130 سیٹیں جیت رہے ہیں۔ میں نے کہا آثار تو یہی ہیں مگر یکدم رزلٹ آنا بند ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے جو اس وقت ریڈیو کے سربراہ تھے، پوچھا کہ رزلٹ کیوں نہیں آ رہے؟ تو کہتے ہیں کہ GHQ سے کلیئرنس نہیں آ رہی۔ اتنے میں ملتان سے صاحبزادہ فاروق علی خان کا ٹیلیفون آیا کہ فیصلہ ہو گیا ہے کم از کم بیس سیٹوں سے مسلم لیگ کو ضرور ہرانا ہے جہاں وہ جیت رہے تھے اور ان میں ان کے قریبی عزیز چودھری شجاعت حسین کی نشست بھی تھی۔ وہ کیسے؟ صاحبزادہ فاروق علی خان کے ایک اور قریبی عزیز GHQ میں الیکشن ڈیوٹی دے رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کے معروف صحافی الطاف حسن قریشی بھی میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے یہ سب کچھ انہیں بتایا تو کہنے لگے کہ "کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔" چلئے ماڈل ٹاؤن چلتے ہیں اور میاں نواز شریف سے پوچھتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے؟ مگر میاں نواز شریف تو آمدہ کامیابی کے نشے میں چور نظر آئے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور انہوں نے ہماری ایک بھی نہ سنی اور کھانے کا کہہ کر غائب ہو گئے۔ شاید اپنے والد صاحب کو سلام کرنے اندر چلے گئے اور ہم ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ دو گھنٹے بعد جب دوبارہ رزلٹ آنے شروع ہوئے تو صاحبزادہ فاروق علی کی باتیں سچ نظر آ رہی تھیں۔ بعد میں مسلم لیگ نے انہیں انجینئرڈ رزلٹس کہا مگر اب کیا

ہوتا، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ صوبائی الیکشن ہوئے تو بھی نتائج کچھ اسی قسم کے آئے مگر صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کو پیپلز پارٹی پر تھوڑی سی سبقت تھی پھر بھی میاں نواز شریف نے صوبہ میں آزاد ممبروں کو ساتھ ملا کر ایک کمزور حکومت بنانا پسند نہ کیا کیونکہ اس طرح ان کا اصلاحات اور ترقیاتی کاموں کو آگے بڑھانے والا خواب پورا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اقتدار تعمیر وطن کے لئے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ مرکز میں اقتدار کھو بیٹھتے تو صوبے کا اقتدار چہ معنی؟ یہاں سے بیٹھ کر وہ کیا کر سکتے تھے۔ ان کے تمام پراجیکٹ تو چوپٹ ہو جائیں گے۔ کیوں نہ حزب اختلاف میں بیٹھ کر معاملات کو بہتر کرنے کی کوشش کی جائے۔ بینظیر نے معمولی سی اکثریت سے مرکز میں حکومت بنالی، وہ اکثریت کے لئے دو سیر چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کی محتاج تھیں۔ وگرنہ بذات خود پیپلز پارٹی تمام اسٹیبلشمنٹ کے پاپڑ بیلنے کے باوجود حکومت نہیں بنا سکتی تھی مگر نواز شریف کے ساتھ ان کی اپنی مسلم لیگ اور اے این پی ملا کر ایک بہت ہی مضبوط اپوزیشن موجود تھی۔ ہم نے سوچا شاید یوں جمہوریت کی گاڑی آرام سے چل سکے گی مگر ایسا ہونا تھا، نہ ہوا اور معاملات ایک عجیب وغریب ڈگر پر چل پڑے۔ نواز شریف کے شروع کئے گئے منصوبے جہاں تھے وہیں رہے جن پر کام ہو رہا تھا وہ روک دیئے گئے اور کہا جانے لگا کہ ٹھیکیداروں سے کمیشن اور رشوت طلبی کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ یوں ترقی کی چلتی گاڑی نہ صرف رک گئی بلکہ الٹی چلنے لگی۔ آخر کار اولڈ گارڈ جیت گیا اور نیو آرڈر کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔ اب اسے مزید ڈملیا میٹ کرنا مقصود تھا تاکہ پھر وہ تبدیلی و ترقی اور تعمیر وطن کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔ بیوروکریسی اور جاگیرداری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راج کرتے رہے مگر ان نادانوں کو کیا پتہ کہ جدید اور قدیم میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ تاریخ کو آگے ہی چلنا ہوتا ہے، وہ دریا کے بہاؤ کی طرح کبھی واپس نہیں ہوتی۔ وقت کا بہاؤ بھی ازل سے آگے ہی چلتا آیا ہے چاہے ہزار رکاوٹیں کیوں نہ آئیں۔

انقلاب کا دور

میاں نواز شریف اب ان انجینئرڈ الیکشنوں کے بعد مکمل طور پر اقتدار سے باہر تھے۔ بہت عرصہ بعد وفاق ہی نہیں کسی صوبہ میں بھی ان کی حکومت نہیں تھی بلکہ بلدیات کا نظام جہاں مسلم لیگ چھائی ہوئی تھی اس سے بھی ویس نکالا مل چکا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر حزب اختلاف کے رول میں تھے۔ محترمہ بے نظیر بظاہر بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں اور بعض معاملات میں بہت جدید نقطہ نظر رکھتی دکھائی دیتی تھیں مگر یہ باتیں ان کی جلد کی سطح تک ہی محدود تھیں۔ اندر سے وہ ایک اصلی اور کھڑی جاگیردارنی تھیں جو معاملات کو ایک خاص نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اب وہ مکمل طور پر اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں تھیں کہ وہی اسے دوبارہ اقتدار میں لائی تھی۔ وہ اپنے سابقہ دور کی بدنامیاں اٹھائے پھرتی تھیں۔ امریکہ اور انگلستان کی تعلیم نے انہیں جدید اسلوب اور الفاظ سے ضرور مزین کر رکھا تھا مگر حکمرانی وہ اپنی اصلی جاگیرداری ضمیر اور بیوروکریٹ انجینئرنگ کے سہارے کرنے والی تھیں جس میں سازش اور ساز باز کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ میاں نواز شریف کے پیچھے ایک زبردست حزب اختلاف کھڑی تھی جو دراصل حزب اقتدار کے بھان متی کنبے سے کہیں زیادہ مربوط اور مضبوط تھی مگر اسے اب جاگیردارانہ عقوبتوں سے گزرنا تھا کیونکہ اختیار اولڈ آرڈر نے سنبھال لیا تھا اور اسے اس طرح استعمال کرنا تھا کہ نیو آرڈر دم توڑ جائے۔

اس کے باوجود اپنی سوچ کے مالک نواز شریف نے قومی اسمبلی میں اپنی پہلی ہی تقریر میں حزب اختلاف کی طرف سے قومی امور پر حزب اقتدار کو بھرپور تعاون کی پیشکش کر دی لیکن وہ پیشکش دوسری طرف سے نقش بر آب ثابت ہوئی۔

بینظیر نے اقتدار سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ میاں نواز شریف نے جو نئے پراجیکٹ شروع کروائے تھے وہ یکسر ختم کر دیئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ قوم کے لئے غیر مفید تھے، بلکہ اس لئے کہ وہ نواز شریف نے شروع کروائے تھے۔ ان منصوبوں پر کام تو خیر غلام اسحاق ہی نے بند کروا دیا تھا اب انہیں سرے سے ختم کرنے کا حکم ہو گیا، چاہئے وہ کام آخری مراحل میں ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان سے نہ صرف نواز شریف کی بو آتی تھی بلکہ بیورو کریٹک، جاگیردارانہ نظام کے تلپٹ ہونے کی امید بندھتی تھی یوں نہ صرف زبردست قومی ضیاع کا اہتمام ہوا بلکہ ترقی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم بھی روک دیئے گئے بلکہ الٹے گھما دیئے گئے۔

اسلام آباد شہر کے فیض آباد چوک پر ایک انٹرچینج زیر تعمیر تھا یہاں سے راولپنڈی، اسلام آباد، مری، مظفر آباد، لاہور، پشاور اور ملک کے کونے کونے تک پہنچنے کے لئے سڑکیں نکلتی تھیں اور ہر وقت ٹریفک کا بے پناہ رش رہتا تھا اسے جوں کا توں روک دیا گیا اور وہ ویسے ہی رکا رہا جب تک نواز شریف واپس اقتدار میں نہیں آ گئے حالانکہ اس کے بننے سے عوام کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوتا تھا۔

ایسی ہی صورت اسلام آباد کی شاہراہ کشمیر کی تھی جسے پشاور روڈ اور موٹر وے سے ملنا تھا مگر وہ چونکہ نواز شریف نے شروع کروائی تھی اس لئے جہاں تھی وہیں روک دی گئی۔

لاہور، اسلام آباد موٹر وے پر ستر فیصد کام نواز شریف کے پہلے دور میں مکمل ہو چکا تھا۔ بے نظیر نے آتے ہی اسے روک دیا حالانکہ اس پر کوریا کی ایک معروف بین الاقوامی فرم ڈائیو وکام کر رہی تھی اس پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔ کبھی کہا گیا کہ اس پراجیکٹ میں نواز شریف نے کمیشن کھایا ہے کبھی کہا گیا کہ یہ بہت مہنگا ہے حالانکہ اس کا تمام سرمایہ خود فرم نے لگانا تھا۔ اڑتیس سال کے اندر ٹول ٹیکس کے ذریعے اسے رقم ادا منافع واپس ملنا

تھا۔ جب فرم کو بہت تنگ کیا گیا تو اس نے کمیشن دینے کی بجائے کام ختم کر کے واپسی کا عندیہ دے دیا اس پر کہا گیا کہ چھ لین کی بجائے اسے چار لین کر دیا جائے۔ یعنی موٹروے کا تمام تر تصور ختم کر کے اسے ایک عام سی ہائی وے بنا دیا جائے تا کہ پاکستان کی سرزمین پر کوئی نئی ماڈرن سڑک نظر نہ آئے جو عوام کو خواہ مخواہ نئے تصورات کا اسیر کر کے جاگیرداروں کا جگر چیرنے کی طرف لے جائے۔ اب اس موٹروے کو تکمیل کے لئے نواز شریف کی واپسی ہی کا انتظار کرنا تھا۔

اسلام آباد، پشاور موٹروے پر ایک ترک فرم کام کر رہی تھی اسے بھی روک دیا گیا حالانکہ ترکی اور پاکستان کے بہت ہی قریبی دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں۔ ان تاریخی اور اسلامی تعلقات کا بھی خیال نہ رکھا گیا۔ ترکی حکومت نے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ اس کام کے لئے ترکی کے صدر بذات خود پاکستان تشریف لائے مگر اولڈ آرڈر کو ایسی باتوں سے کیا غرض، اسے تو اپنا حلوہ مانڈہ چاہئے اور اس کا تقاضا نہایت ڈھٹائی سے ہوتا رہا، اسی لئے تو آصف علی زرداری کو عوام ٹین پرسنٹ کی جگہ ہنڈرڈ پرسنٹ کہنے لگے تھے۔

پشاور، نوڈیرو، گوادر موٹروے کو تو سرے سے ہی ختم کر دیا گیا کہ اس کی وجہ سے جدید روشنی اور روایت بے نظیر کے اپنے گاؤں نوڈیرو کو نہ چھو لے اور اس کے ہاری بلکہ غلام نئی دنیا سے روشناس نہ ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اس تمام تر قضیہ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے گوادر کی بندرگاہ مسقط، عمان کے امیر کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ نواز شریف تو اسے وسط ایشیا کی منڈیوں کے لئے ایک متبادل بندرگاہ بنا کر پاکستان کو خوشحال بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے ادھر موٹروے بنا کر اسے تاشقند تک جوڑنا چاہتے تھے مگر بے نظیر نے اسے بیچ دینا بہتر سمجھا۔ وہاں مچھلی کی ایکسپورٹ سے جو قیمتی زرمبادلہ ملتا تھا اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ وہ تو شکر ہے کہ اس بات پر ہمارے قومی پریس نے شور مچا دیا ورنہ مادر وطن کا سودا ہو چکا تھا۔

ریلوے کی جدیدیت، بلٹ ٹرین کا آغاز اور واٹر ویز تو بہت دور کی بات، انہوں نے تو مواصلات کی جدیدیت بھی روک دی۔ کوریا کی ایک فرم جو پاکستان کے اندر ایک بہت بڑا ڈیجیٹل پراجیکٹ لگا رہی تھی اس کے

ساتھ سودے بازی کے لئے زرداری صاحب وہاں پہنچ گئے اور انہیں اپنے نرخ بڑھانے کی ترغیب دی تا کہ بڑھے ہوئے فائدے کو ان کے ساتھ تقسیم کرلیا جائے۔ مواصلات کے ڈائریکٹر جنرل چودھری مسعود ایک نہایت ہی دیندار اور نیک انسان تھے انہوں نے اس سودے بازی کا حصہ دار بننے سے انکار کر دیا تو انہیں بیرون ملک سیول ہی میں ٹرانسفر آرڈر مل گئے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔

اسی طرح سے دوسرے شعبوں میں بھی بے نظیر حکومت نے وہ تمام کام جو نواز شریف نے شروع کئے تھے ختم کروا دیئے۔ گرین چینل ختم کر دیا اور کسٹمز کا بہت سا کام بیرون ملک فرموں کو بھاری رشوت کے عوض دیکر بیرون ملک زرمبادلہ کمانے والے پاکستانی سپوتوں کے لئے ایک دفعہ پھر مصیبت بنا دیا۔ انکم ٹیکس کی خود تشخیصی سکیم ختم کر کے بیوروکریسی کے لئے رشوت کے دروازے کھول دیئے اور کاروباری لوگوں کی زندگی ایک دفعہ پھر اجیرن کر دی۔

اسی طرح نج کاری کی رفتار سست کرالی گئی اور صرف وہی کام ہوا جہاں سے پیسے بن سکتے تھے جو کارخانے، بینک یا ادارے پہلے نجی ہاتھوں میں جا چکے تھے، ان کے مالکان کو بھی طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ کسٹمز، انکم ٹیکس اور ایف آئی اے کے کارندے ان کے پیچھے ہوتے اور وہ لوگ بھاگ رہے ہوتے، جب سودا ہو جاتا تو پھر سب کام صحیح ہو جاتا۔ بہت سے کاروباری لوگ تو ملک سے باہر بھاگ گئے۔ تاجروں کو خاص طور پر اس لئے ٹارگٹ بنایا جا رہا تھا کہ ان کا تعلق زمینداروں کی بجائے نواز شریف کی کلاس سے تھا۔ ان حماقتوں سے کاروبار پر تو برا اثر پڑنا ہی تھا چنانچہ بہت سے کاروبار ٹھپ ہو گئے۔ بیرون ملک پاکستانیوں کو تنگ کیا گیا تو باہر سے زرمبادلہ آنا بند ہو گیا جو زرمبادلہ پہلے بینکوں کے ذریعے پاکستان آتا تھا اب وہ بیوروکریسی کی اس تنگ نظری اور بے ایمانی سے ایک دفعہ پھر ہنڈی کے ذریعے آنے لگا۔ اس طرح سرکاری خزانے میں زرمبادلہ کی کمی ہو گئی، لوگوں کا جمع شدہ زر مبادلہ جو نواز شریف کی پالیسیوں کی وجہ سے پاکستانی بینکوں اور سٹیٹ بنک میں آیا تھا نہایت بے ایمانی اور بے دردی سے تجارت کا خسارہ پورا کرنے کی مد میں لگانا شروع کر دیا تا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کو مزید قرض کے

لئے مطمئن کیا جا سکے۔ شاید اس دور کا یہ سب سے بڑا سرکاری ڈاکہ تھا۔ اس کا راز اس وقت کھلا جب پاکستان کو نواز شریف کے دوسرے دور میں ایٹم بم کا دھماکہ کرنے کے بعد خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے شہریوں کے فارن کرنسی اکاؤنٹس کو فریز کرنا پڑا۔ وہ تفصیل ذرا بعد میں آئے گی۔ بہر صورت بے نظیر نے نواز شریف اور نیو آرڈر کی ضد میں ملک کی معیشت اور معاشرت دونوں کا بیڑا غرق کرنا شروع کر دیا۔

معیشت کی مزید بربادی کے لئے مسئلہ کشمیر پر دوغلی پالیسی اختیار کر لی گئی۔ اندرون ملک کشمیر پر ایک سخت بھارت مخالف موقف اختیار کیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کو بے انتہا اعلیٰ پروٹوکول کے ساتھ کشمیر کمیٹی کا سربراہ بنا دیا تاکہ یہاں کی سیاست اور جی ایچ کیو سمجھیں کہ کشمیر پر بہت کام ہو رہا ہے مگر بیرون ملک تمام فورمز پر کشمیر کے کیس کو اپنے دفتر خارجہ کے ذریعے کمزور سے کمزور تر کر دیا گیا کہ امریکہ وغیرہ ناراض نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اسلامی کانفرنس اور جینوا میں انسانی حقوق کے فورمز پر بھی پاکستان کو ہزیمت اٹھانا پڑی اور دفتر خارجہ کے ذریعے آخری لمحات میں کشمیر پر قراردادوں کو واپس اٹھا لیا گیا۔ بہانہ بنایا کہ ہمارا دوست چین بھی ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ افغانستان اور کشمیر کے حوالہ سے ہمارے بنیاد پرستوں نے پاکستان کو تقریباً دہشت گرد ملک بنا ڈالا ہے۔ محترمہ خود لبرل اسلام کی چیمپئن بن کر انتہا پسندی کے خلاف اپنے آپ کو سد سکندری ظاہر کرنے لگیں اور وہ اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف آخری دیوار ہیں۔ یہ سب دیکھ کر نوابزادہ نصر اللہ سٹپٹا تو ضرور جاتے مگر اپنی اولاد کے ہاتھوں مجبور بے نظیر حکومت چھوڑ نہیں رہے تھے۔ کشمیر پر بے نظیر کی دوغلی پالیسی بھی نواز ضد پر اپنائی گئی تھی کیونکہ نواز شریف نے اپنے دور حکومت میں کشمیر پر ایک حقیقت پسندانہ پالیسی اپنا کر بھارتی وزیر اعظم نرسیما راؤ کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کشمیر کا پرامن حل نکالتے ہوئے دونوں ملکوں کو غربت کے بدچکر سے بچائیں۔ پاکستان کی معاشی و معاشرتی ترقی نواز شریف کا لائف ڈریم تھا جسے پورا کرنا کشمیر کا مسئلہ حل کئے بغیر ممکن نہیں تھا۔ یہ بھارت کے لئے بھی ضروری تھا مگر وہ مانتا نہیں تھا اور جواہر لعل نہرو کی غلطی اور ضد پر اڑا ہوا تھا۔ نواز شریف نے کمال حکمت سے نرسیما راؤ کو اس ذہنیت سے باہر نکالا اور وہ کشمیر پر گفت و شنید کے لئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اولڈ

آرڈر کی دقیانوس قوتوں نے نواز شریف کو چلتا کیا اور یوں بے نظیر نے دوغلی اور پرفریب پالیسی اپنا کر ترقی کا پہیہ الٹا دیا، ضد کے ہیں رنگ ہزار۔

بے نظیر نے اپنی حرص زر کے لئے بجلی کی پیداوار میں ایک بہت ہی مضر رساں پالیسی اختیار کی۔ کئی انٹرنیشنل فرموں کو پاکستان میں تیل سے بجلی پیدا کرنے کے لئے آواز دی حالانکہ ہمارے ہاں تھرمل کی جگہ پانی سے سستی بجلی پیدا کرنے کے بہت ہی زیادہ قدرتی مواقع موجود تھے مگر اس میں ان کے لئے کمیشن بہت کم تھا۔ سرحد کی اپنی حکومت نے بھی ہائیڈرو پاور کے لئے اصرار کیا مگر بے نظیر نہ مانیں۔ آزاد پاور کمپنیوں سے تھرمل بجلی پیدا کرنے کے بھاری کمیشنوں پر سودے کر لئے۔ اپنی ذاتی منفعت کی خاطر بہت ہی زیادہ مہنگے سودے کر کے انہیں ریاستی گارنٹیاں دے دیں حالانکہ انہی کمپنیوں نے بعض دوسرے ممالک میں ان نرخوں سے تین تین گنا کم نرخوں پر بجلی پیدا کرنے کے سودے کئے تھے۔ بے نظیر نے یہ مہنگے سودے کر ڈالے اور واپڈا کو ان سے مہنگی بجلی خریدنے کا پابند بھی کر دیا گیا۔ اگر کسی واپڈا ملازم، ممبر، چیئرمین نے ذرا بھر رکاوٹ ڈالی تو اسے ایک منٹ میں باہر نکال دیا گیا۔ ہمارے اخباروں نے بہت شور مچایا۔ ڈاکٹر مبشر حسن اور ڈاکٹر نسیم حسن شاہ جیسے لوگوں نے باقاعدہ اعداد و شمار کے ساتھ مضامین لکھے مگر مجال ہے بے نظیر، زرداری جوڑے پر ذرا اثر ہوا ہو۔ یہاں تک کہ واپڈا کی لیبر نے بھی اتنے بڑے ظلم پر شور مچا دیا اور کوٹ ادو پاور پلانٹ کی نہایت ہی سستی اور بے رحمانہ نج کاری پر جانیں قربان کرنے پر تل گئے کہ ان کی حب الوطنی اس طرح کے قومی ضیاع کی اجازت نہیں دے رہی تھی مگر جن کی آنکھوں پر حرص کی پٹی چڑھی ہو انہیں کب کچھ دکھائی دیتا ہے اور ہمارے ملک کی سفید اور خاکی بیوروکریسی خاموش دیکھتی رہی جس سے ملک کا نقصان ہو گیا۔ ملک میں بجلی مہنگی ہونے کا مطلب تھا ملک کی ہر چیز مہنگی ہو۔ جس ملک میں چیزوں کی پیداوار اتنی مہنگی ہو جائے وہ دوسرے ممالک کی برآمدات کا مقابلہ کب کر سکتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری برآمدات سکڑ کر رہ گئیں اور درآمدات کا بل بڑھ گیا جسے پورا کرنے کے لئے عوام کے جمع شدہ زرمبادلہ کا بے دریغ استعمال شروع ہوا۔ اس وقت زبان خلق پر یہ بات عام تھی کہ یہ شاہی جوڑا جو خاکی اور سفید بیوروکریٹس کی ملی بھگت سے

برسر اقتدار آیا ہے اسے اب پاکستان کے بچنے کی امید نہیں اور وہ آخری دو دفعہ لوٹ کھسوٹ کر کے ملک سے فرار ہو جائے گا۔ ہر بات پر روپیہ پیسہ جمع ہو رہا تھا۔ جدھر دیکھیں رشوت کا بازار گرم تھا مگر مجال ہے کوئی بول سکے۔ بے نظیر کا اپنا صدر تھا اور اپنی صوبائی حکومتیں۔

ہم زار بیوروکریسی اور جاگیرداری باریوں سے زمین چھن چکی تھیں۔ جرم عام تھا اور فرقہ واریت زوروں پر تھی مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی تھی۔ منظور وٹو نے اپنی چھوٹی سی "مسلم لیگی" ٹولی کے ساتھ پی پی کو اپنے وزیر اعلیٰ پنجاب بنے رہنے پر مجبور کر رکھا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب میں شاید حکومت ہی نہیں تھی۔ حکومت اس کی تھی جس کا بازو مضبوط تھا اور لوگ مذاق سے کہہ رہے تھے اب سکھوں کی نسلیں پھر واپس آ گئی ہیں۔ یہ بات اور بھی زیادہ قرین حقیقت بن گئی جب عارف نکئی یہاں کے وزیر اعلیٰ بنے کہ ان کے پردادا باقاعدہ سکھ تھے اور سکھ نسل کے سردار تھے۔

اس طرح ملک وملت کو اور بھی بہت سے شعبوں میں بدنظمی کا سامنا تھا اور لوگ کراہ رہے تھے مگر سب سے زیادہ ظلم نواز شریف فیملی پر ہو رہا تھا۔ انہیں ہر قسم کے سٹم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا تاکہ پھر وہ دوبارہ اٹھ نہ سکیں اور تبدیلی وترقی کے شجر ممنوعہ کو ہاتھ نہ لگا سکیں۔ اس دفعہ انہیں مکمل طور پر کمرشل کر دینے کا پروگرام تھا لہٰذا ان کے کاروبار کو جتنا بھی سرمایہ درکار تھا وہ نہایت ڈھٹائی سے روک دیا گیا۔ یہاں تک کہ پرائیویٹ بینکوں پر بھی اتنا زیادہ دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بھی مجبور کر دیئے گئے کہ اتفاق برادرز کو ایک پیسے تک کا ادھار نہ دیں۔ کئی بینکوں نے تو اپنے کاروبار بند کر دیئے مگر حکمرانوں کو اس سے کیا۔ انہیں تو انقلابی نواز شریف کی بیخ کنی کرنا مقصود تھی تاکہ وہ ان کی جاگیرداریوں کا انداز زندگی نہ بدل سکتے۔ نواز شریف کے اندر اتنی سکت باقی نہ رہے کہ وہ واپس سیاست کا سوچ بھی سکے۔ اب یہ آخری جنگ تھی جس کا پہلا محاذ اتفاق فیملی کی معاشی تباہی تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خود اتفاق فیملی میں نفاق پیدا ہو گیا بلکہ وہ اتفاق سے نفاق فیملی بن گئی۔ ان کے تمام کاروبار ٹھپ ہو گئے۔ وسیع کاروبار میں اگر سرمایہ کاری رک بھی جائے تو خرچے چلتے ہی رہتے ہیں۔ آپ فوراً سامان بیچ نہیں سکتے اور ملازمین کو فارغ نہیں کر سکتے۔ فیکٹری کی تالہ

بندی نہیں کر سکتے۔ یوں آپ پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر کاروباری لوگ بیوروکریسی کی چالوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور بہت جلد گھٹنوں کے بل آ گرتے ہیں۔ بے نظیر کا اس دفعہ بھی یہی ارادہ تھا کہ نواز شریف کی فیملی سرنڈر کر دے۔ اب تو ان کے پاس پنجاب کی حکومت بھی نہیں تھی۔ اب وہ ان ہتھکنڈوں کے سامنے کہاں ٹھہر سکیں گے۔ پھر کسٹمز، انکم ٹیکس، ریلوے، ٹیلیفون، واپڈا اور ایف آئی اے کے چکروں سے کہاں نکل سکیں گے۔ یہ تمام محکمے قیامت بن کر اتفاق فیملی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کے تمام کارخانے بند ہو گئے۔ بینکوں کے ڈیفالٹر بنا دیئے گئے۔ وہ اتفاق فیملی جو کبھی ڈیفالٹر نہیں ہوئی تھی۔ جس نے کبھی اپنے قرضے معاف نہیں کروائے تھے اور جس کے ذمہ داران اپنے تمام ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتے تھے وہ اب رحمان ملک جیسے ظالم ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے کے رحم و کرم پر تھی اور اتفاق فیملی پر اس کی خواتین اور بچوں تک پر سینکڑوں جھوٹے فوجداری مقدمات بنا ڈالے گئے۔ شہباز شریف کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور لندن میں جا کر پناہ لی۔ شہباز کے نابالغ بیٹے حمزہ شہباز کو جیل بند کر دیا گیا۔ یہاں تک میاں نواز شریف کے 80 سالہ باپ میاں محمد شریف جن کی تمام دنیا خاص طور پر کاروباری دنیا دیانت و امانت کی وجہ سے بے انتہا عزت کرتی تھی، کو نہایت بے دردی کے ساتھ جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ دل کے مریض تھے، انہیں جیل میں دل کا دورہ پڑا۔

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا
خیر گزری کہ تو خدا نہ ہوا

نتیجتاً پاکستان میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور ایسا نظر آتا تھا کہ لوگوں کے اندر غصے کا ایک آتش فشاں ہے جو پھٹ پڑے گا۔ اس پر بے نظیر حکومت کو جان کے لالے پڑ گئے اور پھر منتیں کر کے میاں شریف کو چھوڑا۔ یہی نہیں جب اتفاق والوں نے حمزہ شہباز کی ضمانت تک کی درخواست بھی نہ کی تو خود ایک جعلی درخواست پر اس کی ضمانت کرنا پڑی مگر میاں نواز شریف نے اپنی فیملی خاص طور پر والد کی گرفتاری پر لوگوں کو ہر طرح کے احتجاج بلکہ بیانات تک دینے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم اسے سیاسی مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ میں اپنی

پارٹی کے ورکروں، نوجوانوں اور خواتین کو اپنے فیملی مسئلہ کے لئے آگے نہیں لگاؤں گا نہ ہی انہیں لاٹھیاں کھانے اور ٹھوکریں سہنے کو کہوں گا۔ میں نے بہت کم لوگوں کو اپنی ذات سے سیاست کو یہاں علیحدہ کرتے دیکھا ہے۔ بہت سے لوگ تو سیاست کرتے ہی اپنی ذات کے لئے ہیں بلا کہ بہت سے چالاک لوگ تو حزب اختلاف میں بھی اپنے جرائم اور مفادات کی پردہ پوشی کے لئے رہتے ہیں تاکہ جب بھی ان پر ہاتھ پڑے تو وہ بہانہ بنا سکیں کہ ان پر سیاسی وجہ سے ظلم ہو رہا ہے اور وہ عدالت کی رحم دلی اور انصاف پسند کا فائدہ اٹھا سکیں مگر یہاں ایک نواز شریف ہے جو اپنے والد کی گرفتاری پر ہزاروں لاکھوں ورکروں کو احتجاج سے منع کر رہا ہے اس باپ کی گرفتاری پر، جس کا وہ خدا کی ذات کے بعد سب سے زیادہ احترام کرتا ہے اور اس پر اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتا ہے سیاست اور ذات کو پھر بھی الگ الگ رکھنے کا نواز شریف میں حوصلہ ہے۔

ظالم حکومت وقت کو بیماری کی وجہ سے میاں شریف کو چھوڑنا پڑا۔ میاں شریف بیمار تھے اس لئے میں ان کی مزاج پرسی اور گرفتاری کے اندوہناک واقعہ پر افسوس کرنے ان کے گھر گیا۔ اس وقت تک میاں نواز شریف کی مجھ سے ناراضی تھی اور آج پہلی دفعہ میں ان کے گھر گیا تھا۔ دیکھا تو وہ بہت زیادہ ملال میں تھے۔ میں نے میاں نواز شریف کو اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے والد کی گرفتاری اور بیماری پر بہت زیادہ دل گرفتہ تھے۔ بہت لوگ ان سے ملنے آ رہے تھے۔ میں بھی ان سے ملا، وہ بہت تپاک سے ملے، میں سارا دن ان کے ساتھ بیٹھا رہا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ہلاتے اور بار بار یہی سوال دہراتے کہ ''انہوں نے ابا جی کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ چودھری صاحب پولیس والوں نے ابا جی کے ساتھ ایسی بدتمیزی کیوں کی؟'' میں کیا جواب دیتا، لگتا تھا کہ مجھ سے زیادہ وہ خود اپنے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ میری آواز بند تھی اور وہ خود کلامی کے انداز میں بار بار سوال کو دہرا رہے تھے۔ مجھے نے محسوس کیا کہ وہ اپنے والد کی بے عزتی پر بہت دکھی تھے۔ پتہ نہیں ان کے ذہن میں کیا کیا سوال ابھر رہے تھے۔ شاید وہ اس وقت سوچ رہے ہوں کہ ان کے والد کی بلاوجہ بے عزتی ان کی سیاست کی وجہ سے ہوئی ہے یا شاید وہ مجھ سے ایک پولیس آفیسر کے ناطے یہ سوال کر رہے ہوں۔ بہر صورت

اس وقت مجھے بہت ذہنی اور دلی تکلیف ہوئی۔

میاں نواز شریف اسی پریشانی اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگے "چودھری صاحب! میجر اکرم ڈائریکٹر ایف آئی اے لاہور اور حاجی حبیب الرحمٰن ایس ایس پی لاہور نے اباجی کے ساتھ بدتمیزی کی انتہا کر دی یہ افسر عوام کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہونگے، اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ ہم جب بھی اقتدار میں آئینگے تو انہیں نوکری سے نکال دینگے۔" انہوں نے یہی بات کچھ دیر بعد دوبارہ کہی تو میں پھر خاموش رہا مگر ساتھ بیٹھے صحافی سید انور قدوائی نے کہا! "نہیں میاں صاحب آپ ان باتوں میں آنے والے نہیں ہیں، آپ کیوں ایسا سوچ رہے ہیں۔ آپ نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔ آپ کا مقام بہت بڑا ہے، آپ تو اس نبیؐ کو ماننے والے ہیں جس نے فتح مکہ پر سب ہی کو معاف کر دیا تھا۔"

یہ سنتے ہی میاں صاحب خاموش ہو گئے اور پھر اپنے کانوں کو توبہ کی صورت میں ہاتھ لگا کر کہا "اچھا چودھری صاحب یاد رکھنا ہم انہیں او ایس ڈی ضرور بنائیں گے، انہیں بالکل معاف کرنا بھی بری بات ہے۔"

ان کے اس کرب کے لمحہ میں میں نے جب یہ بات سنی تو یقین کیجئے میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے سوچا کہ کتنا بڑا انسان ہے۔ میں بلاوجہ کسی کی مدافعت نہیں کر رہا تھا مگر قدوائی صاحب نے ان کی شخصیت کے نرم ترین گوشے کو چھیڑ دیا تھا۔ ہم نے حاکم قسم کے لوگوں میں خدا خوفی کم ہی دیکھی ہے۔ جاگیردار حاکم تو مخالفوں کو مروانے سے کم کسی بات پر راضی ہی نہیں ہوتے۔

سیاسی جدوجہد

بے نظیر دور میں صرف اتفاق فیملی ہی انتقام کا ٹارگٹ نہیں تھی، پاکستان مسلم لیگ کے چیدہ چیدہ لیڈر اور ورکر بھی تختہ مشق بن رہے تھے۔ کراچی سے لے کر پشاور تک جیلیں ان مظلومین سے بھری پڑی تھیں اور وہی جاگیردارانہ رویے، جن میں پولیس کے ساتھ مل کر مخالفوں کے خلاف جھوٹے فوجداری مقدمات بنانا صف اول کی حکمت عملی ہوتی ہے اور جسے نواز شریف کی شرافت کی سیاست نے تقریباً ختم کر دیا تھا، ایک دفعہ پھر عروج پر تھے۔ شیخ رشید احمد، جو راولپنڈی سے قومی اسمبلی کے لیگی ممبر تھے اور وفاقی وزیر رہے تھے، چونکہ سیاست میں بہت فعال تھے، اس لئے انہیں راستے سے ہٹانے کے لئے ان پر ناجائز کلاشنکوف رکھنے کا مقدمہ بنا دیا گیا، جو ان کی عدم موجودگی میں ان کے سیاسی دفتر سے برآمد ہوئی ظاہر کی گئی، جہاں ہر روز سینکڑوں لوگ آتے جاتے تھے۔ اس کے لئے حکومت کو کوئی کام کا گواہ تک نہ مل سکا، مگر احمد صادق پرنسپل سیکرٹری ٹو وزیر اعظم، جو کسی زمانے میں راولپنڈی کے

ڈپٹی کمشنر رہے تھے، وزیراعظم کے حکم پر ہر وقت مقامی پولیس کے اعصاب پر سوار رہتے تاکہ یہ مقدمہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ پولیس نے اس جھوٹے مقدمے کا چالان ایک خصوصی عدالت میں باقاعدہ پیش کیا۔ متعلقہ پولیس اہلکار میرے ماتحت رہے تھے۔ پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ "یہ کیس سراسر جھوٹا ہے۔" اسوقت میں "افسر بیکار" تھا اور کہیں بھی میری تعیناتی نہیں تھی۔ حکومت وقت نے سپیشل کورٹ کا جج بھی ایسا لگایا، جو اس کے زیر اثر تھا۔ اس نے شیخ رشید کو سات سال قید بامشقت "مرحمت" فرمادی اور پھر خود حکومت کی مدد سے امریکہ ہجرت کر گیا۔ اس طرح کے جھوٹے کیس اب ایک دفعہ پھر روٹین بن گئے۔ اس قبیح روایت کو نواز شریف نے اپنے دور میں یکسر ختم کر دیا..... یہ ایک کیس تو میں نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس طرح کے مقدمات سینکڑوں، ہزاروں کے حساب سے پورے پاکستان میں پاکستان مسلم لیگ کے لوگوں کے خلاف دھڑا دھڑ بن رہے تھے اور جیلیں بھری جا رہی تھیں۔ یہ تھا فرق اولڈ جاگیرداری آرڈر اور نیو آرڈر میں۔ مگر جب سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے فرزند اعجاز الحق پر ایک بہت بڑے جلسے میں ایک کلاشنکوف لہرانے پر مقدمہ بنا تو اسی راولپنڈی شہر کی پولیس نے منتیں کر کے تیسرے دن انہیں رہا کر دیا اور مزے کی بات ہے کہ اعجاز الحق زندان سے نکلنے پر انکاری تھے۔ انتظامیہ گھر جانے کے لئے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ اسے کہتے ہیں طاقت کا نشکارہ، کیونکہ قوت کے اصل سرچشمے سے انہیں فوراً رہا کرنے کا کہا جا رہا تھا، لہٰذا انہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ بعض لوگوں نے شہباز شریف سے ایک رابطے میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں تو ہم مارشل لاء لگا کر اس کرپشن کے چکر اور آپ کی مصیبت کو ختم کر دیتے ہیں مگر میاں شہباز شریف نے فوراً بلا تامل کہا کہ نہیں ہم ایسے ہتھکنڈوں پر یقین نہیں رکھتے۔ مارشل لاء سے پہلے ہی پاکستان کو اتنا نقصان پہنچ چکا ہے کہ دولخت ہو چکا ہے، ہم اپنی خاطر یہ نہیں چاہیں گے کہ ملک کو مزید نقصان پہنچے۔ ہم اپنی مصیبت کے دن صبر سے کاٹ لیں گے۔ ہم لوگوں کے پاس جائیں گے وہی ہمارا فورم اور مداوا ہیں۔ ہم کسی شارٹ کٹ کو نہیں اپنائیں گے۔

یہ وہ دن تھے جب بے نظیر کیکہنے پر میاں منظور وٹو نے میاں نواز شریف کی لاہور میں ذاتی رہائش گاہ پر

حفاظتی باڑیں اور جنگلے تک اکھڑوا دیئے تھے۔ گھر کا پانی اور بجلی تک بند کر دیگئی تھی، مگر ملک کے قائد حزب اختلاف نے یہ سب کچھ نہایت صبر سے برداشت کیا اور اپنے ورکروں سے کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اس ایشو پر بالکل احتجاج نہیں کریں گے۔ اس وقت میں بھی میاں صاحب سے ملنے گیا تا کہ حکومت یک اس حرکت پر افسوس کا اظہار کروں۔ جنرل غلام جیلانی مرحوم بھی وہاں تشریف فرما تھے اور میاں صاحب کے کم از کم پانچ سو سیاسی ساتھی اور کارکن بھی نہایت غم وغصہ میں بھرے بیٹھے تھے۔ سب نے کہا کہ میاں صاحب حکم دیں ہم باہر نکلتے ہیں مگر سب کو وہ سختی سے منع کرتے رہے۔ اس وقت میں نے کئی آوازیں سنیں جو کہہ رہی تھیں کہ میاں صاحب اتنی زیادہ شرافت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اب تو ان لوگوں نے آپ کے گھر کی دیواریں گرا کر گھر کے اندر سے راستہ بھی بنالیا ہے مگر وہ مرد صابر چپ رہا اور طیش میں نہ آیا۔ میں نے ذاتی معاملات میں میاں نواز شریف کو کمال صابر دیکھا ہے۔ وہی نواز شریف جو قومی معاملات اور قومی اصلاح کے کاموں میں نہایت ہی جذباتی اور پر جوش نظر آتا ہے، عجیب مرد قلندر ہے۔ اپنے پیارے والد کی گرفتاری پر بھی اس کا یہی رد عمل تھا اور اب بھی۔

ہم لوگ ہیں تہذیب وشرافت کے گناہ گار
ارشاد ہو کس جرم کا اقرار کیا جائے

اس بات نے وہاں موجود لوگوں پر بہت اچھا اثر چھوڑا۔ چند خواتین تو رونے لگ گئیں اور چند ایک نے اسے بزدلی بھی گردانا، حالانکہ یہ بات نہیں تھی، یہ بزدلی نہیں بردباری تھی۔ اسی دورانئے میں مہران بنک کا سکینڈل طشت از بام ہوا جس میں یونس حبیب ایم ڈی مہران بنک نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ آفتاب شیر پاؤ اور چند دوسرے پی پی کے کارپردازوں کو کروڑوں روپیہ رشوت دی تھی۔ صدر مملکت فاروق لغاری کو کروڑوں کا فائدہ پہنچایا تھا۔ اسی بنک کے ایک ملازم اصغر قدوائی نے اس کے دستاویزی ثبوت مسلم لیگ کو پہنچا دیئے بلکہ متعلقہ حضرات کے ساتھ فون پر گفتگو کی کیسٹیں جن میں اس رشوت کا کھلا لین دین ہو رہا تھا، بھی دے دیں۔ مسلم لیگ نے قومی پریس کو اکٹھا کر کے وہ سب کو سنا دیں اور قومی اخبارات میں یہ سب کچھ باقاعدہ چھپ گیا۔ مگر مافیا کے اپنے ہتھکنڈے ہوتے

ہیں، اس جاگیردارانہ مافیا نے ایک کمیشن بنا کر یونس حبیب کو قربانی کا بکرا بنا دیا، اسے باقاعدہ جیل کی سزا کروا دی۔ یعنی رشوت دینے والا جیل کے اندر اور رشوت لینے والے اقتدار کی کرسیوں پر براجمان تھے۔ اسے کہتے ہیں جاگیرداری انصاف، مگر اب عوامی سطح پر بے نظیر کا امیج بہت خراب ہو رہا تھا۔

اسی طرح رشوت، کمیشنوں اور بدعنوانی کے بہت زیادہ سکینڈل منظر عام پر آنے لگے اور لوگ بے نظیر کے سخت خلاف ہونا شروع ہو گئے۔ پاکستان مسلم لیگ نے پارلیمینٹ کے اندر اور باہر گلی کوچوں میں بھی اس بات کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھایا۔ وہ پریس کانفرنس پر پریس کانفرنس کرتے تاکہ حکومت وقت کی بدنظمی اور بدعنوانی کو ننگا کرتے رہیں۔ لوگ اب بہت تنگ ہو رہے تھے اور ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ نواز شریف قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مقصد تھا کہ اب احتجاج کیا جائے مگر میاں نواز شریف اپنی شائستگی کے خول سے ابھی تک باہر نہیں نکل رہے تھے۔ وہ جلوس نکال کر گلی کوچوں میں فساد برپا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو جلسوں تک محدود رکھا کیونکہ وہ توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کے کلچر کے سخت خلاف تھے، مگر اب وہ جہاں بھی جاتے ایک خودرو جلوس بن جاتا جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑے سے بڑا ہو جاتا۔ ٹریفک رک جاتی اور بھیڑ سے دم گھٹتا۔ جلوس میلوں لمبے ہو رہے تھے اور عوام والہانہ شریک ہو کر نواز شریف کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرتے رہتے۔ نواز شریف آواز خلق بن گئے تھے۔ جیسے، جیسے وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو رہے تھے، نجی طور پر بے نظیر کے معاشی شکنجے میں آ کر کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے تھے۔ اتفاق فیملی کے تمام کارخانے بند تھے اور میاں شریف اپنی آدھی صدی کی کمائی کی ساکھ پر دوستوں سے ادھار لے کر اپنا اتنا بڑا سلسلہ چلا رہا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اندر سے ان کا کیا حال ہے مگر ظاہر میں وہ مضبوط کھڑے تھے۔ اسی دوران چالاک بے نظیر نے لندن میں بیٹھے شہباز شریف سے کسی ثالث کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور اس شرط پر تعاون کی پیشکش کی کہ اگر وہ لوگ ان کی مخالفت مدھم کر دیں تو وہ ان کے ذاتی اور معاشی معاملات میں مزید سختی نہیں کریں گی۔ شہباز شریف نے اس ثالث کو کہیں کہہ دیا کہ وہ سوچ کر اس کا جواب دینگے۔ انہوں نے یہ بات اپنے والد صاحب سے کی۔ میاں محمد شریف یہ سنتے ہی غصے

میں آگئے اور میاں شہباز شریف کو سخت سست کہہ کر ڈانٹ دیا کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ سوچ کر جواب دونگا۔ اس سے بیٹا تمہاری کمزوری ظاہر ہوتی ہے، ہمیں جو کچھ دیا ہے اللہ نے دیا ہے اور جو کچھ واپس لیا ہے وہ اللہ نے لیا ہے۔ بینظیر کون ہوتی ہے لینے دینے والی۔ اسے جب منظور ہوگا وہ ہمیں سب کچھ دے دے گا۔ میاں شہباز شریف اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور وہ بات وہیں ختم ہوگئی۔ یہ بات واقعی ایک ایسا آدمی کر سکتا ہے جو سیلف میڈ ہو اور اعتماد سے سرشار ہو اور اللہ پر بھروسہ رکھتا ہو۔ 1937ء میں مزدوری سے کاروبار میں قدم رکھنے والا میاں شریف اور ذوالفقار علی بھٹو کا دور آنے تک پاکستان کے بائیس امیر خاندانوں میں بغیر کسی سیاسی سہارے کے پہنچ جانے والا ہی یہ کہہ سکتا تھا جسے بھٹو نے ایک دفعہ پھر زیرو پر لا کھڑا کیا تھا، اور پھر اسی کے دور میں اپنی محنت اور قابلیت سے دوبارہ پانچ ملوں کا مالک بنا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی دستگیری کی کہانی تو بہت بعد کی بات ہے۔ یہ لوگ اس کے بغیر بھی ترقی کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسے کہتے ہیں عزم صمیم اور یقین کامل، جس سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔

اس وقت تک ملک میں ایسی صورتحال بن چکی تھی کہ سب لوگ بے نظیر حکومت کے مظالم اور بدعنوانیوں سے تنگ آگئے تھے۔ پاکستان کی سیاسی و دینی جماعتیں، جنہوں نے نام نہاد تیسری قوت بنا کر 1993ء میں نواز شریف کو ہرانے کا بندوبست کیا تھا، اب وہ بھی نواز شریف کے ساتھ الائنس چاہتی تھیں مگر نواز شریف نے ماضی میں الائنس کے اپنے تلخ تجربہ کی روشنی میں ان کی حوصلہ افزائی نہ کی، کیونکہ وہ ملک کی بہتری اور ترقی کے لئے انقلابی بنیادوں پر کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو ان کے ساتھ مل کر نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں کے خیالات بہت دقیانوسی تھے جبکہ نواز شریف پاکستان کو اکیسویں صدی کی جدیدیت سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ وہ اقتدار برائے اقتدار حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اقتدار کو ان اونچے مقاصد کی خاطر ایک سیڑھی سمجھتے تھے اور اپنی کشتی میں اب وہ کسی اور کو خواہ مخواہ نہیں بٹھانا چاہتے تھے، اس لئے ان لوگوں کی ایسی کوششیں بالکل اکارت گئیں۔ نواز شریف نے صرف جمعیت اہلحدیث اور جمعیت علمائے پاکستان کو ساتھ رکھا، کیونکہ وہ لگاتار حکومت اور حکومت سے باہر ان کا ساتھ دیتی آئی تھیں۔ اے این پی بھی نہایت ثابت قدمی سے مسلم لیگ ساتھ دے رہی تھی۔ نواز شریف کی سوچ

میں مسلم لیگ کا علاقائی جماعتوں سے قریب قومی یکجہتی کی فصل کے لئے بہترین کھاد تھا، مگر خود مسلم لیگ کے اندر کا اولڈ گارڈ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اس دباؤ کے باوجود نواز شریف اے این پی اور بلوچستان کی بی این پی اور جمہوری وطن پارٹی وغیرہ کو قومی اتحاد کی خاطر قریب رکھتے تھے۔ ویسے بھی یہ لوگ بوجہ بے نظیر بہت زیادہ شاکی تھے۔ یوں اس مشکل مرحلہ میں بھی پنجاب کا نواز شریف علاقائی جماعتوں اور چھوٹے صوبوں کی قیادتوں کے ساتھ دلربائی اور سیاسی فیاضی کو فائق رکھتا تھا۔ وہ مسلم لیگ کے اولڈ گارڈ کے باوجود ایک پروگریسو نقطہ نگاہ کا حامی ہی نہیں پیروکار تھا۔ مسلم لیگ کے اندر اس معاملہ میں بہت لے دے ہوتی تھی اور نواز شریف ہمیشہ قومی یکجہتی کی خاطر اپنے ان اصولوں پر ڈٹ جاتے اور پرانے ''نظریاتی'' لوگ اس کا برا بھی مناتے۔ ہمارے ملک میں ایسے لال بجھکڑوں کی کمی نہیں جو ملکی یکجہتی کو نظریاتی اور جسمانی قوت کے ڈنڈے سے دریافت کرنے کے درپے رہتے ہیں حالانکہ یہ لطیف آبگینہ صرف اور صرف سیاسی عمل ہی سے قائم رہتا ہے، پرورش پاتا ہے، ڈنڈے سے تو ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس سے قبل ہم اس تجربہ سے گزر چکے ہیں۔ ایوبی اور یحییٰ خان مارشل لاء اور ان کی نظریاتی سجاوٹیں ہمیں ہماری تاریخ کا بدترین دور دکھا چکی ہیں۔ اور ان سب بربادیوں میں اس اولڈ گارڈ کا بہت قصور تھا جو ملکی یکجہتی ہی کے نام پر ملک کو پارہ پارہ کر چکا تھا۔ جیسے کہتے ہیں کہ ہائے آزادی تیرے نام پر کیا کیا ظلم روا نہ رکھے گئے، اسی طرح ملکی یکجہتی کے نام پر ہمارے مقتدر جاہلوں نے کیا کیا شکستگی نہیں کی ہے۔ اس لئے محمد نواز شریف کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ پنجاب کے اکثریتی صوبے کی قیادت کو اپنے چھوٹے بھائیوں سے دلربائی کا رویہ رکھنا اور دکھانا ہی ہوگا اور انہوں نے حزب اختلاف میں رہتے ہوئے بڑے اہتمام سے اس کا خیال رکھا..... اپنے اقتدار کی خاطر نہیں ملکی اتحاد کی خاطر۔

یہی وجہ ہے کہ جب سندھ کے شہری علاقوں سے اٹھنے والی مہاجروں کی تحریک ایم کیو ایم، نصیر اللہ بابر اور وزیر داخلہ کے مظالم کی وجہ سے کراہ رہی تھی تو ملک وملی اتحاد کی خاطر نواز شریف نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا حالانکہ اس کے ساتھ جنرل آصف نواز کی مہم جوئی کی وجہ سے شدید اختلافات موجود تھے۔ جنرل نصیر اللہ بابر کی سربراہی

میں بے نظیر نے ایم کیو ایم کے کارکنوں کی ماورائے عدالت ہلاکتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کروا رکھا تھا اور کراچی کے ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ کراچی کی پولیس جسے چاہتی پار کر دیتی اور جسے چاہتی پیسے لے کر بچا لیتی۔ اس طرح رشوت اور ظلم کا ایک عجیب چکر جاری تھا، ملکی عدالتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، ملک کے مختلف جاہل مقتداروں نے اپنے اپنے ادوار میں امن عامہ کی راہیں عدل کے معروف طریقوں کی بجائے شارٹ کٹ جبر کی کج راہی سے تراشی ہیں حالانکہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ معاشرہ میں امن کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے عدل کا راستہ، نہ کہ جبر کا..... مگر ہمارے ہاں مارشل لاؤں نے، جو کہ جبر کی بدترین شکل ہے، ہماری عمومی نفسیات میں جبر کو بہت زیادہ تقدس بخش رکھا ہے۔ جعلی پولیس مقابلے اسی کی کڑی ہیں، جنہیں جنرل محمد موسیٰ خان نے بحیثیت گورنر مغربی پاکستان شروع کیا اور پھر آج تک یہ بدعت چل رہی ہے، نصیر اللہ بابر نے اسے کراچی میں کمال کی حد تک پہنچایا، تاکہ یہاں حکومت کی مخالف ایم کیو ایم ختم کی جا سکے۔ مگر سیاست کبھی اس طرح کے ہتھکنڈوں سے ختم نہیں ہوتی، البتہ دکھ درد بڑھ جاتا ہے اور جمع شدہ غم و غصہ پھر ایک طوفان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ طوفان تباہی پھیلاتا ہے۔ اس لئے نواز شریف نے اس طوفان کو روکنے کے لئے ایم کیو ایم کی طرف اس کی مصیبت کے لمحہ میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جب نواز شریف یہ قدم اٹھا رہے تھے تو ان کی اپنی جماعت میں اس کی بہت زیادہ مخالفت ہو رہی تھی اور بہت سے سیاسی بزرجمہر انہیں بار بار سمجھا رہے تھے کہ پنجاب میں اس کا بہت زیادہ سیاسی نقصان ہوگا کیونکہ پنجاب میں ایم کیو ایم کا تاثر کوئی زیادہ اچھا نہیں تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن نواز شریف نے کچھ دانشوروں کے ساتھ بشمول الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمان شامی اور ضیاء شاہد اس سلسلہ میں ایک میٹنگ رکھی ہوئی تھی اور ایم کیو ایم سے قرب کے حوالے سے باتیں ہو رہی تھیں۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے بہت سے سینئر ارکان اسمبلی بھی شریک تھے اور وہ سب کے سب اس کی سخت مخالفت کر رہے تھے اور بار بار یہی کہے جا رہے تھے کہ ہمیں سیاسی نقصان ہوگا۔ آخر نواز شریف نے تنگ آ کر کہا کہ بھاڑ میں جائے سیاست، میں ملکی یکجہتی کی قیمت پر سیاست نہیں کرنا چاہتا، ملک رہے گا تو سیاست ہو

گی۔ کہنے لگے کہ دانشوروں سے میں علیحدہ میٹنگ کروں گا تاکہ کوئی لائحہ عمل طے پا سکے۔ یوں ایک بدمزگی کا سماں پیدا ہو گیا اور میاں صاحب دانشوروں کو ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے چند مسلم لیگی ساتھیوں نے بعد میں ناراضی کی کیفیت میں میاں صاحب کے رویے پر بہت گلے شکوے کئے اور یہاں تک کہا کہ ان کے اندر آمریت کے جراثیم بدرجہ اتم موجود ہیں، مگر یہ لوگ بے چارے اس وقت قومی نقطہ نگاہ سے کوئی زیادہ دور کی نہیں سوچ رہے تھے جبکہ میاں صاحب کی نگاہیں دور مستقبل پر تھیں۔ میاں صاحب کو اس قسم کی تنقید کا اکثر سامنا کرنا پڑتا تھا، مگر وہ اپنی مستقل مزاجی پر قائم رہے۔ اس معاملات میں جہاں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں، میں نے دیکھا ہے کہ وہ ضد ضرور کرتے، لیکن اگر معاملہ کے عام پہلو انہیں اچھی طرح سمجھا دیئے جاتے تو بلا تامل مان بھی جاتے۔ میں نے سینکڑوں نہیں ہزاروں معاملات میں انہیں ایسی صورت میں رائے بدلتے دیکھا، لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں بہت سے لوگ دلیل سے کام نہیں لیتے، تمام مخالفتوں کے باوجود میاں صاحب نے ایم کیو ایم کو مصیبت کے وقت گلے لگا کر انتہائی اقدامات اٹھانے سے روک لیا اور انہیں ایک دفعہ پھر ریاست کے قومی دھارے میں لے آئے۔

یہ وہ وقت تھا جب پوری قوم کراچی سے خیبر تک بے نظیر حکومت کی بدعنوانیوں اور کارستانیوں سے بلبلا رہی تھی، بلائے جان بن جانے والی محترمہ سے نجات چاہتی تھی۔ لوگوں کی نگاہ لامحالہ ان حالات میں نواز شریف کی طرف اٹھتی تھی۔ اس پس منظر میں میاں نواز شریف نے تحریک نجات کا آغاز کراچی سے بذریعہ ٹرین کیا اور پھر ان کے ساتھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتے پاکستان کے غریب عوام ساتھ ہوتے۔ لاہور پہنچے تو بھیڑ کی وجہ سے ان کا ٹرین سے اترنا مشکل ہو گیا کہ پورا لاہور باہر تھا۔ یہی کیفیت راولپنڈی میں تھی اور یہی حال پشاور میں۔ نواز شریف عوامی محبتوں کا مرکز تھے اور لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھے۔ وہ معاشی مسیحا بھی تھے اور ظلم سے نجات دلانے والے بھی، ہر طرف سے آواز اٹھتی "نواز شریف قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" لوگ نواز شریف کا پہلا دور حکومت دیکھ چکے تھے، اب وہ اس وقت کو یاد کرتے تھے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے

ساتھ اولڈ گارڈ غلام اسحاق خان نے ظلم کیا تھا، وہ اپنے ووٹ سے اس کا ازالہ کرنا چاہتے تھے، لہٰذا اب نواز شریف ہی نواز شریف ہو رہی تھی۔ دوسرے چراغوں میں روشنی نہیں رہی تھی۔

یہ دیکھ کر پرانے گرگوں نے بھی پانسے بدلنے شروع کر دیئے اور موجودہ اولڈ گارڈ، جو فاروق لغاری کی شکل میں منظر پر تھا، نے بھی نواز شریف کے قریب آنے کے لئے پینترے بدل لئے۔ سردار فاروق لغاری ایک بہت بڑے جاگیردار، سردار اور بیوروکریٹ ہیں اور اپنی کلاس کے مفادات کا ان سے بہتر رکھوالا کون ہو سکتا تھا؟ بے نظیر تو اب بیکار ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر منظر پر رہتیں تو ان کی کلاس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا اور نواز شریف کو اب کوئی شکست دے نہیں سکتا تھا تو کیوں نہ اس کے ساتھ مل جایا جائے اور وقت آنے پر اپنے مفادات کا تحفظ کر لیا جائے۔ یہ وہ حکمت عملی تھی جس کی بنیاد پر فخر امام اور سیدہ عابدہ حسین وغیرہ نے شاہد حامد سابق سی ایس پی اور ان کے یار غار کے ذریعے سردار فاروق لغاری سے نامہ و پیام کی پہل کی۔ نواز شریف اس پہل قدمی کے حصے میں نہیں تھے اور شروع شروع میں یہ کام ان کے علم میں لائے بغیر کیا گیا اور جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بے نظیر اپنی ٹرم پوری کریں تاکہ لوگ اچھی طرح دیکھ لیں کہ اچھے برے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس طرح ایک تو ایک اچھی جمہوری روایت قائم ہوگی اور دوسرے بدی جڑ سے اکھڑ سکے گی۔ یہاں بھی ان کی نگاہ دور رس نتائج پر تھی۔ حالانکہ وہ اور ان کا خاندان سخت مالی دشواری میں تھے مگر وہ ملکی مفاد میں بے نظیر کی ٹرم پوری دیکھنا پسند کرتے تھے لیکن ان کے بہت سے ساتھی تھک چکے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی یہ سیاسی جدوجہد جلد اختتام پذیر ہو۔ انہوں نے بھی اپنا ترپ کا پتہ کھیلا اور میاں صاحب کے ذہن میں ڈالنا شروع کیا کہ اگر بے نظیر کچھ عرصے اور حکمران رہ گئیں تو پاکستان مکمل طور پر تباہ ہو جائے گا اور پھر ملک اس معاشی بدحالی سے کبھی بھی نہیں نکل سکے گا۔ اس عجلت کا ایک اور کارن بھی تھا کہ ایک نہایت ہی ذاتی وجہ سے فاروق لغاری، بے نظیر اور زرداری کے سخت دشمن بن چکے تھے۔ زرداری کی حماقت سے انہوں نے ایک باعزت بلوچ سردار کی غیرت کو للکار دیا تھا۔ اب ان کے درمیان کچھ دوستوں نے دستاویزات کی بھرمار کر دی جو ایوان صدر سے میاں نواز شریف کے لئے مہیا

کردی گئیں، جو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ معاشی طور پر ملک بالکل دیوالیہ ہونے کو ہے۔ اگر مزید دیر ہوگئی تو پھر کچھ بھی بچ نہیں پائے گا۔ میاں صاحب جیسا صاف دل محب وطن ایسی صورتحال کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا وہ ملکی وجوہ (نہ کہ ذاتی) کی بناء پر بے نظیر حکومت کو قبل از وقت ہٹائے جانے کے حق میں ہوگئے اور پھر درمیانی دوستوں کو اشارہ دیدیا کہ وہ دستوری معیار 90 دن کے اندر اندر الیکشن کروانے کی شرط پر 58(II)B کا اختیار استعمال کرنے کیلئے فاروق لغاری کا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔ دوسری شرط انہوں نے احتساب کی لگائی کہ محض الیکشن نہیں بلکہ ساتھ ساتھ بے نظیر کی بدعنوانیوں کا احتساب بھی لازمی ہونا چاہئے بلکہ سب کا بے لاگ احتساب ہونا چاہئے۔ یہی وہ شرط تھی جس کی روشنی میں نواز شریف نے 8 ستمبر 1996ء کو اپنے قومی اسمبلی میں اڑھائی گھنٹے کے فی البدیہہ زور دار خطاب میں آزاد عوامی احتساب کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ تجویز فاروق لغاری سے جاری گفت وشنید کا حصہ تھی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس ملک میں سب سے زیادہ احتساب میاں نواز شریف اور ان کے خاندان کا ہوتا رہا۔ سب سے پہلے یہ احتساب محمد خان جونیجو نے کیا لیکن انہیں ان کے خلاف کچھ نہ مل سکا۔ دوسرا احتساب بلکہ عذاب بے نظیر کے پہلے دور حکومت میں نازل ہوا اور میاں صاحب اس امتحان میں بھی سرخرو نکلے اور اب ایک دفعہ پھر پچھلے پورے تین سال سے بے نظیر عذاب میں سے گزر رہے تھے لیکن پھر بھی اپنے آپ کو احتساب کے لئے اس شرط پر پیش کر رہے تھے کہ ساتھ ساتھ بے نظیر کا احتساب درکار تھا۔ حالانکہ انہوں نے خود اپنے دور اقتدار میں صرف اچھی سیاسی روایات کی خاطر اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ تیور بتا رہے تھے کہ اگر اب میاں صاحب اقتدار میں آتے ہیں، جو بالکل صاف نظر آ رہا تھا تو پھر خود بھی ایک کڑا احتساب کریں گے۔ ہمارے ہاں بہت سے دوست احتساب کی بات بڑے شدومد سے کرتے رہتے ہیں، انہیں جاننا چاہئے کہ اس ملک میں سب سے زیادہ احتساب اتفاق فیملی کا ہوا ہے اور اسے رواج بھی خود میاں نواز شریف نے دیا ہے۔ اس موضوع پر مزید ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔

یہ وہ دن تھے جب امریکیوں نے آنے والے وقت کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور میاں نواز شریف کے قرب

کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ میں نے کچھ امریکیوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ یہ بڑے ہوشیار لوگ ہیں اور اپنا کام نکالنا جانتے ہیں۔ وہ ابھرتے ستاروں کو خوب پہچانتے ہیں اور میاں نواز شریف اب پاکستانی افق پر ایک نہایت ہی درخشندہ سیاسی ستارہ تھے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے ساتھ ان کی بہت میٹنگیں ہوئیں۔ منشیات، دہشت گردی، علاقائی امن اور نیوکلیئر کے موضوعات زیر بحث آئے اور میاں صاحب نے نہایت ہی مضبوط اور معتدل نقطہ نگاہ اپنایا جو پاکستان کے بہترین مفاد میں ہو سکتا تھا۔ علاقائی امن کے وہ خود داعی ہیں اور نرسیما راؤ سے اچھے تعلقات کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے معاشی پروگرام کو آگے بڑھا سکیں۔ منشیات اور دہشت گردی کے وہ طبعاً خلاف ہیں جیسا کہ ہر شریف اور سیدھے سادے اور مدبر انسان کو ہونا چاہئے۔ اس پر زیادہ بحث کی ضرورت ہی نہیں، ان باتوں کی کون ذی ہوش مخالفت کر سکتا ہے۔ رہا معاملہ نیوکلیئر کا تو اس پر میاں صاحب کا ذہن بالکل صاف تھا کہ وہ ان کی ملی ضرورت تھی اور علاقائی امن کی بنیاد بھی..... اجلاس کے علاوہ میاں نواز شریف نے خود امریکہ پہنچ کر کارنیگی فاؤنڈیشن کے لیکچر میں اپنے اس موقف پر ایک زوردار تقریر کی اور نیوکلیئر آپشن کو علاقائی امن کی بہترین ضرورت قرار دیا کیونکہ اس کا تعلق بھارت سے تھا۔ ایسے ہی جیسے کہ امریکہ کا کیوبا سے تعلق ہے۔ سنا ہے کہ میاں صاحب نے اپنی تقریر میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اے امریکہ والو آپ ہمیں تو نصیحتیں کرتے ہو، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کیوبا آپ پر ایٹمی ہتھیار کس لے تو آپ کیا کریں گے؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا جواب کیا ہوگا اور آپ کے صدر کینیڈی نے یہ کام تقریباً کر ہی دکھایا تھا۔ اسے سخت فقرے دیکھ کر صاحبزادہ یعقوب خان نے انہیں نکال دینے کا مشورہ دیا اور وہ فقرے پھر ذرا ہلکے کر دیئے گئے۔ بہر صورت اب امریکہ پاکستانی سیاست کے اس ستارے کی دلجوئی کر رہا تھا۔ صدر فاروق لغاری اس سے دوستی کے خواہاں تھے اور کہتے پھرتے تھے کہ بے نظیر حکومت قومی مفاد کے خلاف ہے۔

اس دوران ایک نہایت ہی اندوہناک واقعہ ہوا۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے بھائی مرتضیٰ بھٹو کراچی پولیس کے ہاتھوں 20 ستمبر کو قتل ہو گئے اور پورے پاکستان میں ہر شخص کی زبان پر یہی ایک بات تھی کہ یہ قتل بے نظیر بھٹو

کے خاوند آصف علی زرداری نے کروایا ہے۔ ہر شخص چاہے وہ پی پی کا ہو یا کسی دوسری جماعت کا یہی کہہ رہا تھا کہ یہ قتل زرداری نے ہی کروایا ہے کیونکہ سالے بہنوئی میں سخت ان بن تھی۔ اس قتل نے حالات کو اور زیادہ گھمبیر بنا دیا۔ مرتضیٰ کی بیوہ بھی انگلیاں سیدھی اسی طرف اٹھا رہی تھی، وہ چونکہ پردیسی تھی اس لئے اس کے سہارے اور تشفی کے لئے خود نواز شریف نے قدم بڑھایا اور خود اس کے پاس گئے اور افسوس کیا۔ اسی طرح فاروق لغاری نے بھی ہر طرح سے اس کی ڈھارس بندھائی اور انصاف کی راہیں وا کرنے کی تسلی دی۔ سارا پاکستان بے نظیر کے خلاف ہو چکا تھا اور میاں نواز شریف کی مشکلات کا دور ختم ہونے کو تھا۔ تین سالہ بھٹی میں سے گزرنا خاصا مشکل تھا، لیکن انہوں نے ہمت سے یہ دور بھی گزار لیا.....

اور فاروق لغاری صدر پاکستان نے اپنے دستوری اختیارات استعمال کرتے ہوئے بے نظیر حکومت کو ڈسمس کر کے اسمبلیاں توڑ ڈالیں۔ ساتھ ہی 90 دن کے اندر الیکشن کا اعلان کر دیا بلکہ 3 فروری 1997ء کی باقاعدہ تاریخ بھی مقرر کر دی تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔ یہی نواز شریف کی سب سے بڑی شرط تھی۔

سازشی احتساب

صدر فاروق لغاری نے انتخابات کا اعلان تو کر دیا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر اولڈ گارڈ دلی طور پر بالکل ناخوش تھے۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح نواز شریف کا راستہ روکنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب نواز شریف کی کامیابی اسے صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نواز شریف ہی کے نعرے کو نہایت چالاکی سے اپناتے ہوئے احتساب کا نعرہ بلند کر دیا۔ اضافہ اتنا کیا کہ صرف احتساب کا نام لینے کی بجائے انہوں نے انتخابات سے پہلے احتساب کی رٹ لگا دی۔ اب حالات ایسے تھے کہ بے نظیر تو جیت نہیں سکتی تھی اور نواز شریف کو کوئی ہرا نہیں سکتا تھا، اس لئے یہ نعرہ اصل میں بے نظیر سے کہیں زیادہ نواز شریف کے خلاف تھا۔ کوئی پوچھے اگر مقصد بے نظیر کا احتساب ہے تو وہ تو فاروق لغاری بھی کرے گا اور نواز شریف بھی ضرور ہی کرے گا تو پھر یہ نعرہ کس لئے؟ احتساب جن کا ہونا چاہئے وہ تو پھر ہو کر ہی رہے گا کہ انہوں نے تین سال تک ملک کو لوٹا ہے۔ نواز شریف کا احتساب تو پورے تین سال ہوتا رہا۔ اس کے خاندان پر 150 سے زائد جھوٹے مقدمے بنے۔ اس کا احتساب تو کیا اس پر تو عذاب نازل ہو رہا تھا۔ اب یہ نعرہ کہ انتخابات نہ ہوں، کیوں؟

اس لئے کہ نواز شریف کا راستہ روکنا مقصود تھا تا کہ وہ پھر کہیں آ کر اپنے انقلابی اور اصلاحی اقدامات شروع نہ کر دے۔ ظاہراً اس احتساب کی آواز قاضی حسین احمد اور جنرل (ر) حمید گل اٹھا رہے تھے اور ان کے ساتھ ہمارے وہ تمام سادہ لوح دانشور بھی شامل تھے جنہیں جمہوریت کبھی بھی اور کسی بھی شکل میں راس نہیں آتی کیونکہ ان کے حلوے مانڈے کا بہترین بندوبست تبھی ہوتا ہے جب جنرل ایوب خان کا مارشل ہو، یا پھر جنرل ضیاء الحق کا "اسلامی" مارشل لاء ہو۔ اندر ہی اندر بیوروکریسی کا اولڈ گارڈ جو جمہور اور جمہوریت کا اس ملک میں سب سے بڑا دشمن ہے، اس آواز میں شامل تھا۔ اس وقت عبوری وزیر اعظم ملک معراج خالد تھے اور وہ بالکل بے اختیار و بے بس تھے۔ آپ انہیں درشتی وزیر اعظم کہہ سکتے ہیں۔ تمام کا تمام کام شاہد حامد صاحب سابق سی ایس پی اور فاروق لغاری سابق سی ایس پی اور ملک کے سب سے بڑے وڈیرے اور سردار کر رہے تھے اور ان کا نفس ناطقہ ارشاد احمد حقانی تھے جو وزارت اطلاعات کی بااثر کرسی پر بیٹھتے تھے۔ اب وہاں سے بھی آوازیں آنے لگی تھیں کیونکہ ان کا پروگرام تھا کہ یہ پروپیگنڈہ کرو کہ ملک کے بہترین مفاد میں ہے کہ موجودہ عبوری حکومت جو غیر سیاسی ماہرین پر مشتمل ہے وہ کسی نہ کسی طرح اگلے دو سال تک چلتی رہے اور اپنی ماہرانہ جادوگری سے ملک کو اس کے مختلف مسائل کی دلدل میں سے باہر نکالے، کیونکہ سیاسی لوگوں نے عوام کو مایوس کر دیا ہے۔ کن سیاسی لوگوں نے مایوس کیا ہے؟ بے نظیر نے یا نواز شریف نے؟ نہیں جی سب ہی نے، یہ سب ایک جیسے ہیں تو پھر لوگ نواز شریف نواز شریف کیوں کرتے پھر رہے ہیں؟ اس لئے کہ ان کے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہے۔ اور اب ہم تیسری چوائس ہیں، ہمیں دو سال تک دیکھ لیں، اس طرح وہ خود اپنے منہ میاں مٹھو بن کر تیسری چوائس بن گئے اور آوازیں لگانے اور کنفیوژن پھیلانے پر وہ لوگ، جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے، لئے دیئے گئے اور یوں نواز شریف کا راستہ روکنے کے لئے احتساب کے نام پر ایک نہایت ہی گہری سازش کی بنیاد ڈال دی گئی۔

عبوری وزیر اعظم ملک معراج خالد نے خود ہمارے دوست چودھری محمد ارشد سے کہا کہ چودھری کوئی کرتب بتاؤ کہ ہم آئندہ دو سال تک چلتے رہیں۔

سیاسی کرتب تو کوئی نہیں ہے، اس طرح کی بات کوئی سیاستدان تو ماننے سے رہا کہ وہ سیاسی خودکشی کرنے سے رہے۔ باقی رہا دستور تو اس میں بھی گنجائش نہیں ہے، اس لئے یہ کرتب نہیں چل سکتا، چودھری ارشد نے کہا۔

دراصل ہمارے ہاں بوجوہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو سیاسی مسائل کا حل انتظامی طریقوں سے نکالنا چاہتا ہے۔ وہ ذہنیت کبھی مارشل لاء کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی ڈیموکریسی کی صورت بنتی ہے۔ اس سب کے پیچھے ہماری بیوروکریسی اور جنرل شاہی کی طاقت ہوتی ہے جو ملکی معاملات میں تبدیلی کے سخت خلاف ہے اور ہر تبدیلی میں اپنے مفادات کو زک پہنچتے دیکھتی ہے۔ وہ کبھی ایک شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی دوسری، کبھی ایمرجنسی اور حالات کا بہانہ بناتی ہے اور کبھی احتساب کے تصورات کا استعمال کرتی ہے اور عوام کی سادگی سے کھیلنے کے لئے طرح طرح کے پرکشش و پرفریب نعرے نکال لاتی ہے۔ یہی صورت 1996ء کے آخری حصہ میں ہو رہی تھی اور وزارتوں پر براجمان لوگ اپنی خواہشات کے خدا کی پوجا کرتے ہوئے ہر دستوری تقدس کو پامال کرنے کا سوچ رہے تھے۔ یہاں تک کہ آواز اٹھی کہ کوئی ہرج نہیں ہے، اس ''نیک'' کام کے لئے ملک کی سپریم کورٹ سے رجوع کیا جائے اور یہ پلید کام ان سے کروالیا جائے۔ اس سوچ کے لئے ارشاد احمد حقانی پر سب سے زیادہ انگلیاں اٹھیں کہ وہ اس وقت وزیر اطلاعات تھے اور اس طرح کی سوچوں کے اپنے کالموں میں متواتر علمبردار تھے، لہٰذا ان پر یہ انگلیاں اٹھنی ہی تھیں۔ علاوہ ازیں ارشاد احمد حقانی نیشنل سکیورٹی کونسل کے پرچارک تھے۔ اس موضوع پر انہوں نے بہت کالم لکھے تھے اور یہاں تک فرماتے تھے کہ پاکستان کی ہیئت مقتدرہ ترکی کی طرز پر ہونی چاہئے حالانکہ پاکستان کی اور ترکی کی تاریخ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نیا ترکی یعنی کہ موجودہ ترکی وہاں کی افواج نے لڑ کر بچایا اور تخلیق کیا تھا اور فوج (اتاترک) ہی نے اس کا سیاسی ڈھانچہ تیار کیا تھا، جبکہ پاکستان کا خمیر اور تعمیر ایک سیاسی عمل کی رہین منت ہے۔ قائداعظم کی جمہوری جدوجہد کے ثمر کا نام پاکستان تھا۔ پاکستان کی جان اور بنیاد جمہوریت تھی جس کے بغیر وہ اسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا تھا جس طرح کہ مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہاں ہمارے مارشل لاؤں نے اسے بے جان اور بے لخت کرنے میں ضرور حصہ لیا تھا، اس لئے ارشاد حقانی کا یہ فارمولا بالکل بے محل

اور مہلک تھا لیکن وہ اس پر شد و مد سے قائم رہے اور اس عبوری دور میں اسے ایک باقاعدہ شکل بھی دی گئی جو بعد میں اپنی موت خود ہی مر گئی۔ اس پس منظر میں ان پر انگلیاں اٹھنا ایک فطری اور منطقی امر تھا۔

اس صورتحال میں میاں نواز شریف نے تو چپ سادھ رکھی تھی کیونکہ وہ اس بحث میں پڑ کر بے محل اپنی سیاسی کشتی ڈانواڈول نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اس سازش کو روزنامہ نوائے وقت اور اس کے مدیر اعلیٰ مجید نظامی نے پوری طرح سے بے نقاب کر دیا اور اسے اتنی تشہیر دی کہ سازشی منہ تکتے رہ گئے۔ مجید نظامی اس سازش کو طشت از بام کیوں نہ کرتے، ان کے خیال میں الیکشن سے فرار تو پاکستان کی بنیاد سے فرار ہے۔ 1946ء کا الیکشن ہی تو پاکستان کی بنیاد اور اساس تھی۔ پاکستان بننے کے بعد جب ہم نے الیکشن سے منہ موڑ کر مارشل لاء کو سینے سے لگایا تو آدھا پاکستان کھو بیٹھے۔ اس کے بعد الیکشنوں سے فرار کون سا محب وطن برداشت کرتا خاص طور پر جب پاکستان کی خالق جماعت پاکستان مسلم لیگ صاف صاف جیت رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر آنے والے غیر جمہوری مہم جو نے لفظ احتساب کو اپنی حکومت کو جواز یا طوالت کے لئے خوب استعمال کیا ہے۔ سب سے پہلے جنرل ایوب خان نے اپنی دھاک بٹھانے کے لئے خالقان پاکستان کی مٹی پلید کی اور مرچ مصالحہ ڈالنے کے لئے 100 بہترین اعلیٰ سرکاری افسروں کو نکال باہر کیا۔ یہی کام جنرل یحییٰ اور بعد میں جنرل ضیاء الحق نے بھی کیا۔ بے نظیر کا قصہ آپ سن چکے ہیں۔ بدعنوانی اسی حساب سے پاکستان میں بڑھتی گئی کیونکہ احتساب کی بنیاد کبھی بھی نیک نیتی پر نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی نہ کسی ذاتی اور غلط مقصد پر رکھی گئی تھی۔ اکثر مقصد خوف کی حکمرانی رہا ہے، لہٰذا بے یقینی نے بدعنوانی کو جنم دینا ہی دینا تھا۔ ضیاء الحق نے انتخاب سے پہلے احتساب کا سہارا لے کر 90 دن کو 11 سال کیا اور ایوب خان نے اسے کامیاب انقلاب قرار دلوا لیا۔ اس حوالے سے بی بی سی نے 1300 افسر نکالے، یحییٰ نے 300 افسر نکالے اور اب پھر بھٹو نے 300 افسر نکالے ہیں اور رشوت نے پاکستان کے اندر اسی تناسب سے فروغ پایا ہے کیونکہ سرکاری افسروں کو بے یقینی اور بے سہارگی کی کالی دیوی نے آدبوچا ہے۔ جہاں اختیار ہوگا اور بے یقینی بھی وہاں پھر اختیار بے دریغ

بکے گا۔ بی بی سی نے اس معاملے کی ساری حکمت نہایت ہی بلیغ طریقے سے بیان کی تھی۔ ہمارے ہاں سروس کو استحکام ہے اور نہ ہی سیاست کو۔ یکا یک مارشل لاء کی ایک کالی آندھی اٹھتی ہے اور سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے۔ یہی صورتحال مارشل لاء کی گود سے اٹھنے والی مارشل لاء مارکہ جمہوریت میں رہتی ہے۔ 1985ء میں جنرل ضیاء الحق نے غیر جماعتی الیکشن کروا کر جس بدی کو جنم دیا تھا وہ آہستہ آہستہ اپنے عمل نہ کہ افراد کی مجورب یا خوبصورتی سے بہتری کا سفر طے کر کے جب جماعتی ڈسپلن کی طرف بڑھ رہی تھی تو اولڈ گارڈ ایک دفعہ پھر احتساب کا جھانسہ دیکر اسے غیر جماعتی بلکہ نہایت ہی غیر حقیقی راہوں پر ڈالنے کے درپے تھا اور احتساب احتساب پکار رہا تھا۔ سیاسی جماعتیں اس پر کھل کر بات کرنے سے اس لئے گریزاں تھیں کہ کہیں ان پر بددیانتی کا الزام چپک ہی نہ جائے۔ مسلم لیگ بھی یہی مدافعتی کھیل کھیل رہی تھی۔ بس بعض صحافتی حلقوں سے ایک نحیف سی آواز اٹھتی کہ جمہوری نظام میں الیکشن ہی بہترین احتساب ہے۔ بعض اخبار نویسوں نے اس وقت کے حالات اور حکمرانوں کی حد تک ان کی سازشوں کو ضرور بے نقاب کیا تھا مگر اس سلسلے میں جمہوری برکات کا کبھی تفصیل سے ذکر نہ کیا، حالانکہ کہنا چاہئے تھا کہ احتساب کا تصور جمہوریت اور جمہوری آزادیوں کے بغیر اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کسی مچھلی کا پانی کے بغیر زندہ رہنا۔ احتساب کے لئے سب سے پہلی شرط ایک آزاد فضا ہے جہاں آزادی اظہار کا ہونا لازم ہے تبھی کوئی عام سا بدو اٹھ کر خلیفہ وقت سے اس کی قمیص کا حساب مانگ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ احتساب کی افادیت تبھی ہے کہ وہ حاکم وقت کا ہو اور ایسے مضبوط اور آزاد محتسب موجود ہوں جو موجود حکمران کا حساب کتاب کر سکیں۔ حکمران وزیراعظم اندرا گاندھی کی نشست سے اسے بے دخل کر سکیں اور صدر کلنٹن کو مواخذے کے لئے طلب کر سکیں اور یہ تمام ادارے جمہوریت اور دستور کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اگر دستور اور جمہوریت نہیں تو کوئی دوسرا ایسا راستہ نہیں ہے جس کی راہ پر چل کر آپ حساب کتاب کی پٹڑی پر رہ سکیں۔ مطلق العنان بادشاہ یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے کون حساب لے سکتا ہے۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، آڈیٹر جنرل وغیرہ اسی حساب کتاب کے لئے ہیں مگر جنرل ایوب خان جیسا ڈکٹیٹر محکمہ دفاع کا تقدس کا چغہ پہنا کر پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی پرسش سے ہی آزاد کر دیتا

ہے۔ سروسز کے معاملات میں من مانی کرنے کے لئے پبلک سروس کمیشن کے ادارے کو آمریت (سول اور خاکی) بے معنی کر کے رکھ دیتی ہے۔ عدلیہ کو پی سی او کا پھندا پہنا کر بے بس کر دیتی ہے اور یوں تمام سروسز اور انتظامیہ کو قانون کی حکمرانی سے آزاد کر کے حکمرانوں کی لونڈی بنا دیا جاتا ہے۔ جب بدعنوانی کا عفریت بے قابو ہو جاتا ہے تو یہ لوگ بھاگ کر ایک دفعہ پھر بیرکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور غیر جماعتی انتخابات کروا کر اخلاق باختگی اور نفسا نفسی کی شاہراہیں کھول دیتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا گیا اور جب یہ تمام امراض آہستہ آہستہ بتدریج جمہوری عمل کے موسم سے بہتر ہونے لگے تو ایک دفعہ پھر احتساب کا نعرہ لگا کر غیر نمائندہ لال بجھکڑوں کے لئے دو سال کھل کھیلنے کا موقع فراہم کرنے پر لگ گئے، مگر اس دفعہ لوگوں کا موڈ نواز شریف کا راستہ روکنے کا قطعاً نہیں تھا۔

ان ہی لوگوں کے اصرار پر فاروق لغاری صاحب نے ایک بے تکی نیشنل سکیورٹی کونسل بھی ترتیب دیدی جیسے کہ یہ افلاطونی ٹولہ ملکی مسائل کا کوئی خاص مجرب نسخہ رکھتا ہو، حالانکہ یہ نسخہ 1971ء میں تو کام نہ آیا۔ اس وقت جنرل یحییٰ خان بلا شرکت غیرے ملک کا حکمران تھا اور ملک میں ایک عدد نیشنل سکیورٹی کونسل بھی موجود تھی مگر اس کے باوجود ملک دولخت ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں یہ سب کچھ موجود تھا مگر صوبہ سندھ کی سب جیلیں ٹوٹ گئیں۔ کراچی سے پشاور کے لئے کوئی ٹرین، بس یا ٹرک بحفاظت نہیں چل سکتا تھا۔ سب جگہ ڈاکو تھے اور سفر کا نوائے کی صورت ہی میں ممکن تھا۔ مزدور اور طلبہ ہر وقت احتجاج کرتے، قتل کرتے اور قتل ہوتے۔ ایک لامتناہی ڈراموں کا سلسلہ تھا کہ چل رہا تھا جب ان حالات نے حکومت کا چلنا محال کر دیا تو واپسی کی ٹھان لی اور ایک غلام و مجبور جمہوریت کا پودا لگا لیا اور اس پر طرہ یہ کہ 1996ء تک جب تک اس لولی لنگڑی جمہوریت نے اگر تمام نہیں تو کم از کم کسی حد تک مارشل لاء کی نسبت حالات بہتر کر لئے تو اصرار ہوا کہ نیشنل سکیورٹی کونسل بنے اور چپکے سے بنا لی۔ اسے کہتے ہیں اقتدار میں چور دروازے سے نقب لگانا اور عوام کو اقتدار سے بیدخل کرنا۔ اس طرح آنے والے کے راستے میں کتنے کانٹے بکھیرے جا سکتے تھے، بکھیر دیئے تا کہ آئندہ آنے والے بھی ان کے اشاروں پہ ناچیں

اور بے قابو نہ ہو سکیں۔ یہ تھی فاروقانہ گرینڈ سٹریٹجی، عوام بھی ان سب حرکات کو غور سے دیکھ رہے تھے اور اندر ہی اندر فیصلہ کر رہے تھے کہ اس کا بھی علاج ضرور کرنا ہے تاکہ اولڈ گارڈ انقلابی نواز شریف کو کہیں جکڑ کر نہ رکھ دے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔ لوگوں کو وہ اس وقت ایک مسیحا خاص طور پر معاشی مسیحا نظر آ رہے تھے اور وہ ان کیراستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دینا چاہتے تھے۔ وہ پہلے دور کے نواز شریف کی واپسی مکمل اختیار کے ساتھ چاہتے تھے، نہ کہ یہ کہ وہ پابہ بجولاں ہو، اس لئے عوام کا موڈ اسے دو تہائی اکثریت سے جتانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور جب ایک موقعہ پر ایک دانائے راز نے یہ پیش گوئی کی تو نواز شریف نے اسے بات کرنے سے منع کر دیا کہ ایسی باتیں سب کچھ ہی چوپٹ کر دیں گی۔ وہ ان سازشوں کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

نواز شریف جدھر جاتے ہیں انسانوں کا ایک جم غفیر ان کی طرف امڈ آتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اولڈ گارڈ نے سوچا کیوں نہ کچھ آزاد گھوڑے میدان میں دوڑا دیئے جائیں اور پھر دوڑا دیئے گئے اور انہیں نشان بھی گھوڑے ہی کا دیا گیا تاکہ پہچان میں آسانی ہو۔ مگر یہ 1985ء نہیں تھا۔ یہ 1996ء تھا جب جماعتی سیاست ایک دفعہ پھر کافی حد تک منظم ہو چکی تھی پھر بھی چارہ گروں نے چارہ تو کرنا ہی تھا مقامی انتظامیہ کو مناسب ہدایات بھی دی گئیں مگر عوامی موڈ کچھ اور تھا۔

جماعت اسلامی نے عوام کے تیور دیکھے تو عزت سادات بچانے کے لئے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا اور جنرل حمید گل اور کچھ اور دانشوروں کے ساتھ مل کر تحریک احتساب چلا دی کہ کچھ نہ کچھ تو کما کھائے مچھندر۔ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اب مسلم لیگ کے ووٹ کون توڑ سکے گا؟ لہٰذا کرکٹ ہیرو عمران خان نے دفعتاً الیکشنوں میں اپنی جماعت تحریک انصاف کے نام سے چھلانگ لگا دی۔ عمران خان نیک نام تھا اور نیشنل ہیرو تھا، کینسر ہسپتال بنا کر بھی اس نے بہت نام کمایا تھا، اس لئے عوام نے اس کی بہت آؤ بھگت کی، اب وہ نواز شریف کے ووٹ ہی توڑتا، بے نظیر کے تو ووٹ تھے ہی نہیں۔ تھے بھی تو بہت کم اور نظر آ رہا تھا کہ پی پی کا ووٹ کسی کو نہیں پڑے گا۔ وہ پی پی پی کو ووٹ دیں گے اور نہ کسی اور کو، لہٰذا عمران خان نے اپنی قسمت آزمائی بے وقت کی۔ نواز شریف نے اسے ساتھ ملانے کی

کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ میدان سج گیا اور تمام تر سازشوں کے باوجود الیکشن ناگزیر ہو گئے۔ تمام اولڈ گارڈ ایک طرف تھا اور نواز شریف ایک طرف۔ عوام نے 3 فروری 1997ء کو دل کھول کر ووٹ دیئے اور نواز شریف کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم کر دیں۔ اب اس کی اپنی جماعت کی قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت تھی اور اپنے پرانے حلیفوں سے مل کر پارلیمنٹ میں اسے مکمل بالادستی اور آزادی تھی۔ لوگوں نے 1993ء کی زیادتی کا بدلہ لے لیا تھا اور اولڈ گارڈ کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔

مکمل اقتدار

میاں محمد نواز شریف نے 17 فروری 1997ء کو وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا اور اپنی پہلی ہی تقریر میں ایک اچھی حکمرانی کے عزم کا اظہار کیا تا کہ ملک کے اندر بہترین وعدل اور معاشی خوش حالی کی داغ بیل ڈال جا سکے۔ امن کی پرورش و پرداخت کے لئے ہمسایوں، خاص طور پر بھارت سے بہتر تعلقات کی طرف پہل قدمی کا اشارہ دیا اور توقع ظاہر کی کہ بھارت مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے آگے بڑھے گا تا کہ پورا خطہ امن کے ثمرات سے بہرہ ور ہو سکے۔

ان مقاصد کے حصول کی غرض سے انہوں نے اپنی کابینہ کے لئے پاکستان مسلم لیگ اور حلیف جماعتوں میں سے مرحلہ وار ایک بڑی ہی اچھی ٹیم کا انتخاب کیا جس میں ہر طبقہ کے روشن خیال احباب کو لیا گیا۔ سید مشاہد حسین، احسن اقبال اور جاوید ہاشمی جیسے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ پرانے تجربہ کار لوگوں کو چنا۔ سرتاج عزیز، چودھری سجاعت حسین اور جنرل مجید ملک جیسے لوگوں کو شریک کیا۔ اس طرح جوش اور ہوش کا ایک خوبصورت مرقع ترتیب دیا گیا۔ اے این پی، ایم کیو ایم، جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت اہلحدیث اور دیگر تمام حلیف جماعتوں کو باقاعدہ نمائندگی دی۔ اس طرح تمام صوبوں، خاص طور پر سرحد، سندھ اور بلوچستان کو بھرپور نمائندگی دیکر قومی یکجہتی

اور یگانگت کا ایک نہایت ہی خوبصورت گلدستہ پیش کیا۔ الٰہی بخش سومرو کو نیشنل اسمبلی کے سپیکر کا پروقار عہدہ دیکر صوبہ سندھ کی عزت افزائی کی اور اس طرح ایک قومی حکومت تشکیل دی۔

وہ بے نظیر بھٹو، جنہوں نے پچھلے پورے تین سال اتنا زیادہ ستایا ہی نہیں بلا کہ میاں فیملی پر ظلم کی انتہا کر دی تھی، اب انہیں اسمبلی میں اتنی نشستیں بھی نہیں ملی تھیں کہ وہ آرام سے قائد حزب اختلاف بن سکیں بلکہ اس وقت ان کا امیج اتنا خراب تھا کہ الطاف گوہر جیسے قلمکار نے لکھ دیا کہ اگر وہ کسی طرح بن بھی سکے تو اسے بننے نہیں دینا چاہئے مگر میاں نواز شریف نے اس معاملہ میں ذرا بھر بھی بخل سے کام نہ لیا اور جب وہ قائد حزب اختلاف بننے کے لئے کوششیں کر رہی تھیں تو ذرا بھر بھی رکاوٹ ان کے راستے میں کھڑی نہیں کی تا کہ اچھی جمہوری روایات کی آبیاری ہو سکے۔

ادھر صوبہ پنجاب کی اسمبلی میں اپوزیشن کا مکمل صفایا ہو چکا تھا۔ دو چار سیٹوں کو چھوڑ کر تمام سیٹیں پاکستان مسلم لیگ کو ملی تھیں۔ دراصل پنجاب نے میاں نواز شریف کو مکمل مینڈیٹ دیدیا تھا اور اب میاں صاحب کو یہاں کام کر کے دکھانا تھا۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اور 1993ء کی منظور وٹو کی بے وفائی کو یاد کرتے ہوئے میاں نواز شریف نے اپنے چھوٹے بھائی میاں شہباز شریف کو صوبے کا وزیر اعلیٰ بنانا مناسب سمجھا۔ میاں شہباز شریف اپنی ذات میں ایک بہت ہی فعال، متحرک اور قابل انسان ہیں اور انہوں نے اپنی بعد کی شاندار کارکردگی سے ثابت کر دیا کہ وہ اس عہدہ کے اہل ہی نہیں بہت زیادہ اہل تھے بلکہ بعد میں ان کے کام دیکھ کر تو بعض لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ وہ تو نواز شریف سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ پنجاب میں چودھری پرویز الٰہی جو کبھی میاں نواز شریف کے مدمقابل تھے اور اب بہترین ساتھی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے۔ اس طرح پنجاب کی نمائندہ اور قابل ترین شخصیات اعلیٰ عہدوں کی مستحق ٹھہریں۔ پاکستان مسلم لیگ کی اتنی بھرپور جیت کے باوجود دوسری حلیف جماعتوں کو بھی کابینہ میں نمائندگی دی گئی اور جمعیت علمائے پاکستان سے اوقاف کے وزیر لئے گئے۔ میاں شہباز شریف نے پنجاب کی مختصر ترین اور قابل ترین کابینہ تشکیل دی جس میں راجہ بشارت اور چودھری اقبال جیسے نیک

نام اور فعال لوگوں کو شامل کیا گیا۔

یہی صورتحال سرحد اور بلوچستان میں تھی۔ سرحد میں اے این پی اور بلوچستان میں اختر مینگل ساتھ شامل تھے بلکہ اختر مینگل تو خود وزیر اعلیٰ تھے۔ یہ وہ جماعتیں ہیں جنہیں ہمارا اولڈ گارڈ ہمیشہ غداری کے خطابات سے نوازتا رہا اور ان سے جیلیں بھرتا رہا تھا اور اب وہ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ذمہ داری میں شریک تھیں۔ اسے کہتے ہیں خاموش اور خوبصورت انقلاب، جو میاں نواز شریف ملکی یکجہتی اور سالمیت کے لئے ایک خوبصورت سیاسی عمل سے لا رہے تھے اور جس کے لئے ہمارا نظریاتی ٹھیکیدار طبقہ انہیں نظریاتی ورثے بھی خوب رسید کر رہا تھا۔ ہمارا نظریاتی طبقہ خاصا کم نظر تھا اور میاں نواز شریف عالی نگاہ حالانکہ دونوں میں کوئی نظریاتی بعد نہیں تھا۔ دونوں ہی نظریہ پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ فرق صرف طریقے اور ظرف کا تھا۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

میاں نواز شریف قائداعظم کے لبرل ازم کے پیروکار ہیں اور دوسرے احباب مولانا مودودی کے نظریے کی عینک پہن کر فلسفہ قائد کو جامد سے جامد تر بنا رہے تھے اور ایک شخص آہنی جیکٹ میں کس کر اس کا ایک محبوس ہونے والا جسمانی اور فزیکل بت بنائے اس کے متولی بنے بیٹھے تھے۔ میاں نواز شریف نے پتھر کی اس سخت دیوار کے پار دیکھ کر اس کی حقیقت اور گہرائیوں کو پہچان کر اس سے قومی وحدت کی پرورش اور آبیاری کی۔ آپ اسے فراست کہہ سکتے ہیں، حکمت کہہ سکتے ہیں مگر اسے ملک دشمنی نہیں کہہ سکتے مگر کچھ دوستوں نے ان کی اس بالغ نظری کو مطلب براری تک کہہ ڈالا جسے سوائے تنگ نظری کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

صوبہ سندھ کی سیاسی صورتحال دوسرے سب صوبوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں الیکشن کے بعد صوبائی سطح پر سب سے بڑی پارٹی پیپلز پارٹی ہی تھی اور دوسرے نمبر پر ایم کیو ایم تھی۔ وہاں حکومت کی تشکیل کا حق پی پی کو ملنا چاہئے تھا مگر پاکستان مسلم لیگ جو اچھی خاصی تعداد میں کامیاب ہو کر آ گئی تھی۔ اس نے آزاد ممبران کو اپنے ساتھ

ملا لیا اور ایم کیو ایم کو بھی اس طرح یہ اتحاد پی پی سے تعداد میں بڑا ہو گیا، لہٰذا حکومت سازی اس اتحاد کا استحقاق ٹھہرا۔ اتحاد کے اندر چونکہ ایم کیو ایم کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس لئے وزارت اعلیٰ ان کا حق تھا اور انہوں نے یہ حق مانگ لیا۔ جمہوری روایات کے مطابق وزیر اعلیٰ ایم کیو ایم ہی سے لیا جانا چاہئے تھا اور میاں نواز شریف اس کے لئے بالکل تیار تھے مگر ہمارے مقتدار ترین ادارے نے بوجوہ اس پر اعتراض کر دیا تو ایم کیو ایم نے کہا کہ کم از کم گورنر تو ان کا ہو، مگر وہ بھی اعلیٰ سرکار کو منظور نہیں تھا۔ اب یہ سراسر جمہوری اصولوں کی خلاف ورزی تھی بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ وزیر اعلیٰ مسلم لیگ اور وہ بھی اندرون سندھ سے ہوگا تاکہ پرانے سندھی مطمئن ہو سکیں۔ گورنر فوج سے مگر اردو بولنے والا ہوگا اور لاہور کے کور کمانڈر معین الدین حیدر کو سندھ کا گورنر نامزد کر دیا گیا۔ ایم کیو ایم کو صرف وزارتوں تک محدود کر دیا گیا۔ یعنی شامل اقتدار بھی ہوں اور اہم معاملات میں ان کی حاکمیت بھی نہ ہو سکے۔ یہ کچھ انگریزوں والی پالیسی تھی کہ اپنی سامراجیت قائم رکھنے کے لئے دیسی لوگوں کو دو غلے غلام (1991ء ایکٹ) میں شامل بھی کرو اور انہیں اہم محکمے بھی مت دو اور اصل اختیار انگریز گورنر کے پاس رہے۔ 1997ء میں کچھ اسی طرح کی پالیسی صوبہ سندھ کی حد تک ہمارے کالے انگریز اپنا رہے تھے۔ خود میاں نواز شریف اس کے کوئی زیادہ حق میں نہ تھے لیکن مصلحت و منفعت اس میں سمجھی گئی کہ مستقل سرکار کی بات ماننا ہی بہتر ہے۔ حالانکہ حالات اور اصولوں کا تقاضا تھا کہ وہاں چیف منسٹر ایم کیو ایم سے بنا دیا جاتا اور مکمل ذمہ داری ان کے گلے میں ڈال کر بہت دیرینہ مسئلہ اسی طرح حل کر دیا جاتا جیسے کہ 1998ء میں بے نظیر کو حکومت دیکر اندرون سندھ کا ابال ختم کر دیا گیا تھا مگر ایسا نہ ہوا اور اس ایک غلطی نے مستقبل کے بہت سے بگاڑوں کو جنم دیا۔ اس طرح ایم کیو ایم کو مکمل احساس ذمہ داری نہ ہوا بلکہ الٹا گلہ ہو گیا اور مسلم لیگ کچھ کر نہ سکی۔ دونوں طرف بداعتمادی رہی اور کچھ عرصے بعد اشتراک کی ہنڈیا عین بیچ چوراہے کے پھوٹی، کاش کہ غیر جمہوری لوگ سیاسی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتے۔ اسے کہتے ہیں پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا، جس سے ٹانگ بھی ٹوٹتی ہے اور پھڈہ بھی۔ پھر بھی کچھ لوگوں کو اب تک اصرار ہے کہ ملکی امور چلانے کے لئے ایک نیشنل سکیورٹی کونسل ہونی چاہئے۔ ایسے لوگوں

کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ خدا ایسے دانشوروں کو کچھ نور بصیرت ہی دیدے۔

تشکیل حکومت کے مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد میاں نواز شریف نے جو پہلا کام کیا وہ فیصل آباد میں چھاپہ مار کر وہاں کے چند افسروں کو ہتھکڑیاں لگوانا تھا جن پر الزام تھا کہ وہ کرپٹ ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب نواز شریف کی اولین ترجیح انتظامیہ اور بیوروکریسی کی تطہیر ہے تاکہ کرپشن کے ناسور کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بے نظیر کے دور میں ملک کے اندر ہی نہیں بیرون ملک بھی پاکستان کی کرپشن کا شور اٹھا تھا اور ایک وقت ایسا آیا تھا کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے پاکستان کو کرپشن میں دنیا بھر میں نمبر 2 پر گنوایا تھا۔ کرپشن کے خلاف جہاد ہر طرح جائز ہے اور میاں صاحب نے اپنے دور حکومت میں اس پر بہت زیادہ کام بھی کیا اور پاکستان دوسرے سے پھر چودھویں نمبر پر آ گیا لیکن میاں صاحب نے فیصل آباد میں جو از منہ وسطیٰ والا انداز اپنایا وہ اچھی اور بری تمام بیوروکریسی پر شاک گزرا اور یکدم ساری بیوروکریسی اندر ہی اندر ان کے خلاف ہو گئی۔ خائف بھی ہوئے مگر خلاف بھی۔ ان کا یہ انداز درست نہیں تھا اور پھر پاکستان کے چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ نے اس بات کا نوٹس لے کر معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تمام متعلقہ افسران وغیرہ کو نوٹس جاری کر دیئے۔ میاں نواز شریف کی سجاد علی شاہ سے ان بن کی یہ پہلی کڑی تھی۔ یہاں سے بیوروکریسی اور عدلیہ کو ایک طرف کھڑے ہو جانا تھا اور انقلابی نواز شریف کو دوسری طرف، تبھی تو شپٹا کر مانہوں نے نئے نظام کے خدوخال واضح کئے بغیر نئے نظام کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ موجودہ نظام جب تک رہے گا حالات درست نہیں ہو سکتے، حالانکہ نظام سے کہیں زیادہ برا وہ طریقہ کار تھا جو میاں نواز شریف نے اپنایا تھا (یہ صریحاً غلط تھا) نظام میں واقعی بہت سی خرابیاں ہیں مگر متبادل نظام کے واضح خطوط دینا بھی تو قیادت ہی کا کام ہے۔

اس کے بعد میاں نواز شریف نے دستور کے ان حصوں کی درستی اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا جو جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکمرانی پکی کرنے کے لئے ایک طویل اور پیچیدہ ترمیم جسے عرف عام میں آٹھویں دستوری ترمیم کہتے ہیں، کے ذریعے دستور میں داخل کر دیئے تھے۔ اس ترمیم کے ذریعہ صدر مملکت کو بے محابا اختیارات مل گئے تھے۔ وہ

اسمبلی کو ختم کر سکتا تھا اور چار اسمبلیاں اس کی بھینٹ بھی چڑھیں۔ صدر ہی افواج کے سربراہوں، ججوں اور دیگر بہت سے اعلیٰ عہدیداروں کی تعیناتی کر سکتا یا ہٹا سکتا تھا۔ اس طرح اس ترمیم کے ذریعے ہمارا دستور نہ پارلیمانی رہا تھا اور نہ ہی صدارتی بن سکا تھا۔ خواہ مخواہ ایک دوائی پیدا ہو گئی تھی جو بہت سی سیاسی اور انتظامی خرابیوں کو جنم دے رہی تھی۔ یہ اتنی خراب ترمیم تھی کہ جب نواز شریف نے اسے ختم کرنا چاہا تو تمام سیاسی جماعتوں نے متفق ہو کر ایک آواز سے ختم کر دیا۔ بلکہ خود صدر مملکت فاروق لغاری نے بھی اسے ختم کرنے پر کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ اپنی ساری سیاسی زندگی اس کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ اس تصحیح کا تمام تر سہرا میاں نواز شریف کے سر ہے مگر اولڈ گارڈ نے انہیں اس پر بھی لعن طعن کرنی شروع کر دی اور کہا کہ مارشل لاء کے خلاف یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی جیسے کہ مارشل لاء کوئی ضروری اکسیر شے ہے کہ اس دوائی سے پہلے ذرا کم طاقت کی دوائی ضروری ہونی چاہئے۔ دراصل یہ بات ہمارے دانشوروں کی مصلحت کیش اور خوفزدہ ٹیڑھی سوچ کی غمازی کرتی ہے۔ وہ بری بات کو سیدھا برا کہنے کی بجائے اس کی حجتیں نکال لیتے ہیں اور بدی کے ساتھ صلح کر لیتے ہیں حالانکہ ہمارے مارشل لاؤں نے نہ صرف ملک و دولت کیا بلکہ معاشرے کو بکھیر کر رکھ دیا ہے مگر ہماری بیوروکریسی اور تاناشاہی بہت زیادہ طاقتور ہے اور لوگ ان سے سوتے جاگتے ڈرتے ہیں اور اس خوف کی کیفیت میں اس طرح کا فلسفہ بھی ایجاد کر لیتے ہیں۔ آٹھویں ترمیم ختم کرنا میاں نواز شریف کا بہت بڑا کارنامہ تھا اور رہے گا مگر اس نے بہت ہی زیادہ طاقتور حلقے کو اپنا دشمن بھی بنا لیا۔ شاید بڑے آدمیوں کو رسک بھی بڑے لینے پڑتے ہیں وگرنہ چھوٹے ہی رہ جائیں۔

دستور میں چودھویں ترمیم کر کے بدنام زمانہ ہارس ٹریڈنگ، جس کی بنیاد جنرل ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخاب نے رکھی تھی کو جڑ سے ختم کر دیا۔ نواز شریف نے یہ ترمیم بھی تمام سیاسی جماعتوں کے اتفاق رائے سے کی۔ پاکستان کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا قانون سازی ہوئی ہو چہ جائیکہ دستور کی بنیادی ترمیمیں ہوں جو مکمل اتفاق رائے سے معرض وجود میں آئی ہوں۔ یہ نواز شریف کی حکمت و فراست کا کریڈٹ تھا کہ ایک نہیں دو نہایت ہی بنیادی دستوری ترمیمیں کیں جن سے دستور اور سیاست کے وہ تمام بگاڑ دور ہو گئے جو جنرل ضیاء الحق نے پیدا کر

رکھے تھے۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرعون کے گھر ہی میں موسیٰ کی پرورش کا بندوبست کر دیتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی دستوری خرابیوں کا مصلح اس کا اپنا خاص چہیتا نواز شریف نکلا۔ یہ دو دستوری ترامیم نواز شریف کا عظیم کارنامہ تھا مگر اولڈ گارڈ کو یہ بھی چبھتی رہیں اور آخر کار جب نواز شریف اور سید سجاد علی شاہ کا خصوصی عدالتوں کے حوالہ سے اختلاف ہوا تو نوابزادہ نصر اللہ خان جیسے پرانے سیاستدان نے ایک مخصوص مفاداتی اور سازشی وجہ سے سپریم کورٹ سے انہیں منسوخ کرنے کی درخواست کر دی تا کہ صدر فاروق لغاری کو ایک دفعہ پھر ملک کے منتخب وزیر اعظم اور اسمبلی کو برخواست کرنے کا موقع مل جائے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اس وقت اسمبلی کے ممبر بھی نہیں تھے، پھر بھی یہ درخواست انہوں نے دی اور کسی موجود ممبر نے اس پر سوال تک نہیں اٹھایا اور نہ ہی درخواست میں شمولیت کی۔ نوابزادہ نصر اللہ خان جیسے سازشی ذہنوں کی نواز شریف نے وہ گیم ہی ختم کر دی تھی جس کے سہارے وہ ساری عمر سازشیں کرتے رہے اور حکومت کو گراتے رہے تھے۔ اب وہ بے چارے کیا کریں۔ بارس ٹریڈنگ کے پرانے داؤ پیچ اور مزے کہاں سے لیں۔ صدر ہاؤس کو سازش ہاؤس کیسے بنائیں؟

اولڈ ارڈر کی گھناؤنی سازشوں اور بیمار سوچ کا اندازہ آپ اس بات سے کر لیں کہ اتنے اچھے کام میں بھی انہوں نے کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے اور سپریم کورٹ جیسے موقر ادارے کو بھی خراب کرنے سے باز نہیں رہے۔ خصوصی عدالتوں پر چیف جسٹس اور وزیر اعظم کے اختلاف رائے کا فائدہ اٹھا کر صدر مملکت فوراً بیچ میں کود پڑے تا کہ ایک منتخب حکومت کو عدم استحکام کا شکار کر کے اسے چلتا کیا جائے۔ حالانکہ الیکشن ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور مخصوص مفادات کا وہ طبقہ جو نواز شریف کے انقلاب آفرین اقدامات سے خائف تھا وہ چند تکنیکی بے محل بنیادوں پر رائے عامہ کے اتنے بڑے مینڈیٹ کو یک قلم بے معنی کر کے رکھ دے۔ شاید دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہوتا جب ملک کی سپریم باڈی، پارلیمینٹ کو توہین عدالت کا ملزم بنا کر اس کے منتخب وزیر اعظم کو ملزم اعظم بنا کر پیش کیا گیا ہو اور نواز شریف کی عظمت دیکھنی چاہئے کہ وہ قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہوئے خود عدالت عظمیٰ کا تقدس برقرار رکھنے کے لئے ایک نہیں دو دفعہ پیش ہوئے۔ چشم فلک نے شاید ہی ایسا خوبصورت نظارہ دیکھا ہو مگر

وہاں تو نیکی نہیں چالاکی کا راج تھا۔ فاروق لغاری اور سجاد علی شاہ دوسرے اولڈ گارڈ کی مدد سے تمام کے تمام جمہوری نظام کو تلپٹ کرنے کے درپے تھے اور نواز شریف کا سر قلم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ صدر مملکت کا مواخذہ کیا جائے گا، تب فاروق لغاری کے پاس مستعفی ہونے کے علاوہ اور کوئی بھی چارہ کار نہ رہ گیا۔ اس دوران عدالت عظمیٰ کے ججوں نے محسوس کیا کہ سجاد علی شاہ تمام حدیں ہی عبور کر گئے ہیں اس لئے انصاف کی اس اعلیٰ ترین مسند کو اپنے ہی چیف کی بے انصافی سے بچانا ضروری ہے۔ ان کی اکثریت نے مل کر سجاد علی شاہ کی چھٹی کر دی۔ یوں عوام اور ان کی منتخب پارلیمنٹ اور حکومت کے خلاف پرانے پاپیوں کی سازش ناکام ہوئی مگر اس کشمکش نے نواز شریف کا بہت وقت ضائع کر دیا تھا۔ وہ تو معاشی مسیحا بن کر آیا تھا مگر اولڈ گارڈ نے اسے نہایت چالاکی سے اس طرح کے فتنوں میں جکڑ دیا تھا، اسے کہتے ہیں نیکی کر، مصیبت کھٹ۔

نواز شریف ان الجھنوں سے فارغ ہوتے ہی اپنے اصلی پروگرام تعمیر وطن میں مصروف ہو گئے اور جو جو کام پچھلی دفعہ جہاں چھوڑے تھے وہیں سے دوبارہ شروع کر دیئے۔ باہمت نواز شریف نے لاہور، اسلام آباد موٹر وے چند مہینوں میں مکمل کروا دی اور باقاعدہ چلا دی۔ کشمیر ہائی وے مکمل کروائی، فیض آباد انٹرچینج دونوں میں مکمل کرایا۔ لاہور میں فیروز پور روڈ انڈر پاس، جسے بے نظیر تین سال میں مکمل نہ کروا سکی، اسے تین مہینوں میں مکمل کروایا۔ اسلام آباد، پشاور موٹر وے کو دوبارہ شروع کروایا۔ اسلام آباد، فیصل آباد اور پشاور، نوڈیرو، گوادر موٹر وے پر کام شروع کروا دیا حالانکہ بے نظیر قومی خزانہ بالکل خالی کر گئی تھی مگر باہمت نواز شریف ہمت کا پرکالہ بن کر ہر جگہ پہنچ رہا تھا۔ کراچی، حیدر آباد موٹر وے بھی شروع کروا دی۔ جدھر دیکھیں کام ہی کام ہو رہا تھا۔ ٹیلی کمیونی کیشن کا انقلاب ایک دفعہ پھر رواں دواں تھا۔ نہروں کی مرمت اور بھل صفائی ہو رہی تھی تو باریوں میں ایک دفعہ پھر زمینیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ خصوصی عدالتیں دہشت گردوں کی سزاؤں کا بندوبست کر رہی تھیں تو پولیس کی بہترین تربیت کا اہتمام ہو رہا تھا۔ عدلیہ اور انتظامیہ ایک دفعہ پھر مل جل کر عدل و انصاف اور امن کی بہتری کے لئے کام کر رہی تھیں۔ نواز شریف نے اپنی ہمت اور عزم سے ایک دفعہ پھر جمود توڑ ڈالا تھا اور عوام میں مایوسی کی جگہ امید لینے لگی تھی۔

گھاٹے میں جاتا ٹیلی ویژن اب منافع کما رہا تھا تو بینکوں کی قسمت جاگ اٹھی تھی کہ زبیر سومرو اور شوکت ترین جیسے معروف زمانہ بینکر نواز شریف کی ترغیب پر ملکی بینکوں کی اصلاح اور خدمت کر رہے تھے۔ وہی بینک جو گھاٹے میں جا رہے تھے ان چند لوگوں کی محنت شاقہ اور نواز شریف کی ولولہ انگیز قیادت کی وجہ سے دوبارہ زندہ ہو کر منافع کمانے لگے تھے مگر کتے کی دم ٹیڑھی ہی رہتی ہے چاہے بارہ سال نلکی میں ڈالے رکھیں، والی بات تھی کہ اولڈ گارڈ اب طرح طرح سے اس میں بھی نقص نکال رہا تھا۔ کبھی بڑی بڑی تنخواہوں پر انگلیاں اٹھ رہی تھیں تو کبھی بسا لکل بے وجود کمیشنوں اور رشوتوں کے طومار باندھے جا رہے تھے۔ ہر اچھے کام کے پیچھے رشوت ڈھونڈی جا رہی تھی اور بے پر کی اڑائی جا رہی تھی۔ اس دوران مخالفوں نے کتنے ہی جھوٹے ریفرنس داغے، مگر ایک بھی ثبوت سامنے نہ لا سکے۔ مقصد دھول اڑانا تھا کہ کچھ نہ کچھ دھول تو حسین سے حسین چہرے پر بھی چمٹ ہی جائے گی اور تو اور نواز شریف فیملی کے خلاف قرضوں اور نادہندگیوں کا بالکل بے جواز پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ سب قرض یہی ہڑپ کر رہے ہیں اور خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں حالانکہ اس دفعہ تو انہوں نے اپنے تمام کاروبار کا باقاعدہ شروع ہی میں پبلک اعلان کر کے مزید کاروبار بڑھانے سے پرہیز کا عندیہ بھی دیدیا تھا۔ یار لوگوں کو کیا وہ تو انہیں بالکل جوگی دیکھنا چاہتے تھے اور اگر وہ جوگی بھی بن جاتے تب بھی کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہی نکال لیتے۔ اس بے بنیاد پروپیگنڈہ کا اتنا برا اثر ہوا کہ بہت بڑے بڑے ذمہ داروں کو یہ کہتے سنا گیا کہ اس فیملی کے علاوہ کسی اور کو ادھار ملتا ہی نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ سب سے بڑے نادہندہ ہیں۔ لوگوں میں یہ باتیں زہر کی طرح پھیل رہی تھیں حالانکہ بالکل غلط تھیں اور اب جبکہ وہ اقتدار میں نہیں ہیں تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے مگر کردار کشی کا کمال دیکھئے کہ بدنام تو ہو لئے۔ ہائے ری سیاست تیری کون سی کل سیدھی۔ سیاست بیک وقت اونٹ بھی ہے اور گدھا بھی۔

میاں نواز شریف نے صرف ترقیاتی کام ہی نہیں کئے بلکہ بہت سے بنیادی، مشکل اور مضبوط کام اور فیصلے بھی کئے۔ ملک کے اندر بہت عرصہ سے مردم شمار نہیں ہو سکی تھی اور سب لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ کام کوئی سیاسی حکومت نہیں کروا سکتی۔ مردم شمار کے بارے میں صوبوں کے درمیان شدید اختلافات تھے کیونکہ یہ تمام بنیادی

فیصلوں کی بنیاد ہے۔ مالی ایوارڈ ہو یا پانی کی تقسیم، اسمبلی میں نشستوں کا مسئلہ ہو یا ترقیاتی کام ہوں سب کا صوبائی تناسب ان اعداد و شمار ہی سے ممکن ہے، مگر تمام تر رکاوٹوں، احتجاجوں اور دھمکیوں کے باوجود افواج پاکستان کی مدد سے یہ مشکل کام نواز شریف نے نہایت عمدگی سے کروا دیا۔ میاں نواز شریف کی حکومت واقعی ایک مضبوط اور پر عزم حکومت تھی۔

ایسا ہی ایک مسئلہ آئی پی پیز کا تھا جن کی وجہ سے تمام ملک کی اکانومی ہل کر رہ گئی تھی، بے نظیر حکومت نے اپنے موج میلے کے لئے پاکستان کی اکانومی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں اور ریاستی گارنٹیاں دیکر آئندہ تمام حکومتوں کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ میاں نواز شریف نے تمام بین الاقوامی دباؤ کے باوجود آٹھ سے زیادہ ایسی کمپنیوں کے ساتھ اس طرح معاملات طے کئے کہ ریٹ کم کروا لئے۔ چند ایک کمپنیوں کا مسئلہ ابھی باقی ہے مگر یہ بہت ہی ٹیڑھی کھیر تھی جس نے ہماری معیشت کی تمام انگلیاں ٹیڑھی ہی نہیں توڑ کر رکھ دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواز شریف کی ہزار باہمت کوششوں کے باوجود ہماری اکانومی اٹھ ہی نہیں رہی۔ تاجر طبقہ پچھلے دور کے نواز شریف کو ڈھونڈتا رہا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت مایوس بھی ہوا مگر اسے کیا معلوم کہ بے نظیر اپنی ذاتی حرص کی وجہ سے کیا کیا قیامتیں ڈھا گئی۔ علاوہ ازیں جنوب مشرقی ایشیا خاص ور پر جاپان، ہانگ کانگ، انڈونیشیا اور ملائیشیا کے مندے نے بھی اس دوران ہماری معیشت کو اٹھنے نہ دیا۔ یہ قصور نواز شریف کا نہیں حالات کا تھا مگر لوگ تجزیوں کی بجائے معجزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ اب پہلے دور جیسا معجزہ ممکن نہ رہا اور نواز شریف مجبوراً معاشی مسیحا نہ بن سکا۔ یہ حالات کا جبر تھا، خلوص یا کوشش کی کمی نہیں تھی۔ اسی صورت میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک نے اپنی انوکی لاک کا کرتب دکھایا اور بہت سے مالی دباؤ کے علاوہ پاکستان کو جی ایس ٹی لگانے پر مجبور کیا جس سے تمام تاجر طبقہ ناراض ہو گیا مگر پھر بھی میاں صاحب نے کوئی نہ کوئی صورت تاجروں کے مسئلوں کے حل کی نکال ہی لی تھی کیونکہ وہ ان کی زبان اور جذبوں کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد موجودہ انتظامیہ فوجی ڈنڈا رکھنے کے باوجود اس معاملہ میں کافی ناکام ہوتی نظر آ رہی ہے۔

میاں نواز شریف کے دور میں بہت زیادہ پرانے اور مشکل مسئلوں پر مضبوط ہاتھ ڈالا گیا۔ بہت عرصہ سے ہمارے ہاں ایسے کاغذی یا بھوت سکول چلے آ رہے تھے جن کی عمارتوں، مرمتوں اور عملے کی تنخواہ کے نام پر کروڑوں نہیں اربوں روپے لگاتار کھائے جا رہے تھے نواز شریف نے اپنے عزم عظیم اور پختہ ارادوں سے یہ سب کچھ ختم کر کے ایک بہت بڑے مافیئے کو نہایت کامیابی سے ختم کر دیا مگر اپنی دشمنیوں کے دائرے وسیع کر لئے، وہ عظیم محب وطن تھا اور وہ ملک کے لئے یہ سب خطرات مول لے رہا تھا اور یار لوگ الزام لگا رہے تھے کہ وہ بہت خود سر اور منہ زور مطلق العنان بادشاہ بن رہا ہے اب آپ سوچیں اس طرح کا مافیا یہ نہیں کہے گا تو اور کیا کہے گا۔ اسے کہتے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

یہی صورتحال بجلی چوروں پر ہاتھ ڈالنے سے ہوئی کہ جب فوج کی مدد سے بہت سے بجلی چور پکڑے گئے جن میں بڑے بڑے کارخانے دار اور تاجر ہی نہیں مسلم لیگ کے اپنے وزراء تک بھی آ گئے تو یہی آواز اٹھی کہ میاں نواز شریف مطلق العنان بادشاہ بن رہا ہے حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ میاں معاج دین، ذوالفقار کھوسہ، سیدہ عابدہ حسین اور بہت سے دوسرے لوگوں کی وزارتیں داؤ پر لگ گئی تھیں مگر پھر بھی شور تھا کہ نواز شریف ڈکٹیٹر بنتا جا رہا ہے۔ کسی کی سنتا نہیں ہے۔ وہ محض یکطرفہ احتساب کر رہا ہے۔ ظلم کر رہا ہے، ہائے وہ ہارس ٹریڈنگ کے دن کہاں گئے۔ وہ موج میلہ کہاں گیا، وہ پلاٹ پرمٹ اور مراعات کہاں گئیں جن کے دروازے جنرل ضیاء الحق کا غیر جماعتی انتخاب کھول گیا تھا۔ یوں نواز شریف اچھے اور اصلاحی کاموں کے شوق میں ایک جوابی شکنجے، شکوؤں اور حملوں کے جال میں پھنس کر ان لوگوں کی نگاہ میں ایک آمر بنتا جا رہا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک شور اٹھا دیا کہ وہ اداروں کو تباہ کر کے اپنی ذاتی سلطنت بنا رہا ہے حالانکہ بے چارہ نواز شریف اپنے تئیں اداروں کی مرمت اور بحالی کی صورتیں نکال رہا تھا مگر مافیا تھا کہ بہت Vocal اس کے ملکی درد کو کیا کیا شکل نہ دیدی گئی۔ یہاں تک کہ قرآن وسنت کو دستور کے ذریعہ ملک کا اعلیٰ ترین قانون بنانے کا ارادہ ظاہر کرنے تک کو یار لوگوں نے ابلیسی دلائل کے ذریعے کیا سے کیا بنا ڈالا، اور برملا کہنا شروع کر دیا کہ اس طرح بھی وہ اپنی ذاتی مطلق العنانی کی راہیں

تراش رہا ہے۔ واہ رے واہ دلیل بازی اور دلیل کشی۔ اسے کہتے ہیں دور کی کوڑی لانا۔ ہمارا مافیا بہت شاطر مزاج واقع ہوا ہے۔

ہمارے ہاں احتساب کی بہت باتیں ہوتی ہیں مگر احتساب کرتا کوئی نہیں، اگر پچھلے 50 سالوں میں عملی طور پر کسی نے کیا ہے تو صرف نواز شریف نے کیا ہے کہ ایک سابق وزیر اعظم (بینظیر بھٹو) اور اس کا خاوند باقاعدہ ہائیکورٹ سے سزایاب ہو چکے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کو بھی سزا ہو چکی ہے مگر بے نظیر کی چمک دمک کے سامنے وہ نظر ہی نہیں آ رہے۔ میاں منظور وٹو سابق وزیر اعلیٰ پنجاب کے خلاف اتنی ٹھوس شہادتیں ملیں کہ ہائیکورٹ نے ان کی ضمانت صرف اس لئے نہ لی کہ شہادتیں زبردست ہیں۔ ایسے معاملات میں شہادتیں لینا اور اکٹھی کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ سینیٹر سیف الرحمٰن کو آپ لاکھ برا کہیں انہوں نے اس کام کو کمال مہارت اور دل جمعی سے کیا۔ رہ گیا سوال ان پر الٹے الزامات کا تو ایسے کاموں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ میرا ساری عمر کا تجربہ محکمہ پولیس اور تفتیش سے وابستہ ہے۔ وائٹ کالر مجرم تو بڑے چرب زبان اور عیار ہوتے ہیں۔ عام ڈاکو، قاتل اور مجرمان بھی یہی کہتے آئے ہیں جب بھی پکڑے جاتے ہیں وہ ضرور جوابی الزام لگاتے ہیں اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ جوابی الزام ان کا باقاعدہ طریقہ واردات ہے۔ اسی لئے تو آپ کا محکمہ پولیس اتنا زیادہ بدنام رہتا ہے۔ کچھ کرتوتیں بھی ضرور ایسی ہوتی ہیں مگر اس میں بہت سے پارسا بھی رگڑے جاتے ہیں۔ سیف الرحمٰن شاید پارسا نہ ہو مگر شاید اتنا بڑا شیطان بھی نہیں ہے کہ جتنا اسے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نے اتنا زیادہ اور اچھا کام کیا ہے کہ موجودہ احتساب بیورو بھی اس کے کئے کام کا ابھی تک کریڈٹ لے رہا ہے اور تمام تر موجودہ احتساب اسی کی محنت کا پھل ہے۔ اس کے غیر ہر دلعزیز ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے دلجمعی کے ساتھ احتساب کیا۔ نہ کرتا تو شاید پاپولر ہوتا وہ خود مسلم لیگ کے اندر بھی بدنام ہوا کہ وہاں بھی بڑوں بڑوں پر ہاتھ ڈال لیا تھا تاکہ احتساب یکطرفہ نظر نہ آئے۔ کئی وزیروں کی چھٹی ہو گئی مگر دشمن کب خوش ہوتے ہیں جب تک تمام محتسب ہی اندر نہ ہو جائیں اور اب شاید خوش ہیں کہ ان کی ''مصیبتوں'' کی جڑ میاں محمد نواز شریف بھی جیل میں ہے۔ ان کے مخالفوں کو ایک زبردست

نفسیاتی تسکین مل رہی ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے ان کی حکومت ختم ہونے پر خوب خوشیاں منائیں اور پوری دنیا میں تاثر قائم ہوا کہ میاں نواز شریف کی حکومت بہت زیادہ Undopulas تھی حالانکہ یہ بات نہیں۔ ان کی حکومت مافیا کو بلکہ بہت سے مافیوں کو پسند نہیں تھی۔ رہی بات یکطرفہ احتساب کی تو ایک تو یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ احتساب دونوں طرف کا ہو رہا تھا اور ہماری تاریخ میں پہلی دفعہ ہو رہا تھا مگر آپ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آپ حسینؓ اور یزید کو ایک ہی ترازو میں تولیں اور ہمارے پولیس والوں کی طرح ظالم اور مظلوم دونوں کو انسدادی کارروائی کے لئے پکڑتے رہیں۔ بھئی میاں نواز شریف اور ان کی فیملی کا احتساب کیا عذاب بے نظیر کے دور حکومت میں لگاتار تین سال تک ہوتا رہا۔ ہماری بھی عجیب منطق ہے کہ نیکی اور بدی کو ایک جیسا کیوں نہیں دیکھا جا رہا۔ قاتل اور مقتول کو برابر کیوں نہیں رکھا جا رہا کہ ہم مساوات کے نعرہ بازوں میں سے ہیں۔

لاء اینڈ آرڈر پر بہت باتیں ہوتی ہیں، امن عامہ کی پیمائش کے پیمانے بہت نازک اور ناقص ہوتے ہیں جو دکھ گزر جائے وہ مندمل ہو جاتا ہے۔ ہم اس کی تلخی بھول جاتے ہیں اور جو زخم تازہ تازہ ہو وہ ہمیں بہت تکلیف دیتا ہے چونکہ بدامنی ایک جاری ساری اور متحرک شے کا نام ہے اس لئے موجود تکلیف ہمیشہ سامنے رہتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس کا Objective تجزیہ کر پاتے ہیں۔ بینظیر کی بدعنوان اور بدعمل حکومت نے امن عامہ کا ستیاناس کر دیا تھا اور ایک بدترین لاء اینڈ آرڈر میاں نواز شریف کو ورثے میں ملا تھا اگر امن عامہ ایک دفعہ بگڑ کر ہاتھ سے نکل جائے اور جرائم لوگوں کے منہ کو لگ جائیں تو انہیں دوبارہ کنٹرول کرنے کے لئے بہت زیادہ وقت درکار ہوتا ہے مگر میاں نواز شریف کی حکومت نے اس سلسلہ میں بہت سخت اور سریع قدم اٹھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے چند مہینوں میں قتل، ڈاکہ زنی، سرقہ بالجبر اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کے واقعات میں کمی آنا شروع ہو گئی۔ اس معاملہ میں خاص طور پر میاں شہباز شریف نے صوبہ پنجاب میں بہت زبردست کام کیا اور بہت زیادہ دہشت گرد جہنم رسید ہو گئے۔ پولیس کو زبردست انداز میں جھنجھوڑا گیا اور خوابیدہ انتظامیہ کو جگایا گیا۔ ان کی بہترین تربیت کا اہتمام ہوا اور ایلیٹ فورس جیسی نہایت ہی مستعد پولیس تیار کی گئی۔ اخلاقی تربیت پر بے انتہا زور دیا گیا اور

تھانہ کلچر تبدیل کرنے کے لئے ان کا ورک کلچر بہتر کیا گیا۔ تنخواہیں بڑھائیں اور اخلاقی تربیت کے لئے بہترین معلموں کا اہتمام ہوا۔ میاں شہباز شریف نے اس معاملہ میں کمال کر دیا اور پچھلے پورے پچاس سال وہ کام نہیں ہو سکے تھے جو میاں شہباز شریف نے چند مہینوں میں کر دکھائے۔ میں اپنے بھرپور ذاتی تجربے سے یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اتنے اچھے اور نیک کام پہلے کبھی کسی چیف منسٹر یا گورنر نے کبھی نہیں کئے تھے۔

یہاں بات میاں شہباز شریف کی ہو رہی ہے تو چند باتیں ان کے متعلق بھی عرض کروں گا۔ جس طرف ان کی نگاہ اٹھتی تھی وہ اسے ٹھیک کر کے ہی رہتے تھے۔ ایک زمانے میں امتحانات کا نظام بوٹی مافیا کی وجہ سے درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا اور ہمارے تعلیمی اداروں کی ڈگریوں کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ جعلی امتحان ہو رہے تھے۔ امتحانی پرچے افشاء ہو جاتے تھے۔ غلط اور جعلی رزلٹ نکل رہے تھے اور نقل عام تھی۔ سب کچھ ہی تو تلپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس خرابی کو دور کرنے کی بات تو دور کی ہے اس وقت تو اس خرابی کو دور کرنے کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا مگر میاں شہباز شریف کی اولوالعزمی نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر دکھا دیا۔ وہ دن رات اس پر محنت کر رہے تھے۔ پورے محکمہ تعلیم اور تمام انتظامیہ کو سیدھا کر کے رکھ دیا اور پھر عملی طور پر اس وباء پر قابو پا لیا۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ اس اخلاقی باختگی کے پیچھے کتنا بڑا مافیا تھا۔ میاں شہباز شریف نے اس مافیا کی بالکل پرواہ نہیں کی اور ایک عظیم مرد مومن اسم با مسمیٰ شہباز کی طرح جھپٹا، بجلی کی طرح کوندا اور معاملات نہایت کامیابی سے درست کئے اور اس مافیا کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ میاں شہباز شریف نے انجینئرنگ اور میڈیکل کالج کے داخلوں میں جو گھپلے ہوتے تھے اور جس کی وجہ سے بوٹی مافیا کو فروغ مل رہا تھا وہ نظام بھی درست کیا اور ایک نہایت ہی جدید اور Objective انٹری ٹیسٹ کا طریقہ متعارف کرایا۔ یعنی انہوں نے صرف ڈنڈے سے کام نہیں لیا بھرپور فراست کا مظاہرہ بھی کیا۔ یہ صلاحیتیں بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں اور میاں برادران میں یہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ مضبوط بھی ہیں تو مدبر بھی، خدا ترس ہیں تو بہادر بھی، محب وطن ہیں اور ہوش مند بھی۔ خردمند ہیں تو درد بھی، اک مجموعہ کمال و جمال ہیں۔ سخت بھی ہیں اور نہایت نرم بھی۔ انتظامیہ کو چوکس کرنے کے لئے اپنی نرم خو کے خلاف درشت اور سخت بہروپ اپنا کر بیوروکریسی کو خلاف

بھی کرلیا، کبھی الٹا لٹکایا تو نہیں مگر دھمکیاں ضرور دیتے رہے کہ اپنی عادت کے خلاف یہ ضروری سمجھا گیا۔ میاں شہباز شریف بہت سختی کرتے اور بعد میں بہت دیر تک دکھی رہتے اور کہتے مجھے یہ رویہ ملک کی بہتری کے لئے اپنانا پڑتا ہے۔ اندر سے وہ بہت بھلے اور سادے تھے۔ تنہائی میں اکثر زار و قطار رو دیتے اور توبہ توبہ کرتے رہتے۔

یہاں میں آپ کو میاں شہباز شریف کے جذبات اور حرکت پذیری کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنانا چاہوں گا۔ لاہور میں ایک فلاحی تنظیم ٹیڈز Tedds یعنی مستحق طلبہ کی تعلیم و ترقی کا ٹرسٹ ہے۔ طاہر یوسف ایڈووکیٹ اس کے روح رواں ہیں اور انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ناداد مگر ذہین طلبہ کی اعلیٰ معیاری تعلیم کے لئے ایک ٹرسٹ بنا کر بالکل مفت تعلیم کا بندوبست کر رکھا ہے۔ یہ کاغذی تنظیم نہیں ہے۔ اس نے ایک ٹرسٹ سکول نمونے کے طور پر ٹھوکر نیاز بیگ لاہور میں دی ٹرسٹ سکول کے نام سے کھول رکھا ہے تاکہ نام سے بھی کسی نمود و نمائش کا اظہار نہ ہو۔ وہ سکول ہر شعبہ میں بہترین طلبہ پیدا کر رہا ہے اور اس کا معیار ایچی سن کالج سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ بلڈنگ و مادی اسباب نہیں تعلیمی اور اخلاقی معیار کی بات کر رہا ہوں۔ طاہر یوسف اس کار خیر کو سارے ملک خاص طور پر کم ترقی یافتہ علاقوں تک لوگوں کے اشتراک سے پھیلانا چاہتے ہیں اور حکومت سے کوئی مدد نہیں لینا چاہتے تاکہ عوام میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی استطاعت آجائے لہٰذا یہ کام وہ بہت دلجمعی سے کر رہے ہیں۔ ایک تقریب میں میاں شہباز شریف، طاہر یوسف اور میں بھی موجود تھا جب طاہر یوسف صاحب نے اور باتوں کے علاوہ معیاری تعلیمی فروغ کے لئے طلبہ کے وظائف اور مفت انتظامات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ ان سکولوں کے معلمین جن کے سکولوں سے بہترین طلبہ ٹرسٹ سکول میں داخلے کے لئے آتے ہیں، کی قدر افزائی کے لئے بڑے بڑے انعامات بھی دیتے ہیں تاکہ فیڈنگ سکولوں میں معیاری تعلیم کے لئے ایک صحت مند مقابلہ پیدا ہو جائے اور یوں تعلیم کا ذوق شوق عام ہو۔ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور تفصیلی نوٹس لیتے رہے۔ طاہر یوسف سے پوچھا کہ میں آپ کے سکول کی کیسے مدد کر سکتا ہوں۔ جو کہیں میں کروں گا مگر طاہر نے کہا کہ وہ سرکاری مدد پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ لوگوں کے اندر سے اٹھتا جوش و خروش

دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لئے میاں شہباز شریف اپنی ذاتی حیثیت میں اس کار خیر سے منسلک ہو جائیں تو بہتر ہے۔ ہمیں چیف منسٹر نہیں شہباز شریف چاہئے ظاہر ہے وہ بہت خوش ہوئے مگر ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اس سے اندازہ لگائیے پھر پنجاب کا پورا محکمہ تعلیم تعلیمی فروغ کے لئے طاہر یوسفی نسخہ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ طاہر یوسف نے خود ایک لائحہ عمل تیار کر کے دیا جس کا نام برین آف پاکستان رکھنا مقصود تھا کہ ہر قریہ اور ہر سکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹیوں تک برین آف پاکستان کے لئے مقابلے ہوتے تھے مگر چند دنوں بعد میاں شہباز شریف جیل چلے گئے اور وہ سکیم شاید اب سرکاری دفاتر میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔

میاں شہباز شریف نے پنجاب میں کمال کام کئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید ترین ادارے بنائے، بہترین معیاری سڑکیں اور پل بنوائے اوور ہیڈ برجز اور انڈر پاسوں کا جال بچھا دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پاس کا انڈر پاس تین مہینے سے بھی کم عرصہ میں تعمیر کروا کر سب کو انگشت بدنداں کر دیا۔ جیل روڈ اور گلبرگ روڈ ایسی بنائی کہ یورپ یاد آتا ہے، اور تو اور شیر پاؤ پل کو سیدھا کروا دیا۔ گلبرگ اور چھاؤنی کو ملانے والے ریل کے اوپر سے گزرتے پل کی مکمل تعمیر چند مہینوں میں کروا کر سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس پر ٹھیکیدار مافیا جس کی آمدنی اور وہ افسر جن کے کمیشنوں پر زد پڑی انہوں نے شور مچا دیا کہ شہباز شریف کی ایک محبوبہ یا منکوحہ ہے جو ریلوے لائن کے اس پار رہتی ہے اور اب سوہنی مہینوال کے دور کی طرح دریا نہیں بلکہ درمیان میں ریلوے لائن پڑتی ہے، اس لئے شہباز شریف نے اپنی سوہنی کی خاطر یہ پل اتنی تیزی سے بنوایا ہے۔ مافیا کی مت پوچھئے وہ کیا کیا رنگ بھر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی ناجائز آمدن پر اس طرح کے "شیطان" شہباز لات مار دیتے ہیں۔ جب لاہور میں فوج کی مدد سے بہت ہی اعلیٰ معیاری سڑکیں دھڑا دھڑ بننے لگیں تو اہل نظر نے پتہ کیا کہ یہ پیسہ کہاں سے آ رہا ہے حالانکہ خزانہ خالی ہے اور معیشت خاصی خراب ہے۔ معلوم ہوا کہ لاہور کارپوریشن میں اس مد میں 40 کروڑ روپے ہر سال رکھے جاتے ہیں مگر یار لوگ سب کھا جاتے ہیں۔ سب کام کاغذوں پر ہوتا ہے۔ یہی یا اس سے بھی بدتر صورتحال ایل ڈی اے کی ہے، شہباز شریف کا کمال صرف یہ تھا کہ انہوں نے یہ سارا کام روایتی انجینئروں اور

ٹھیکیداروں کی اب آرمی کور اور عیسپاک سے کروانا شروع کر دیا۔ ان بیروزگار ٹھیکیداروں اور انجینئروں کے پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے اور وہ پراگندہ پروپیگنڈے کی دال بانٹ رہے ہیں اور کھا رہے ہیں۔ انہیں شہباز شریف اب برا لگتا ہے، بدتمیز لگتا ہے بلکہ زہر لگتا ہے اور اس کے خلاف دن رات گالیوں کی تسبیح کر رہے ہیں، اسے کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم۔

مخالفوں سے اور کچھ نہ بن سکا تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب کام لاہور میں ہو رہے ہیں، باقی پنجاب کو تو میاں برادران بالکل بھول ہی چکے ہیں۔ یہ صرف اپنے حلقے نیابت میں کام کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب کام اس سے بھی بڑھ کر پنجاب کے سارے شہروں اور گاؤں میں ہو رہے تھے۔ ملتان، فیصل آباد اور راولپنڈی سے لے کر میاں چنوں تک کی کشادہ سڑکیں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، لوگ دیکھ سکتے ہیں اور دیکھ رہے تھے مگر مخالفوں کے مضامین و مزاج دیکھنے چاہئیں حقیقت سے آنکھیں چرائی جا رہی تھیں اور کچھ نہ بن پائے تو کم از کم بدنامی ہی کرتے رہیں کہ جناب ٹھیک ہے بہت کام ہو رہے ہیں مگر اس لئے کہ پیسہ بھی تو بنا رہے ہیں۔ وہم اور بہتان بازی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ غیبت و غرور انسان کو اندھا کر دیتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خودساختہ دنیا بنا کر اسی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ دوسروں کے اچھے کاموں کو بھی بری نگاہ سے دیکھتے ہیں اسے کہتے ہیں نظر لگنا اور میاں برادران کو ضرور ہی نظر بد لگی ہے۔

اس طرح اور بھی بہت سے تعمیر و ترقی کے کام ہیں جنہیں گنوانا مقصود نہیں، اتنے کام کہ محفل فہرست تیار کرتے کرتے کئی دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ کہیں شاہرات ہیں تو کہیں سکول، کہیں فلائی اوور بننے کے منصوبے ہیں تو کہیں انڈر پاس بن رہے ہیں۔ کہیں غرباء اور مزدوروں کے لئے مکانات بن رہے ہیں تو کہیں کڈنی ہسپتال، کہیں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا فروغ ہے تو کہیں عامتہ الناس کے لئے پارکیں اور سیر گاہیں بن رہی ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں حرکت پذیری ہی حرکت پذیری۔ نہ خود آرام کرتے ہیں نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتے ہیں۔ یہ حرکت پذیری اور تبدیلی اولڈ گارڈ کو پسند نہیں کہ پھر ان کے چراغوں میں روشنی نہیں رہ جائے گی۔

مشکل منزل

تعمیر و ترقی کے لئے امن درکار ہے اور جنوبی ایشیا میں اس وقت تک با مقصد امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ کھڑا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان بہت سی دیواریں کھڑی ہیں۔ یہ دو ملک ہی نہیں بلکہ دو مختلف قومیں ہیں اور ان کا کبھی کوئی بھی اشتراک عمل یا مشترکہ حکمت عملی ہو ہی نہیں سکتی۔ زبان اور نسل کا قرب اتنا ہی غیر حقیقی ہے جتنا کہ قرب مشرکین مکہ اور یثرب کے مسلمانوں میں تھا۔ یہ دو بالکل ہی مختلف قومیں ہیں لیکن ہیں ایک دوسرے کی پڑوسی اور جہاں پڑوس کی وجہ سے اشتراک عمل ممکن بھی ہے وہ مسئلہ کشمیر حل ہوئے بغیر کسی بھی صورت آگے نہیں بڑھ سکتا وہ آپس کا میل ملاپ ہو یا تجارت کا معاملہ ہو، ہر وقت جنگ بھی پاگل پن ہے تو بنیادی مسئلہ حل کئے بغیر امن بھی ممکن نہیں اور امن دونوں ملکوں کی ضرورت ہے جس کے نہ ہونے سے دونوں ملک غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ وسائل کا ضیاع ہو رہا ہے اور تعمیر و ترقی ناممکن ہے مگر تعمیر وطن نواز شریف کا خواب ہے اور امن ان کی منزل، لیکن یہ منزل ہے بہت مشکل۔

اس مشکل منزل کے حصول کے لئے وہ پہلے دور میں بھی کام کرتے رہے اور اب بھی ان کی نگاہیں وہیں ٹکی ہوئی تھیں۔ مشرق کی طرف بھارت ہے تو مغرب کی طرف افغانستان اور اس کے پیچھے وسط ایشیا کی تازہ آزاد مسلمان مملکتیں، شکر ہے ایران سے ہمارے تعلقات شروع ہی سے بہت اچھے ہیں اور چین ہمارا بہت ہی قریبی دوست ہے۔ نواز شریف امریکہ، یورپ بلکہ تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود افغانستان میں طالبان کی حقیقی حکومت جس کا 90 فیصد علاقہ پر قبضہ ہے کو تسلیم کر لیتے ہیں وہیں سے وسط ایشیا کو راہیں وا ہوتی ہیں۔ یہ باتیں بھارت کو پسند نہیں ہیں کہ اس سے پاکستان کو گہرائی Depth ملتی ہے۔ بھارت تلملا کر اپنے پرانے داؤ پیچ استعمال کر رہا ہے اور وہاں

ہمارا اثر ورسوخ ختم یا کم از کم کرنا چاہتا ہے مگر نواز شریف کی پہل قدمی ہمارے کام آتی ہے اور بھارت اپنا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ وسط ایشیا انرجی، معدنیات اور تجارت کا ایک سمندر ہے مگر اس کے پاس راستہ نہیں ہے۔ راستہ ہے تو پاکستان ہی کے ذریعے ہے یا کسی حد تک ایران کے راستے مگر سب سے چھوٹا اور سستا راستہ پاکستان ہی ہے اور پاکستان نواز شریف کی دوررس نگاہوں میں ان رستوں سے فائدہ لینا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے پہلے ہی خشکی پر ایئر ویز کی صورت میں نہر سویز بلکہ انہار بنا رہا ہے لہٰذا بھارت اور اس کے پٹھوؤں سے کچھ اور نہیں بن پاتا تو وہ نواز شریف کی راہیں کھوٹی کرنے کے لئے افغانستان، طالبان اور اسامہ بن لادن کے حوالہ سے دہشت گردی کے الزامات کی گندی دھول اڑاتے ہیں اور اس کے ڈانڈے کشمیر میں جاری جہاد سے جا ملاتے ہیں۔ بھارت کی پرانی عادت ہے کہ وہ اپنی آنکھ کے شہتیر کو نہیں دیکھ سکتا مگر دوسروں کی آنکھ کے تنکے گنتا اور گنواتا ہے اور پاکستان کو دہشت گرد قرار دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ کو بہکاتا ہے کہ پاکستان کی آج کل کی نفسیات پر بنیاد پرستی اور دہشت گردی بہت چھائی ہوئی ہے۔

اس بھارتی مکاری اور چال بازی کا ایک علاج تو جوابی پروپیگنڈہ ہے اور دوسرا بھارت کو مدافعتی پوزیشن لینے پر مجبور کرنے کی راہ ہے۔ نواز شریف اپنی سرعت مزاجی اور پہل قدمی سے دوسری خوبصورت تدبیر اپناتا ہے اور امن کا پتہ پھینکتا ہے کہ پاکستان بھارت کے ساتھ اپنے تمام اختلافات بامقصد اور برابری کی بنیاد پر پرامن طریقے سے گفت وشنید کے ذریعے طے کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھی گفت وشنید کے ذریعے طے کرنا چاہتا ہے اور کہ کشمیر کا مسئلہ بھی گفت وشنید سے حل ہو نہ کہ جنگ سے۔ تین جنگیں ہو چکیں، بھارت کو کچھ ملا نہ پاکستان کو۔ آیئے خلوص قلب سے تمام مسئلے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سرفہرست کشمیر ہوگا۔ نواز شریف یہ نقطہ ہر جگہ اٹھاتا ہے، کلنٹن کو ساتھ ملاتا ہے ٹونی بلیئر سے دوستی بڑھاتا ہے اسلامی دنیا سے تو اس کے قریبی مراسم ہیں ہی۔ یوں وہ پاکستان کو دوسروں کی نگاہ میں دہشت گردی نہیں ایک نہایت ہی ذمہ دار اور امن کے خواہاں ملک کا مقام دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ صدر امریکہ کشمیر کو ایک متنازعہ مسئلہ ماننے پر تیار ہو جاتا ہے اور بھارت کو مجبور کرتا ہے کہ

وہ پاکستان کے ساتھ گفت وشنید کرے اور کشمیر کے مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرے جس پر وہ کبھی بات کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ ہماری 1971ء کی شکست کے بعد پہلا موقع تھا کہ نواز شریف کی حکمت کی وجہ سے بھارت کشمیر پر بات چیت کے لئے تیار ہوا تھا۔ اس وقت بھارت میں اس کی تاریخ کا سب سے زیادہ چالاک آدمی آئی کے گجرال وزیراعظم تھا وہ چکرا کر رہ گیا کہ یہ نوجوان کس طرح اس پر سبقت لے گیا۔ ایک وقت تھا کہ بھارت امن کا پرچارک اور بین الاقوامی امن بھکشو بنا ہوا تھا اور اب پاکستان میدان مار رہا ہے۔ گجرات نے بھی اپنا پرفریب بین الاقوامی منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق بھارت کے پڑوسی ممالک نیپال، بھوٹان، سری لنکا، بنگلہ دیش اور مالدیپ سے امن کی پینگیں بڑھانا تھا مگر امن کی یہ بانسری بجانا اب بہت لیٹ ہو گیا تھا۔ اصل مقصد پاکستان کے نوجوان وزیراعظم کے امن حملہ کے سامنے بند باندھنا تھا۔ نواز شریف دنیا کی نگاہوں میں اب بھارت سے بہت آگے نکل گیا تھا اور اپنے بین الاقوامی، خارجی بہت سے مسائل کا امن حملہ سے علاج کر گیا تھا۔ ہمارا اولڈ گارڈ چونکہ بہت زیادہ کوتاہ اندیش ہے اس لئے اس نے اس عظیم پہل قدمی کو بھی الٹے ہی معنی پہنائے اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کر لیا، اس میں بھی اپنے مفادات کے لئے خطرے ڈھونڈنا شروع کر دیئے بلکہ اسے وطن فروشی اور بزدلی تک کے معنی پہنا دیئے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حکمت کی کتاب **"صم بکم عمی فھم لا یرجعو ن"** کے الفاظ استعمال کرتی ہے۔

ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ بھارت میں گجرات کی حکومت گر گئی اور اس کی جگہ ایک کٹر ہندو پرست جماعت بی جے پی کی حکومت برسر اقتدار آ گئی جس کی سربراہی ..... واجپائی کر رہے تھے۔ اس ہندو انتہا پسند جماعت نے آتے ہی پاکستان کے خلاف زبردست جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود بھارت میں رہنے والے مسلمان بھی سہم کر رہ گئے۔ واجپائی حکومت نے آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے 12 مئی 1998ء کو پوکھران کے مقام پر ایٹم بم کے پانچ دھماکے کر ڈالے اور ساری دنیا خاص طور پر امریکہ کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ امریکی انٹیلی جنس کو پتہ ہی نہ چلا اور دھماکہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھارت کا رویہ پاکستان کے

خلاف اور بھی زیادہ جارحانہ ہو گیا حتیٰ کہ ایل کے ایڈوانی نے تو آزاد کشمیر پر چڑھ دوڑنے کی بھی دھمکی دیدی۔ اس صورتحال میں امن کی بات کرنا بے محل ہو کر رہ گیا اور پاکستان کے لئے فیصلہ کی گھڑی آن پہنچی۔ یہ لمحہ To be or not to be کا تھا۔ پاکستان پر بہت زیادہ پریشر آیا کہ وہ جوابی دھماکہ مت کرے۔ کریگا تو معاشی محتاجی اس کا مقدر ہوگی کہ اس کا رواں، رواں بین الاقوامی ساہوکاروں کے قرضوں میں جکڑا ہوا تھا جس کا آغاز ایک خود ساختہ فیلڈ مارشل نے نہایت کوتاہ اندیش اور خود غرضی سے چار عشرے پہلے کیا تھا اور اب تک وہ ہمارے گلے کا پھندا بن چکا ہے۔ اگر پاکستان دھماکہ نہ کرتا تو اس کا وجود ہی خطرے میں تھا۔ یہ ایک بہت ہی مشکل گھڑی تھی۔ صدر کلنٹن اور ٹونی بلیئر نواز شریف کو بار بار ٹیلیفون کر رہے تھے۔ ترغیبات بھی دے رہے تھے اور دھمکیاں بھی۔ مقصد تھا کہ پاکستان دھماکہ نہ کرے، اب فیصلہ نواز شریف کو کرنا تھا۔ اس وقت کے مقتدرین نے دھماکے کے خلاف مشورہ دیا۔ میں مقتدروں کی بات کر رہا ہوں۔ یہ فیصلہ ذمہ داری کا تھا اور یہ کٹھن فیصلہ قوم کی قیادت نے کرنا تھا اور نواز شریف نے واقعی ایک عظیم قائد کے طور پر 28 مئی کو دھماکہ بلکہ دھماکے کر دیئے اور بھارت کی چند روزہ بالادستی اور بھڑک بازی ختم کر دی مگر صاف نظر لوگوں نے اسی وقت کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب نواز شریف کو خواجہ ناظم الدین بنایا جائے گا۔ کب اور کیسے؟ یہ وقت ہی بتائے گا کیونکہ قومیں مضبوط قیادت ہی سے بنتی ہیں۔ قیادت کے بغیر قومیں کمزور ہی نہیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے تو ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اگر مجھے قائداعظم کی مہلک بیماری کا کچھ عرصہ پہلے پتہ چل جاتا تو میں پاکستان بنانے میں دیر کر دیتا کہ پھر اس قیادت کے بغیر پاکستان بن ہی نہیں سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بھٹو اور ضیاء الحق اسی بم کی وجہ سے مارے گئے اور اب نواز شریف کی باری تھی۔

میاں نواز شریف کی شخصیت کا پرتو ایک مومن کی مانند تھا جو اپنوں کے لئے نرم اور غیروں کے لئے فولاد بن سکتا تھا۔ وہی امن کا پرچارک نواز شریف واجپائی کے مقابلہ میں فولاد بن کر کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ مہاراج آگے چلئے اور مہاراج نہایت آرام سے ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے۔

اس مشکل گھڑی میں میاں نواز شریف کو بہت زیادہ مشکل اور تلخ فیصلے کرنے پڑے اور ان میں سے ایک

بڑا فیصلہ لوگوں کے فارن کرنسی اکاؤنٹس کو منجمد کرنے کا تھا جس سے تمام سرمایہ کاروں کا اعتماد ہل کر رہ گیا۔ نواز شریف اس وقت قطعاً ایمرجنسی نہیں لگا رہے تھے مگر ملک کے تمام لیاقتی بزجمہر انہیں یہی مشورہ دے رہے تھے کہ آپ ضرور یہ کریں۔ تقریر لکھی گئی اور نواز شریف ٹیلی ویژن سٹیشن چل دیئے۔ انہوں نے راستے میں الطاف گوہر صاحب سے بات کی، انہوں نے بھی نواز شریف کے دل کی بات کی سائید کی اور فیصلہ ہوا کہ ایمرجنسی کا اعلان نہیں ہوگا اور ان کی تقریر میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر رات تک تمام وہ بڑے بڑے مالی ماہرین جنہوں نے اس اقدام کی بعد میں مخالفت کی وہ نواز شریف کو ایمرجنسی کے لئے مجبور کرتے رہے اور پھر رات گئے وہ بدبخت فیصلہ ہوا جس کا آج تک نواز شریف کو بے حد افسوس ہے مگر اب کیا ہوتا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ایک بڑے آدمی کی طرح نواز شریف نے یہ الزام کبھی دوسروں پر نہیں تھوپا، اسے اپنے سر لے لیا اور اس کی سیاسی قیمت خود چکائی۔

دھماکے کے بعد پاکستان پر تمام طرف سے پابندیاں عائد ہو گئیں۔ امریکہ روٹھ گیا۔ جی ایٹ ممالک مخالف ہو گئے۔ آئی ایم ایف مکر گیا اور ورلڈ بنک نے منہ پھیر لیا۔ اس وقت نواز شریف کے اسلامی دنیا سے جو ذاتی تعلقات تھے وہ پاکستان کے کام آئے۔ سعودی عرب، کویت اور عرب امارات نے ہمارا ہاتھ تھام لیا اور ملائیشیا خوردنی تیل ادھار دیتا رہا۔ یہ نواز شریف کی ذاتی کامیابی تھی وگرنہ اگر ہم نے جنرل اسلم بیگ ہی کی عراق کویت کشمکش کے دوران والی پالیسی اپنالی ہوتی تو آج ہمارا حشر ہو گیا ہوتا۔ میاں نواز شریف کی اعلیٰ فراست سے وہ مشکل وقت بھی گزر گیا اور وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح سر اٹھائے باد مخالف کے تھپیڑے کھاتے رہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب آہستہ آہستہ ان کے پرانے حریف تو الگ رہے، وہ تمام جماعتیں جو دھماکے پر اتنا اصرار کر رہی تھیں وہ بھی بہانے بہانے ان کے خلاف ہو گئیں۔ کسی نے کوئی بہانہ بنایا اور کسی نے کوئی۔ کوئی انہیں بے ایمان کہنے لگا تو کوئی انہیں آمر و ڈکٹیٹر کے لقب دینے لگا جماعت اسلامی ہو یا ایم کیو ایم، اے این پی ہو یا تحریک انصاف سب نواز شریف کی جان کے درپے تھے مگر وہ چٹان کی طرح ڈٹا رہا اب اس پر اندر سے بھی حملے ہو رہے تھے اور باہر سے بھی۔ ایک دفعہ پھر پاکستان دہشت گردی کے الزامات کی لپیٹ میں تھا اور اندرون ملک ہماری دینی سیاسی

جماعتیں شریعت واسلام کے نفاذ کا ورد کر رہی تھیں۔ جہاد کی باتیں زوروں پر تھیں اور فساد کی وارداتیں زیادہ تھیں۔ یوں اک آندھی چلی اور یکا یک جہادیوں کے کفن پوش جلوس نکلنا شروع ہو گئے اور نواز شریف شریعت بل لے آیا۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہ بل آتے ہی ایک آواز ہر طرف سے اٹھی کہ اب نواز شریف کو مارچ 2000ء سے قبل جانا ہی ہوگا جیسے کہ دھماکہ پر کچھ پیش گوئیاں ہوئی تھیں اور یہ افواہ مسلسل گردش کرتی رہی۔ اسے کہتے ہیں زبان خلق، شاید ایسی باتوں کے پیچھے کچھ حقائق بھی رقصاں ہوں..... حزب اختلاف کی آواز یک دم اونچی ہو گئی اور ہر کوئی نواز شریف کی رخصتی کی نوید سنانے لگ گیا۔ یہی وہ وقت ہے جب جہانگیر کرامت نے نیشنل سکیورٹی کونسل کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اس سے مخالفین کو اور بھی شہ ملی اور معاملات خراب سے خراب تر ہو گئے اور جنرل جہانگیر کرامت کو استعفیٰ دینا پڑا۔ استعفیٰ کے ساتھ ہی تمام آوازیں یکدم مدھم پڑ گئیں لیکن پھر نواز شریف کی منہ زوری اور آمریت کی باتیں ہونے لگیں۔ اس پس منظر میں بیرون ملک بھی کچھ رنگ بدلا۔ انہوں نے دیکھا کہ پاکستان تو نواز شریف کی وجہ سے اپنی بقاء کی جنگ جیت گیا ہے، وہ جھک نہیں رہا ہے، سیاسی طور پر وہ ہل نہیں رہا ہے۔ وہ ایک جوہری طاقت ہے، سی ٹی بی ٹی پر اکڑ گیا ہے۔ کیوں نہ پاکستان اور نواز شریف کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے لہٰذا واشنگٹن متحرک ہو گیا اور بھارت اور پاکستان کے درمیان مصالحت کنندہ کا رول ادا کرنے لگا تاکہ یہ دونوں جوہری طاقتیں دنیا کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ نواز شریف تو پہلے ہی عزت کے ساتھ امن کا خواہاں تھا۔ اس نے کہا کشمیر کا مسئلہ حل کروں میں ہر طرح تیار ہوں۔ راستے بھی کھولوں گا اور تجارت بھی کروں گا مگر میری شرط کشمیر ہے۔ وہی واجپائی جو کشمیر کا نام سننے کا روادار نہیں تھا اور بم کے دھماکے کر رہا تھا کشمیر پر بات کرنے کو تیار ہو گیا بلکہ بس پر بیٹھ کر لاہور آ گیا اور اس جگہ گیا جہاں 1940ء میں پاکستان ریزولیشن پاس ہوا تھا۔ بھارت کا وزیر اعظم یا صاحب اختیار واجپائی پہلا شخص تھا جس نے اس طرح علامتی طور پر پاکستان کے وجود اور فلسفہ کو تسلیم کیا۔ اس سے بڑی پاکستان کی اور کیا جیت ہو سکتی تھی مگر ہمارے اولڈ گارڈ نے اس کو اور ہی معنی پہنائے اور دنگا فساد بھی کیا کیونکہ وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح پورے بین الاقوامی افق کو دیکھ نہیں رہے تھے۔ اس طرح نواز شریف کی ہمت سے

بھارت کے ساتھ ایک دفعہ پھر نہایت عزت واحترام کی فضا میں سلسلہ گفت وشنید شروع ہوا اور کشمیر کا مسئلہ اعلان لاہور میں برفہرست تھا۔ نواز شریف کے مصمم عزم سے واجپائی جیسا کٹر ہندو اور ہندوتو کا پرچارک بھی اب امن کی شاہراہ پر تھا۔ یوں نواز شریف نے اپنا لوہا منوا کر اپنی شرائط پر بھارت سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا۔ اعلانیہ بھی اور بعد میں بعض نازک مسئلوں پر خفیہ بھی کہ ڈپلومیسی میں یہ ضروری ہے۔ ایسے فیصلے گلی کوچوں میں نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے بہت زیادہ ٹھنڈی فضا درکار ہوتی ہے۔

مگر یار لوگوں نے اسے وطن فروشی تک کہہ ڈالا اور جہاد کشمیر کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف قرار دیدیا۔ میں نواز شریف کو جہاد تک جانتا ہوں اور میں انہیں بہت زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں ان پر یہ الزام لگ ہی نہیں سکتا۔ نواز شریف بہت ہی اور طرح کا اور ضرورت سے زیادہ محب وطن انسان ہے وہ تو کشمیر پر فدا ہے، میں بہت کچھ جانتا ہوں جو میں لکھ نہیں سکتا کہ قومی مفاد میں یہی ہے مگر جو الزام اس پر ہمارے پرانے دوستوں نے لگایا وہ بہت ہی زیادہ خلاف حقیقت ہے اور نواز شریف ان باتوں پر زیادہ زبان کھول بھی نہیں سکتا۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ بات نہایت لغو ہے۔ وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا وہ ملک کے بہترین مفاد میں کر رہا تھا اور پرانے مداریوں کی طرح ڈرامے نہیں کر رہا تھا۔ وہ ہزار سالہ جنگ کی بات کر کے اور پولینڈ کی قرارداد پھاڑ کر سرنڈر کی راہیں ہموار نہیں کر رہا تھا۔ وہ امن سے وہ کچھ حاصل کرنا چاہ رہا تھا جو جنگیں نہیں دے سکتی تھیں یا پھر وہ تیاری کا قیمتی وقت خرید رہا تھا۔ بلا تیاری جنگ خودکشی بن جاتی ہے اور بلا مقصد و بے وقت جہاد فساد بن جاتا ہے مگر صد افسوس کہ یار لوگوں نے اتنی نازک بات کو بھی اس کے ذاتی مفاد کا شاخسانہ اور تجارت کا طعنہ بنا دیا، مگر وہ بھول گئے کہ اس چال سے ایک دفعہ پھر بہت عرصے بعد کشمیر کے مسئلہ میں جان پڑی تھی وگرنہ وہ تو بین الاقوامی سرد خانوں کی زینت بن گیا تھا۔

یہ وہ تناظر ہے جس میں کارگل کا معرکہ یا مہم جوئی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مجاہدین کارگل کی چوٹیوں پر بیٹھ کر بھارت کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ مجاہدین کا کمال تھا کہ کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور بھارتی افواج کو اونگھتے ہوئے جالیا۔ بھارت نے بین الاقوامی سرحد پار کرنے کی دھمکی دی اور کشمیر میں اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کا عندیہ بھی

دیا اور دونوں جوہری ملک جوہری جنگ کے دہانے پر آ کھڑے ہوئے۔ امریکہ اپنے تئیں صلح صفائی کے لئے بھاگ پڑا اور پوری دنیا کی توجہ کارگل کی چوٹیوں پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔ توپوں کے دہانے کھل گئے اور بیلی کاپٹروں اور جنگی جہازوں نے بم برسانے شروع کر دیئے۔ بھارتی نیوی نے کراچی کو گھیرنے کا بندوست کر لیا۔

اس صورتحال میں دو قسم کی رائے ابھر کر سامنے آئی۔ ایک رائے تھی کہ بڑھے ہوئے قدم واپس نہ ہونے پائیں اور اب موقع ہے کہ کشمیر فتح ہو سکتا ہے، شاید اس میں بہت زیادہ خوش فہمی اور غیر ذمہ داری کا پہلو غالب تھا۔ ان کے خیال میں بھارت انٹرنیشنل بارڈر کراس کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ 1965ء کی اور بات تھی اب تو پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے۔ دوسری رائے تھی کہ بھارت بارڈر کراس بھی کر سکتا ہے اور مقامی سطح تک بھی محدود رہے تو مجاہدین کے ایکشن کو جوابی کارروائی کے بعد وہیں کارگل تک روک لے گا۔ کشمیر بہر صورت فتح نہیں ہو سکتا۔ صرف محدود و مقامی تنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ نقطہ نظر زیادہ محتاط اور صائب تھا۔ وہ اس طرح کے 1965ء کے غلط اندازے بھی نہیں بھولے تھے جب انڈیا کی طرف سے انٹرنیشنل بارڈر پار کرنے کو یکسر مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس ایشو کی سفارتی اور میڈیا جہتیں بھی بہت تھیں جس پر بھارت بہت زیادہ کام کر رہا تھا۔ اس طرح اس ایشو پر قوم بری طرح تقسیم تھی۔ یہی صورتحال فوج کے اعلیٰ درجوں میں تھی کہ اعلیٰ سطح پر جا کر ان معاملات کو ہر پہلو سے جانچا جاتا ہے۔ کارگل کا ایشو ہی ایسا تھا کہ اس نے یہ تقسیم پیدا کر دی اور جو لوگ نواز شریف سے بدظن تھے انہوں نے یہ بات بھی ان ہی کے ذمے لگا دی۔ بہر صورت یہ مسئلہ بہت ہی نازک تھا اور پوری قوم کی زندگی موت کا مسئلہ تھا۔ اس پر قوم اور اس کے منتخب نمائندے ہی کوئی فیصلہ کر سکتے تھے۔ جب امریکی صدر کلنٹن نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرنے کی حامی بھر لی اور میاں نواز شریف نے اس لمحہ سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو مزید بڑھنے سے روک کر ایک تباہ کن جوہری جنگ کا خطرہ ٹال دیا اور اپنا مقصد بھی حاصل کر لیا تو یار لوگوں اس کامیابی کو بھی عجیب و غریب رنگ دیکر اس پر وطن فروشی تک کا الزام لگا دیا۔ جنرل حمید گل نے تو ان پر غداری تک کا فتویٰ تھوپ دیا حالانکہ ایسی بات نواز شریف کے متعلق کہنی تو دور کی بات ہے سوچی بھی نہیں جا سکتی،

جذباتی لوگوں نے چائے کی پیالی میں ایک طوفان کھڑا کر کے رکھ دیا۔

پتہ نہیں کیوں مگر جب میں کارگل کا سوچتا ہوں مجھے 13 دسمبر 1971ء اور اوجڑی کیمپ کے دھماکے ضرور یاد آ جاتے ہیں۔ 13 دسمبر کو یو این او کی سکیورٹی کونسل میں پولینڈ نے امریکہ اور روس دونوں کی آشیر باد سے بھارت پاکستان جنگ کے حوالہ سے جنگ بندی کی قرارداد پیش کی تا کہ افواج پاکستان کسی حد تک عزت کے ساتھ مشرقی پاکستان سے نکل سکیں مگر یحییٰ خان کی ہدایات پر ذوالفقار علی بھٹو نے وہ قرارداد ہی پھاڑ ڈالی اور نتیجہ تین دن بعد 16 دسمبر کو ایک بدترین اور ذلت آمیز سرنڈر کی صورت میں نکلا اور اتنی بڑی تعداد میں ہماری فوج جنگی قیدی بن گئی۔ یہ اس لئے ہوا کہ یحییٰ بھٹو گٹھ جوڑ اس کے سیاسی نتائج سے ڈر رہا تھا۔ وہ اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر نہیں لگانا چاہتے تھے مگر نواز شریف نے 4 جولائی 1999ء کو اپنا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا دیا مگر پاکستان کی قسمت کا جوا نہ کھیلا۔ بس پھر کیا تھا بے خبر سی کی طرح ہماری حزب اختلاف نے اپنا بھنبھور ڈبونے کی ٹھان لی اور ایک آواز اٹھ گئی کہ اب نواز شریف رہے گا یا جنرل پرویز مشرف۔ دونوں میں سے ایک کو جانا پڑے گا۔

کیوں؟

ہمیں اس منطق کی کبھی سمجھ نہیں آ سکی، اعلان واشنگٹن کے چند دنوں کے اندر اندر نواز شریف کے خلاف ایک گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس بن گیا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کی غالب حزب اختلاف نواز شریف کو گرانے کے یک نکاتی ایجنڈے پر متفق ہو گئی اور نواز شریف کے گرنے گرانے کی بات نے اتنا زور پکڑا کہ امریکہ تک نے کھل کر کہہ دیا کہ وہ کسی غیر دستوری تبدیلی کو قبول نہیں کریگا جس کا واضح اشارہ ہماری افواج کی طرف تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جب سے نواز شریف نے ایٹمی دھماکہ کیا تھا یہ افواہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور گردش میں رہتی تھی اسے مزید تقویت شریعت بل کے موقع پر ملی اور اب اعلان واشنگٹن کے بعد تو یہ بات بہت زیادہ شد و مد سے کہی جانے لگی بلکہ لوگ بازاروں میں تاریخیں دے رہے تھے اور شرطیں لگا رہے تھے۔ خدا معلوم کتنا سچ ہے یا کتنا جھوٹ ہے۔ کس کی کیا چال ہے یا کسی کی کیا چال ہے۔ اس بات کا ابھی پتہ نہیں چل سکتا۔ ایسی باتوں کے فیصلے بعد میں ہمیشہ

تاریخ کیا کرتی ہے اور تاریخ ہمیشہ صحیح فیصلے کرتی ہے مگر 12 اکتوبر کے عجیب وغریب واقعات نے ان افواہوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور بتا دیا کہ دھوئیں کے نیچے کوئی نہ کوئی چنگاری ضرور تھی۔ نواز شریف نے چیف آف آرمی سٹاف کو ریٹائر کیا اور چیف آف آرمی سٹاف نے نواز شریف کی منتخب حکومت کو چلتا کر دیا اور خود چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ دستور کو معطل کر دیا اور نواز شریف کو گرفتار کر لیا بلکہ سارے خاندان کو پکڑ لیا۔ معیشت کی بہتری اور احتساب کا بیڑا اٹھایا تا کہ سیاست و جمہوریت کی تطہیر کا ایجنڈا پورا ہو سکے۔ کوئی اسے سموک سکرین کہہ رہا ہے اور کوئی راہ نجات ۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے کہ اونٹ کی کروٹ بیٹھتا ہے۔

ہمارے ہاں جہاں معاشرہ میں ہر طرح کی محرومیاں پائی جاتی ہیں امیر ہونا ایک بہت بڑا جرم ہے اور پھر ساتھ اقتدار بھی شامل ہو جائے تو وہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ ان محرومیوں کے سمندر میں امارات واقتدار حسد اور جلن کو جنم دیتے ہیں جس کا بے محابا طوفان شرافت وشائستگی کے تمام نشانات مٹاتا جاتا ہے۔ آپ ہزار ایماندار ہوں، خدا ترس ہوں۔ آپ کی پون صدی کی محنت شامل ہو۔ کاروبار آپ کی پیدائش سے بھی چاہے پہلے محنت ومزدوری سے سفر کر کے نقطہ عروج کو پہنچ چکا ہو اگر آپ سیاست میں آنے کی غلطی کر لیں گے تو پھر آپ پر کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی انگلیاں ضرور اٹھیں گی اور نا کردہ گناہوں کی سزا بھی ضرور ملے گی۔ یہ اللہ کی عدالت نہیں ہے یہ گناہ گار ابن آدم کی دنیا ہے جہاں ہر کوئی دوسرے کو معصوموں کی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتا ہے اور اگر وہ اقتدار میں آ جائے تو پھر تو اسے ضرور ہی فرشتوں کی صف میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے اور اس کی عام بشری کمزوریاں بھی چبھتی ہیں۔ اس کا صاف ستھرا لباس بھی برا لگتا ہے یہ سارے پاکھنڈ نواز شریف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ڈرامہ باز نہیں تھا، وہ مداری نہیں بن سکتا تھا، وہ اندر باہر سے ایک ہی ہے، وہ سیدھا سادا ہے، صاف گو، صدق دل کا مالک ہے مگر ہماری سیاست کی راہیں بہت ٹیڑھی ہیں اور وہ سیدھا سادا آدمی ان ٹیڑھی پگڈنڈیوں پر سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا قصور ہے کہ وہ ٹیڑھا نہیں چل رہا تھا وہ ٹیڑھے راستوں کو سیدھا کرنے کی کوشش میں مارا گیا۔ جتنا کچھ میں نے اسے پچھلے پندرہ سالوں میں دیکھا ہے وہ خاصا بھلا انسان ہے اتنا برا نہیں ہے جیسا کہ اسے سمجھا جا رہا ہے۔

آنے والا وقت پتہ نہیں اپنے خرمن میں کون کون سی بجلیاں چھپائے بیٹھا ہے جبکہ ہمارے پڑوس میں ایک نہایت ہی شاطر اور کمینہ دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے وہ ان حالات سے ضرور فائدہ اٹھائے گا اور اٹھا رہا ہے۔ ہم اب بالکل اکیلے ہیں۔ سارک سے ہم باہر ہیں، کامن ویلتھ نے ہمارا حقہ پانی بند کر دیا ہے۔ یورپین یونین نے منہ پھیر لیا ہے اور امریکہ کا صدر بھارت جا رہا ہے اور پاکستان نہیں آ رہا یہ سب کچھ ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔ دنیا میں یہ تنہائی بہت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

اسلامی دنیا بھی ہم سے کچھ دور ہوتی نظر آتی ہے۔ ہماری معاشی حالت دگرگوں ہے اور جس محتاجی کا بیج آج سے سالوں پہلے ہمارے فیلڈ مارشل نے بویا تھا وہ اب عروج پر ہے۔ ہم بین الاقوامی ساہوکاروں کے یرغمالی ہیں اور ہماری آزادی برائے نام ہے۔ لگتا ہے سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہے۔ ہمارے سیاسی ادارے تو معطل ہیں ہی ہمارے دوسرے اہم ادارے بھی بہت زیادہ مشکل میں پھنس چکے ہیں۔ فوج امتحان میں ہے تو عدلیہ بھی آزمائش سے دو چار ہے صدر کا عہدہ خاصا بے توقیر ہو کر رہ گیا ہے اور ہم ایک خلاء کے اندر پڑے نظر آ رہے ہیں جہاں سوائے گھپ اندھیرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔

اس وقت ہماری عدالتوں کے لئے ایک بہت ہی مشکل وقت آن پہنچا ہے اور سیاسی معاملات جو ڈیشل معاملات بن کر ان کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں۔ اس وقت دو مقدمات بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ایک طیارہ اغوا کیس اور دوسرا عدالت عظمیٰ کے سامنے دستوری معاملہ جو 12 اکتوبر کی کارروائی کے نتیجہ میں لامحالہ اٹھا ہے چونکہ یہ دونوں مقدمات عدالت کے سامنے زیر سماعت ہیں اس لئے ان پر کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ طیارہ اغوا کیس میں جو کچھ اب تک سامنے آیا ہے بس اس پر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کاش یہ مقدمہ درج ہی نہ ہوا ہوتا رہی بات دستوری مقدمہ کی وہ بہت زیادہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ اگر 12 اکتوبر کی کارروائی جائز ٹھہرتی ہے تو بہت سے مقدس اداروں کا تقدس مجروح ہو جائے گا اور اگر وہ غلط ٹھہرتی ہے تو بھی ملک کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت آن کھڑی ہوگی۔ شاید ہمارے ذہین و فطین قانون دان ملکی مفاد میں کوئی نہ کوئی درمیانی راہ نکال ہی لیں جس سے سانپ بھی مر

جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہمارے لئے سیاست بھی عزیز ہے کہ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے بلکہ ہماری اس کے بغیر بقا ہی نہیں ہے اور ہماری افواج بھی ہمارے لئے بہت ہی عزیز ہیں۔ جب ان میں کشمکش ہوتی ہے تو پھر تباہی آتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ پہلے بھی بھگت چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کوئی ایسی روشنی دے دے جو ملک کے بہترین مفاد میں ہو اور وہ ہمیں ان آندھیوں سے نکال لے۔

ہمیں اپنے مسئلے خود نپٹانے چاہئیں اور دوسروں کی محتاجی کی خو کو ختم کر دینا چاہئے۔ الیکشن کے نتائج کیا آتے ہیں اس کی بھی پرواہ نہیں کرنی چاہئے اور سب کچھ عوام پر چھوڑ دینا چاہئے وہی اس ملک کے اصل مالک ہیں اور ان کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارا قومی ترانہ کہتا ہے پاک سرزمین کا نظام قوت اخوت عوام۔

آج کے فاتحین یا کل کے فاتحین کو ہمیشہ ہادی اکبر ﷺ کا اسوہ حسنہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہئے کہ فتح مکہ کے دن کسی پر کوئی پکڑ نہیں تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ کہ لاتثریب علیکم الیوم اب حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک پر تھے اور پھر استقامت ریاست کا عظیم معجزہ بپا ہو گیا۔ ہمارے لئے تو یہ سنت ہے بلکہ میں تو کہوں گا فرض ہے۔ اگر نیلسن منڈیلا جیسا شخص اس کے اتباع سے جنوبی افریقہ کے گنجلک سیاسی مسائل حل کر سکتا ہے تو ہمیں Forget and Forgive کا فارمولا ورثے میں ملا ہے کہ اسے استعمال کرنا ہمارا فرض ہے اور اسی میں سب کی فلاح ہے اللہ خیر کرے۔